پیغمبرِ انقلاب ؐ

سیرتِ پاک کا علمی اور تاریخی مطالعہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ حالانکہ اللہ اپنی روشنی کو پورا کر کے رہے گا، خواہ منکرین کتنا ہی برا مانیں۔ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو سب دینوں پر غالب کر دے، خواہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

الصف ۹ ـ ۸

پیغمبرِ انقلاب

سیرتِ پاک کا علمی اور تاریخی مطالعہ

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

Paighambar-e-Inqilab
By Maulana Wahiduddin Khan

ISBN 81-85063-33-8

First published 1982
Sixth reprint 1996

No Copyright
This book does not carry a copyright.
The Islamic Centre, New Delhi being a non-profit making institution, gives its permission to reproduce this book in any form or to translate it into any language for the propagation of the Islamic cause.

Al-Risala Books
The Islamic Centre
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 4611128
Fax 91-11-4697333

Distributed in U.K. by

Assalaam International Ltd.
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 7117, Fax: 0121-773 7771

Distributed in U.S.A. by

Maktaba Al-Risala
Ocean Ave., 4C Brooklyn, New York NY 11230
Tel. 718-2583435

Printed by Nice Printing Press, Delhi

فہرست

	شجرۂ رسول	صفحہ ۶
	دیباچہ	۷
حصہ اوّل	آدم سے مسیح تک	۱۴
	نبوت محمدی کا ظہور	۱۸
	مثالی کردار	۲۲
	برتر اخلاقیات	۳۴
	اسباق سیرت	۴۲
	سنت رسول	۷۲
حصہ دوم	پیغمبر انقلاب	۷۸
	حالات سے بلند ہو کر	۹۷
	پیغمبرانہ طریق کار	۱۰۰
	پیغمبر مکہ میں	۱۱۴
	اہل یثرب کا اسلام	۱۴۰
	ہجرت	۱۴۳
	فتح کے بعد	۱۵۶
حصہ سوم	ختم نبوت	۱۶۴
	آپ کا معجزہ — قرآن	۱۶۹
	اصحاب رسول	۱۸۲
حصہ چہارم	اظہار رسالت عہد حاضر میں	۱۹۸
	ہیروؤں کی نرسری	۲۰۶

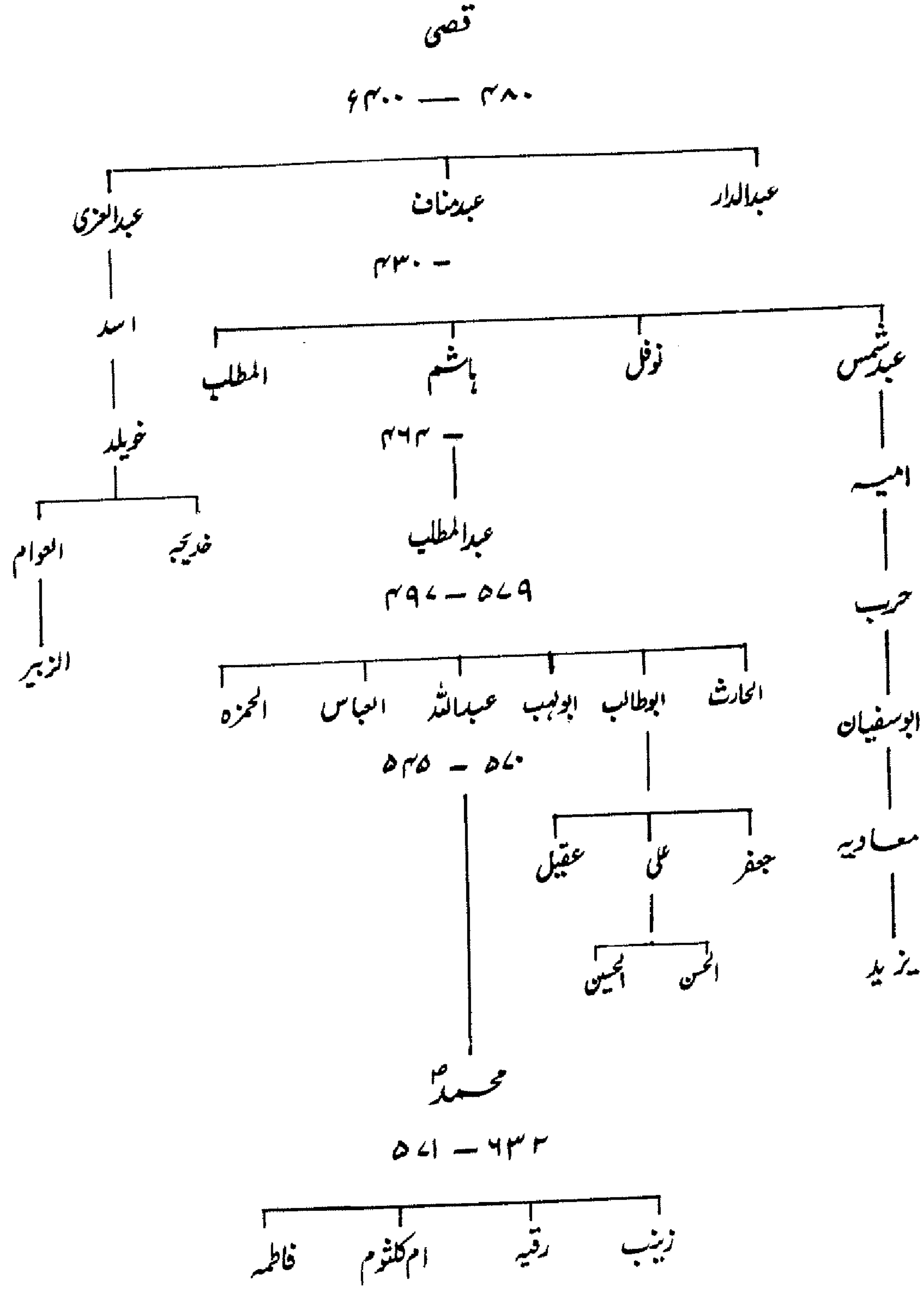

محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان

دیباچہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امریکہ سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے "ایک سو"۔ اس کتاب میں ساری انسانی تاریخ کے ایک سو ایسے آدمیوں کا تذکرہ ہے جنھوں نے، مصنف کے نزدیک، تاریخ پر سب سے زیادہ اثرات ڈالے۔ کتاب کا مصنف نسلی طور پر عیسائی اور تعلیمی طور پر سائنس داں ہے۔ مگر اپنی فہرست میں اس نے نمبر ایک پر نہ حضرت مسیح کا نام رکھا ہے اور نہ نیوٹن کا۔ اس کے نزدیک وہ شخصیت جس کو اپنے غیر معمولی کارناموں کی وجہ سے نمبر ایک پر رکھا جائے وہ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ آپ نے انسانی تاریخ پر جو اثرات ڈالے وہ کسی بھی دوسری شخصیت، خواہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی، نے نہیں ڈالے۔

مصنف نے آپ کے کمالات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> He was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels
> Dr. Michael H.Hart, *The 100*, New York 1978.

آپ تاریخ کے تنہا شخص ہیں جو انتہائی حد تک کامیاب رہے۔ مذہبی سطح پر بھی اور دنیوی سطح پر بھی۔

انگریز مورخ ٹامس کارلائل نے پیغمبر اسلام کو نبیوں کا ہیرو قرار دیا تھا۔ مائیکل ہارٹ (امریکی) نے آپ کو ساری انسانی تاریخ کا سب سے بڑا انسان قرار دیا ہے۔ پیغمبر اسلام کی عظمت اتنی واضح ہے کہ وہ صرف آپ کے پیرووں کے ایک "عقیدہ" کی حیثیت نہیں رکھتی۔ وہ ایک مسلمہ تاریخی واقعہ ہے اور ہر آدمی جو تاریخ کو جانتا ہے وہ مجبور ہے کہ اس کو بطور واقعہ تسلیم کرے۔

کوئی شخص اوپر نظر ڈالے تو اس کو ہر طرف آسمان چھایا ہوا نظر آئے گا۔ اسی طرح انسانی زندگی میں جس طرف بھی دیکھا جائے، پیغمبر اسلام کے اثرات نمایاں طور پر اپنا کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ساری بہترین قدریں اور تمام اعلیٰ کامیابیاں جن کو آج اہمیت دی جاتی ہے وہ سب آپ کے لائے ہوئے انقلاب کے براہ راست یا بالواسطہ نتائج ہیں۔

مذہبی اداروں میں شخصیت پرستی کے بجائے خدا پرستی کس نے قائم کی۔ اعتقادیات کو توہمات کے بجائے

حق کی بنیاد کس نے عطا کی۔ سائنس میں فطرت کی پرستش کے بجائے فطرت کو مسخر کرنے کا سبق کس نے دیا۔ سیاسیات میں نسلی شہنشاہیت کے بجائے عوامی حکومت کا راستہ کس نے دکھایا۔ علم کی دنیا میں خیال آرائی کے بجائے حقیقت نگاری کی طرح کس نے ڈالی۔ سماج کی تنظیم کے لئے ظلم کے بجائے عدل کی بنیاد کس نے فراہم کی۔ جواب یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں انسان کو پیغمبر اسلام سے ملیں۔ آپ کے سوا کوئی نہیں ہے جس کی طرف حقیقی طور پر ان کارناموں کو منسوب کیا جا سکے۔ دوسرے تمام افراد آپ کے انقلابی دھارے کو استعمال کرنے والے ہیں نہ کہ اس کو وجود میں لانے والے۔

اللہ تعالی نے اپنے نبی کو تاریخ کا سب سے بڑا انسان بنا کر انسانی نسل پر اپنا سب سے بڑا احسان فرمایا ہے۔ اس طرح معلوم تاریخ میں ایک ایسا بلند ترین مینار کھڑا کر دیا گیا ہے کہ آدمی جس طرف بھی نظر ڈالے وہ آپ کو دیکھ لے۔ جب وہ اپنے رہنما کی تلاش میں نکلے تو اس کی نظر سب سے پہلے آپ پر پڑے۔ جب وہ حق کا راستہ جاننا چاہے تو آپ کا بلند و بالا وجود اس کو سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرے۔ آپ ساری انسانیت کے لئے ہادی اعظم کی حیثیت رکھتے ہیں، اسی لئے آپ کو اتنے بلند تاریخی مقام پر کھڑا کیا گیا ہے کہ کوئی آنکھ والا جب آنکھ اٹھائے تو آپ کو دیکھے بغیر نہ رہ سکے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح خدا کے ایک پیغمبر تھے جس طرح دوسرے بہت سے پیغمبر ہوئے ہیں۔ قرآن کی صراحت کے مطابق، آپ کے مشن اور دوسرے پیغمبروں کے مشن میں اصلاً کوئی فرق نہ تھا۔ تاہم آپ کی ایک حیثیت مزید تھی۔ اور وہ یہ کہ آپ نبیوں کے خاتم تھے۔ دوسرے لوگ صرف رسول اللہ تھے، اور آپ رسول اللہ کے ساتھ خاتم النبیین بھی (ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین، (الاحزاب ۴۰)

یہ دنیا چونکہ دارالامتحان ہے اور یہاں ہر ایک کو عمل کی آزادی دی گئی ہے، اس لئے یہاں پیغمبروں پر یہ ذمہ داری نہیں ڈالی گئی کہ وہ لوگوں کو بدلیں۔ ان پر صرف یہ ذمہ داری ڈالی گئی کہ وہ خدا کی طرف سے ملے ہوئے پیغام کو لوگوں تک واضح طور پر پہنچا دیں (فهل على الرسل الا البلاغ المبين، النحل ۳۵)

مگر نبیوں کے خاتم کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ عملی انقلاب پیدا کر کے زمین کے بڑے رقبہ میں اپنی ایک امت برپا کرے تاکہ اس کی لائی ہوئی آسمانی کتاب کی مستقل حفاظت کا انتظام ہو سکے۔ اس عالم اسباب میں کتاب کی حفاظت کی کوئی دوسری صورت ممکن نہیں۔ اور اگر کتاب الہی محفوظ نہ ہو تو پیغمبروں کی آمد ختم نہیں ہو سکتی۔ گویا دوسرے انبیاء صرف پیغمبر دعوت تھے اور آپ پیغمبر دعوت کے ساتھ پیغمبر انقلاب بھی۔

انسان کو اپنے عمل پر پورا اختیار حاصل ہے ، مگر اس کو عمل کے انجام پر کوئی اختیار حاصل نہیں ۔ یہ ایک نہایت سنگین صورت حال ہے جس سے انسان موجودہ دنیا میں دوچار ہے۔ اسی لئے خدا نے انسان کی رہنمائی کے لئے انتہائی حد تک کامل انتظام کیا ہے تاکہ دنیا کی عدالت میں کسی کے لئے کوئی عذر باقی نہ رہے۔

اولاً انسان کو انتہائی درست ساخت پر پیدا کیا گیا اور اس کی فطرت میں صحیح اور غلط کی تمیز پیوست کر دی گئی۔ اس کے بعد اس کو ایک ایسی دنیا میں رکھا گیا جو کامل عدل کی بنیاد پر کھڑی کی گئی ہے۔ تاکہ انسان جدھر دیکھے ہر طرف اس کو خدا کا پیغام خاموش زبان میں سنائی دیتا رہے۔ اسی کے ساتھ مزید خصوصی انتظام یہ کیا گیا کہ ہر زمانہ میں اور ہر قوم میں خدا کے رسول آئے اور ہر ایک کو اس کی اپنی قابل فہم زبان میں حقیقت واقعہ سے باخبر کرتے رہے۔

آخری تدبیر کے طور پر اللہ تعالیٰ کا یہ منصوبہ ہوا کہ خود انسانی زندگی کی صورت میں ایک کامل مثال کھڑی کرے جو تمام انسانوں کے لئے ایک زندہ نمونہ کا کام دیتی رہے۔ مگر حضرت نوح سے لے کر حضرت مسیح تک پیغمبروں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کی وجہ سے یہ کامل انسانی نمونہ تاریخ میں قائم نہ ہو سکا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر کے وقت اس قسم کے ایک نبی کی بعثت کی دعا کی تھی۔ آپ کی دعا کے ڈھائی ہزار سال بعد پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم، خصوصی خدائی تائید کے ساتھ، اسی منصوبہ کی تکمیل کے لئے بھیجے گئے۔

آپ نے نہ صرف شخصی زندگی کے اعتبار سے مطابق انسان کا نمونہ دنیا میں قائم کیا۔ بلکہ اسی کے ساتھ خدا کے منصوبہ کے مطابق ہر قسم کے اجتماعی احوال بھی آپ پر گزرے، اور ہر حال میں آپ نے قانون ربانی پر قائم رہ کر دکھا دیا کہ وہ انسان کیا ہے جو خدا کو دنیا کی اس زندگی میں مطلوب ہے۔

آپ کے ذریعہ صرف یہی نہیں ہوا کہ خدا پرستی کا انسانی نمونہ دنیا میں قائم ہوا۔ بلکہ اسی کے ساتھ یہ نمونہ بھی قائم ہوا کہ حقیقی خدا پرستی کا طریقہ اختیار کرنے کے بعد کس طرح ایسا ہوتا ہے کہ خدا اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے ــــــ خدا سے خوف کس طرح دوسرے خوفوں سے آدمی کو نجات دیتا ہے۔ اشتعال انگیز مواقع پر خدا کی خاطر صبر کر لینا کس طرح کامیابی کا زینہ بنتا ہے۔ آخرت کے لئے دنیوی فائدوں کو چھوڑنا کس طرح بالآخر آدمی کو دنیا بھی دے دیتا ہے اور آخرت بھی۔ منفی نفسیات سے بلند ہو کر کام کرنا کس طرح اس فتح مبین تک پہنچاتا ہے کہ دشمن بھی حامی اور دوست بن کر آدمی کے ساتھی

پیغمبر آخر الزماں سے پہلے جو انبیاء آئے ان کی زندگی مدوّن تاریخ کا جزء نہ بن سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خالص علمی اور تاریخی اعتبار سے ان کی نبوتیں ثابت شدہ نبوتیں نہیں۔ حضرت مسیح قدیم رسولوں میں سب سے آخری رسول ہیں۔ مگر آپ کا معاملہ بھی تاریخی اعتبار سے یہ ہے کہ ایک مغربی مفکر کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ:

Historically, it is quite doubtfull whether Christ ever existed at all. (B. Russell)

تاریخی اعتبار سے خود یہ امر سخت مشتبہ ہے کہ مسیحؑ کا اس دنیا میں کبھی وجود بھی تھا۔

مگر پیغمبر آخر الزماں کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ آپ کی حیثیت تاریخی طور پر اس قدر مسلّم ہے کہ آپ کے بارے میں جب ایک مبصر قلم اٹھاتا ہے تو اس کو یہ الفاظ لکھنے پڑتے ہیں:

Mohammad was born within the full light of history. (Hitti)

محمد تاریخ کی پوری روشنی میں پیدا ہوئے۔

آپ کے زندہ پیغمبر ہونے ہی کا یہ پہلو بھی ہے کہ آپ کو جو معجزہ دیا گیا وہ ایک زندہ اور قائم رہنے والا معجزہ تھا، یعنی قرآن۔ اگر آپ کو عام قسم کے معجزے دئے جاتے تو وہ آپ کی وفات کے بعد ختم ہو جاتے۔ جب کہ آپ کی نبوت آپ کی وفات کے بعد بھی پوری طرح باقی رہنے والی تھی۔ اسی خاص مصلحت کی بنا پر آپ کے لئے آپ کی لائی ہوئی کتاب کو معجزہ بنا دیا گیا۔ معجزہ اس حیران کن واقعہ کا نام ہے جس کی نقل کسی انسان کے بس میں نہ ہو۔ قرآن کی نقل کسی فرد یا کسی گروہ کے بس میں نہیں۔ یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ قرآن ایک خدائی معجزہ ہے۔

پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو نسبت اظہار دی گئی تھی۔ یہی نسبت آپ کے بعد آپ کے امتیوں کو بھی حاصل ہے۔ مگر یہ نسبت، بلا تشبیہ، ویسی ہی ہے جیسے کسان کے بارے میں کہا جائے کہ اس کو نسبت زراعت حاصل ہے۔ کسان کو نسبت زراعت حاصل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے وہ اسباب کامل طور پر مہیا کر دئے ہیں جن کو صحیح طور پر استعمال کر کے کوئی کسان اپنے لئے لہلہاتی ہوئی فصل اگا سکتا ہے۔ اسی طرح پیغمبر اور آپ کی امت کے لئے نسبت اظہار یا نسبت غلبہ کا مطلب یہ ہے کہ

آپ کے لئے خدا نے وہ تمام حالات بہترین طور پر مہیا کر دئے ہیں جو دین کے غلبہ کے لئے اس عالم اسباب میں مطلوب ہیں۔ جب بھی ان کو استعمال کیا جائے گا تو اس کا نتیجہ یقینی طور پر مثبت شکل میں برآمد ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حضرت ابراہیم سے لے کر آپ کی بعثت تک ڈھائی ہزار سال کے اندر تمام موافق حالات بہترین طور پر جمع کر دئے گئے۔ آپ نے قانون خداوندی کی پیروی کرتے ہوئے ان حالات کو استعمال کیا۔ اس کا نتیجہ عظیم الشان کامیابی کی صورت میں برآمد ہوا۔

اب دوبارہ پچھلے چودہ سو سال کے عرصہ میں مختلف تاریخی تبدیلیوں اور علمی ارتقار کے ذریعہ ہر قسم کے موافق حالات ہمارے حق میں جمع کر دئے گئے ہیں۔ آج بھی پوری طرح یہ ممکن ہے کہ پیغمبر آخر الزماں کے لائے ہوئے دین کو غالب و سربلند کیا جائے۔ مگر یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب کہ اس کے لئے وہ جدوجہد کی جائے جو قانون خداوندی کے مطابق کسی حقیقی نتیجہ کے ظہور کے لئے ضروری ہے۔ یہ شرط نہ پیغمبر کے لئے ساقط کی گئی اور نہ آپ کے امتیوں کے لئے وہ کبھی ساقط ہو سکتی ہے۔

حصّه اول

آدم سے مسیح تک

خدا کی طرف سے جتنے رسول آئے، سب اس لئے آئے کہ انسان کو زندگی کی حقیقت سے باخبر کریں، یہ حقیقت کہ موجودہ دنیا کی زندگی، انسان کی ابدی زندگی کا صرف ایک امتحانی وقفہ ہے۔ کم و بیش سو سال یہاں زندگی گزار کر ہم اپنی مستقل دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں خدا کے وفادار بندوں کے لئے جنت ہے اور اس کے نافرمان بندوں کے لئے جہنم۔

آدمؑ پہلے انسان بھی تھے اور پہلے رسول بھی۔ اس کے بعد حضرت مسیحؑ تک مسلسل خدا کے پیغمبر آتے رہے۔ ابوامامہ کی روایت میں آیا ہے کہ ابوذر غفاری نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے انبیاء کی تعداد کے بارے میں سوال کیا آپؐ نے فرمایا، ایک لاکھ ۲۴ ہزار۔ ان میں تین سو پندرہ رسول بھیجے۔ (رواہ احمد و ابن راہویہ فی مسندیہما و ابن حبان فی صحیحہ والحاکم فی المستدرک) خدا کے ان نمائندوں نے مختلف قوموں اور آبادیوں کو اس حقیقت سے باخبر کیا اور خدا سے ڈر کر زندگی گزارنے کی تلقین کی۔ مگر انسانوں میں بہت کم ایسے لوگ نکلے جو اپنی آزادیٔ عمل کو خدا کے حوالے کرنے کے لئے تیار ہوں۔ حضرت یحییٰ کو کوئی ساتھی نہیں ملا اور وہ قتل کر دیئے گئے۔ حضرت لوط نے اپنی قوم کو چھوڑا تو ان کے ساتھ ان کی صرف دو لڑکیاں تھیں۔ حضرت نوح کے ساتھ، ان کی کشتی کا قافلہ، توریت کے بیان کے مطابق، صرف آٹھ افراد پر مشتمل تھا۔ حضرت ابراہیم اپنے وطن عراق سے نکلے تو ان کے ساتھ ان کی بیوی سارہ تھیں اور ان کے بھتیجے لوط۔ بعد کو اس قافلہ میں ان کے دو بیٹے اسماعیل اور اسحاق شامل ہوئے۔ حضرت مسیح کو ساری کوشش کے بعد بارہ آدمی ملے، وہ بھی آخر وقت میں آپ کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ (متی ۲۶ : ۵۶)

بیشتر انبیاء کا حال یہی رہا ہے۔ کوئی تنہا رہ گیا کسی کو چند ساتھ دینے والے ملے۔ ان چند میں بھی زیادہ تر ان کے اپنے اہل خاندان تھے جن سے رشتے کا تعلق نبی کا ساتھ دینے کے لئے ایک اضافی محرک بن گیا۔ قرآن کی یہ آیت اس پوری تاریخ پر ایک تبصرہ ہے:

یٰحَسْرَۃً عَلَی الْعِبَادِ مَا یَأْتِیْھِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَھْزِءُوْنَ (یٰسین - ۳۰)

افسوس ہے بندوں کے حال پر جب بھی ان کے پاس کوئی رسول آیا تو انھوں نے اس کی ہنسی اڑائی۔

انسانی نسل میں خدا کے نزدیک سب سے اہم ہستیاں وہ ہیں جن کو پیغمبر کہا جاتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ ساری تاریخ میں یہی لوگ سب سے زیادہ غیر اہم رہے ہیں۔ بادشاہوں اور سپہ سالاروں کے واقعات تاریخ نے مکمل طور پر ضبط کئے۔ مگر آدم سے مسیح تک کوئی نبی ایسا نہیں جس کو باقاعدہ طور پر مدوّن تاریخ میں جگہ ملی ہو۔

ارسطو (۳۲۲-۳۸۴ ق م) حضرت موسیٰ کے ہزار برس بعد پیدا ہوا۔ مگر وہ موسیٰ کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر انبیاء کو انکی قوم نے رد کر دیا۔ ان کے گھروں کو اجاڑ گیا، ان کو معاشرہ میں بے قیمت کر کے رکھ دیا گیا، ان کو ایسا بنا دیا گیا گویا وہ اتنے غیر اہم لوگ ہیں جن کا ذکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

نبیوں کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا گیا۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے: اپنی مخاطب قوموں کی روش پر تنقید۔ انسان کو سب سے زیادہ جو چیز محبوب ہے، وہ ہے اپنی تعریف۔ اور جو چیز سب سے زیادہ مبغوض ہے، وہ ہے اپنے خلاف تنقید۔ انبیاء چونکہ صحیح اور غلط کو بتانے کے لئے آتے ہیں، وہ اپنے ہم قوموں سے مصالحت نہیں کرتے۔ وہ ان کی اعتقادی اور عملی غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس لئے قوم ان کی مخالف بلکہ دشمن ہو جاتی ہے۔ انبیاء اگر لوگوں کی دل پسند تقریریں کرتے تو کبھی ان کو اس صورت حال سے دو چار ہونا نہ پڑتا۔

اس عمومی انجام میں صرف چند نبیوں کا استثناء رہے۔ مثلاً حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت یوسف علیہم السلام۔ مگر ان حضرات کو جو عروج و اقتدار ملا، وہ ان کے نظریات کی عوامی مقبولیت کا نتیجہ نہ تھا۔ اس کے اسباب بالکل دوسرے تھے۔

حضرت داؤد اسرائیلی بادشاہ ساؤل کی فوج میں ایک نوجوان سپاہی تھے۔ ان کے زمانہ میں اسرائیلیوں اور فلسطیوں میں جنگ ہوئی۔ فلسطی فوج میں جالوت نام کا ایک دیو ہیکل پہلوان تھا جس سے مقابلہ کرتے ہوئے تمام لوگ ڈرتے تھے۔ بادشاہ نے اعلان کیا کہ جو شخص اس کو قتل کرے گا میں اپنی لڑکی کی شادی اس سے کر دوں گا۔ حضرت داؤد نے مقابلہ کیا اور اس کو مار ڈالا۔ اسطرح وہ اسرائیلی بادشاہ کے داماد بن گئے۔ اس کے بعد جب ایک جنگ میں بادشاہ اور اس کا ولی عہد دونوں ہلاک ہو گئے تو تخت حضرت داؤد کے حصہ میں آ گیا۔ حضرت سلیمان آپ کے بیٹے تھے اور ان کو حکومت اپنے باپ سے وراثت میں ملی۔ حضرت یوسف کو تعبیر خواب کا علم دیا گیا۔ اس سے مصر کا مشرک بادشاہ متاثر ہو گیا، اور اپنے اقتدار اعلیٰ کے تحت حکومتی انتظامات آپ کے سپرد کر دیئے۔ تاہم بادشاہ اور عام مصری باشندے بدستور اپنے مشرکانہ دین پر قائم رہے۔

اس صورت حال کا نقصان صرف یہی نہیں ہوا کہ ہر دور کی بیشتر آبادی خدا کی نعمت ہدایت سے محروم رہی۔ اس سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ کوئی پیغمبر خدا کی طرف سے جو کتاب اور پیغامات لے کر آتا تھا، اس کے بعد اس کو محفوظ رکھنے کا سامان نہ ہو سکا۔ کیونکہ پیغمبر کے بعد اس کے متبعین ہی اس کو محفوظ رکھ سکتے تھے۔ مگر وہ یا تو حاصل نہیں ہوئے یا اتنے کم تھے کہ سماج کے علی الرغم کلام الٰہی کی حفاظت نہ کر سکے۔

خدا جس کا علم ازل سے ابد تک پھیلا ہوا ہے، جو آنے والے مستقبل کو بھی اسی طرح دیکھ رہا ہے جس طرح گزرے ہوئے ماضی کو، اسے انسانیت کا یہ انجام معلوم تھا اس لئے اس نے پہلے ہی یہ مقدر کر دیا تھا کہ پیغمبرانہ دور کے آخری مرحلہ میں وہ اپنا ایک خاص نمائندہ بھیجے گا۔ اس پیغمبر کو دعوت دین کے ساتھ اظہار دین کی نسبت بھی حاصل ہوگی۔ اس کو یہ نصرتِ خاص دی جائے گی کہ وہ ہر حال میں اپنے مدعوئین پر غلبہ حاصل کرے اور ان کو حق کے آگے جھکنے پر مجبور کر دے (لن یقبضہ حتی یقیم بہ الملۃ العوجاء) خدا کی فوج اس کا ساتھ دے کر اس کے مخالفوں کو زیر کرے گی، تاکہ خدا کا دین ہمیشہ کے لئے مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جائے۔ اور خدا کی کتاب کی حفاظت کا مستقل انتظام ہو سکے۔ بائبل کے الفاظ میں "جس طرح سمندر پانی سے بھرا ہوا ہے، اسی طرح زمین خداوند کے جلال کے عرفان سے معمور ہو (حبقوق ۲:۱۴)

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس منصوبہ کو، بائبل کی شہادت کے مطابق، ہزاروں برس پہلے سے مختلف انبیاء کے ذریعہ ظاہر کرنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ بتا دیا گیا تھا کہ وہ نبی عرب کے صحرائی جغرافیہ سے اٹھے گا۔ وہ بنی اسرائیل کے بقیہ گھرانے یعنی ان کے بھائیوں (بنی اسماعیل) کی اولاد سے ہوگا۔ وہ حضرت مسیح کے بعد آئے گا۔ اس کے ساتھی خدا کے خریدے ہوئے کہلائیں گے۔ جو قومیں ان سے ٹکرائیں گی پاش پاش ہو جائیں گی۔ ازلی پہاڑ (ایران وروم) جھک جائیں گے۔ اس کی سلطنت خشکی سے لے کر بحری ممالک تک پھیلی ہوئی ہوگی۔ وغیرہ

موجودہ بائبل اگرچہ ترجمہ اور الحاقات کے نتیجہ میں اصل بائبل سے بہت کچھ مختلف ہو چکی ہے۔ تاہم آج بھی کثیر تعداد میں اس کے اندر ایسے بیانات موجود ہیں جو ایک غیر جانب دار آدمی کے لئے آنے والے آخری نبی کے سوا کسی اور ذات پر صادق نہیں آتے۔ خاص طور پر حضرت مسیح علیہ السلام کی تشریف آوری کا تو مشن ہی یہ تھا کہ وہ دنیا کو خصوصاً یہود کو آنے والے نبی سے آخری طور پر آگاہ کر دیں۔ آپ نے جس "نئے عہد نامہ" کی بشارت دی وہ حقیقۃً اسلام تھا جو یہود کی معزولی کے بعد بنی اسماعیل کے ذریعہ باندھا گیا۔ انجیل نئے عہد نامہ کی بشارت ہے نہ کہ خود نیا عہد نامہ۔

حضرت مسیح علیہ السلام، نبی آخر الزماں سے چھ سو سال قبل تشریف لائے۔ قرآن کی سورہ نمبر ۶۱ میں ارشاد ہوا ہے کہ حضرت مسیح نے فلسطین کے یہودیوں سے کہا کہ اللہ نے مجھے ایک آنے والے نبی سے پہلے اس کا مبشر بنا کر بھیجا ہے جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہوگا (الصف — ۶)

احمد اور محمد دونوں ہم معنی الفاظ ہیں جن کے معنی ہیں "تعریف کیا ہوا"۔ انجیل برناباس میں صاف صاف لفظ "محمد" آیا ہے۔ تاہم چونکہ مسیحی حضرات انجیل برناباس کو جعلی انجیل کہتے ہیں، اس لئے ہم اس کا حوالہ مناسب نہیں سمجھتے۔ نیز ہمیں اس میں شبہ ہے کہ حضرت مسیح نے اپنی پیشین گوئی میں لفظ احمد یا محمد کہا ہوگا۔ زیادہ قرین قیاس بات یہ ہے کہ آپ نے احمد یا محمد کے ہم معنی کوئی لفظ استعمال فرمایا۔

محمد بن اسحاق (م ۱۵۲ھ) کی ایک روایت جو ابن ہشام نے نقل کی ہے، اس کے مطابق یہ لفظ غالباً مُنْحَمَنَّا

تھا۔ ابن اسحاق سیرت کے موضوع پر سب سے زیادہ اہم ماخذ سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی روایت ہے کہ مجھے بتانے والوں نے بتایا کہ یحنس (یوحنا) کی انجیل میں آنے والے رسول کی جو پیشین گوئی ہے، اس میں اس کا نام منحمنا بتایا گیا ہے (تہذیب سیرۃ ابن ہشام جلد اول، صفحہ ۵۰) اغلباً یہ روایت انھیں اپنے زمانہ کے فلسطینی عیسائیوں کی معرفت پہنچی جو اس وقت اسلام کے زیر اقتدار آچکا تھا۔ منحمنا سریانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "تعریف کیا ہوا"۔ ماضی کے اثر سے اس وقت تک فلسطین کے باشندوں کی زبان سریانی تھی۔ اغلب ہے کہ حضرت مسیح کی مادری زبان میں بولا ہوا اصل لفظ (منحمنا) ان کی روایات میں چلا آرہا تھا جو بعد کے یونانی ترجموں میں فارقلیط بن گیا۔

نبوت محمدی کا ظہور

ایک طرف افریقہ اور دوسری طرف ایشیا اور یورپ کے وسط میں عرب کا جزیرہ نما قدیم آباد دنیا کا جغرافی قلب معلوم ہوتا ہے۔ مگر قدیم زمانہ کے سیاسی حوصلہ آزماؤں میں کوئی نہیں ملتا جس نے اس علاقہ کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش کی ہو۔ تمام فوجی مہمیں عرب کے سرحدی علاقوں — عراق، شام، فلسطین، لبنان اور یمن پر آکر ٹھہر گئیں۔ اس سے آگے نجد و حجاز کے علاقہ کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کی ضرورت انھوں نے نہیں سمجھی۔ کیوں کہ تین طرف سے سمندروں سے گھرا ہونے کے باوجود یہاں ان کے لئے خشک پہاڑ اور اڑتی ہوئی ریت کے سوا اور کچھ موجود نہ تھا۔

اسی "بے آب و گیاہ" وادی کی مرکزی بستی مکہ میں پیغمبر اسلام محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پیدا ہوئے۔ آپ کے والد عبداللہ بن عبدالمطلب آپ کی پیدائش سے چند ماہ پہلے انتقال کر گئے۔ والدہ کا انتقال بھی اس وقت ہو گیا جب کہ آپ کی عمر ابھی صرف چھ سال تھی۔ اب آپ کے سرپرست آپ کے دادا عبدالمطلب بن ہاشم تھے تاہم دو سال بعد وہ بھی اس دنیا سے چلے گئے۔ آخر عمر میں آپ کی سرپرستی آپ کے چچا ابوطالب بن عبدالمطلب کے حصہ میں آئی۔ مگر ہجرت کے تین سال پہلے، آپ کی زندگی کے مشکل ترین مرحلہ میں، ان کے لئے بھی موت کا پیغام آ گیا۔

اگرچہ فطرت سے آپ نے بڑی شان دار شخصیت پائی تھی۔ بچپن میں آپ کو دیکھنے والے کہا کرتے: ان لھذا الغلام لشانا (اس لڑکے کا مستقبل عظیم ہے) جب بڑے ہوئے تو آپ کے شخصی رعب و وقار کا حال یہ تھا کہ حضرت علی کے الفاظ میں: من رآہ بدیھۃ ھابہ ومن خالطہ احبہ (جو آپ کو پہلی بار دیکھتا مرعوب ہو جاتا، جو ساتھ بیٹھتا وہ آپ سے محبت کرنے لگتا) مگر چالیس سال کی عمر میں جب آپ نے دعوت نبوت کا آغاز کیا تو لوگوں کو آپ کا دعویٰ اتنا حقیر معلوم ہوا کہ انھوں نے کہا: ھذا ابن ابی کبشۃ یکلم من السماء۔ اس کا مطلب تھا: دیکھو یہ فلاں دیہاتی کا لڑکا، وہ سمجھتا ہے کہ آسمان سے اس کو وحی آتی ہے۔

آپ کی دعوتی جدوجہد کی کل مدت صرف ۲۳ سال ہے۔ مگر اس انتہائی مختصر مدت میں عرب کے قبائل میں آپ نے ایسا انقلاب برپا کر دیا جس کی کوئی دوسری مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس انقلاب نے سو سال سے بھی کم عرصہ میں دنیا کی دو بڑی شہنشاہیتوں، ساسانی سلطنت اور بازنطینی سلطنت کو زیر کر لیا اور ایک طرف عراق و ایران سے لے کر بخارا تک، دوسری طرف شام و فلسطین سے لے کر مصر اور پورے شمالی افریقہ تک کو فتح کر لیا۔ پھر یہ سیلاب مغربی سمت بڑھا اور ۷۱۱ء میں جبرالٹر سے گزر کر اسپین اور پرتگال میں داخل ہو گیا۔ مغربی یورپ میں قافلۂ اسلام کی پیش قدمی ۷۳۲ء میں شاہ فرانس چارلس مارٹل نے تور کے مقام پر روک دی۔ تاہم دو صدیوں تک یورپ کی صلیبی جنگوں اور اس کے بعد تاتاریوں کے بے پناہ حملوں کے باوجود پندرھویں صدی تک اس کو کوئی حقیقی نقصان نہیں پہنچا، جب کہ انھوں نے اپنے اندرونی اختلاف کی وجہ سے اسپین کو کھو دیا۔

اس کے بعد اسلام کی اندرونی طاقت نے ترکوں اور مغلوں کو کھڑا کیا۔ ترکوں نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کو فتح کیا اور مشرقی یورپ میں یوگوسلاویہ تک پہنچ گئے۔ وائنا کے سامنے ۱۶۸۳ء تک ایک ترک فوج موجود تھی۔ سولھویں صدی میں مغلوں نے برصغیر ہند اور افغانستان کے علاقہ میں اسلام کا اقتدار قائم کیا۔ تیرہ صدیوں کے بعد اس توسیع کا نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا کے تقریباً تمام حصوں میں مسلمان موجود ہیں۔ ایشیا اور افریقہ سے لے کر یورپ تک تقریباً چار درجن ممالک کا ایک مسلم علاقہ بن چکا ہے۔ موتمر عالم اسلامی کے شائع کردہ عالمی مسلم گزیٹیر (۱۹۷۵) کے مطابق آج دنیا بھر میں اہل اسلام کی تعداد ۹۰ کرور ہے۔

یہ سب جو ہوا، اس ۲۳ سالہ عمل کا نتیجہ تھا جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں عرب میں انجام دیا گیا تھا۔ ۲۳ سال کی مدت میں ایک ایسا انقلاب آنا جو نہ صرف تاریخ انسانی میں دائمی طور پر ثبت ہو جائے بلکہ خود اپنی ایک مستقل تاریخ پیدا کرے، کسی انسان کے بس کی چیز نہیں۔ یہ ایک خدائی معاملہ تھا اور اسی نے اس کو انجام دیا۔ بدر کی فتح کے بعد جب مسلمان واپس ہوئے تو روحاء کے مقام پر کچھ لوگ ملے جنھوں نے ان کو فتح کی مبارک باد دی۔ سلمہ بن سلامہ نے جواب دیا: تم لوگ کس چیز کی مبارک باد دے رہے ہو۔ خدا کی قسم یہ تو گویا بندھے ہوئے اونٹ تھے جن کو ہم نے ذبح کر دیا۔ (کالابل المعقلۃ فنحرناھا، تہذیب سیرۃ ابن ہشام ۔ ۱۵۳)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خصوصی اہتمام سے پیشگی اس کے اسباب فراہم کر دیئے تھے۔ عرب کے خشک جغرافیہ میں ایک ایسی قوم جمع کر دی گئی جس میں صحرائی زندگی کے نتیجہ میں کردار کی صلابت غیر معمولی حد تک پائی جاتی تھی۔ وہ اقرار اور انکار کے درمیان کسی تیسری چیز کو نہ جانتے تھے، ان کے اندر وہ تمام فطری خصائص پوری طرح محفوظ تھے جو کسی تحریک کا مجاہد بننے کے لئے ضروری ہیں۔ پھر عرب کے جزیرہ نما کے گرد اس وقت کی دنیا کی دو سب سے بڑی سلطنتیں قائم کر دی گئی تھیں، بالکل فطری تھا کہ وہ اپنے پڑوس میں ایک نئی ابھرتی ہوئی طاقت کو برداشت نہ کریں اور اس کے خلاف جارحیت کا آغاز کر دیں۔ اس طرح ان کی جارحیت اہل اسلام کے لئے جواز فراہم کر دے کہ وہ دنیا

کے اس سرے سے اُس سرے تک ملکوں کو فتح کرتے چلے جائیں۔ کیونکہ عملاً اس وقت کی تقریباً تمام دنیا انھیں دونوں جارح قوموں کا علاقہ تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کی لڑائیاں دوسروں کے خلاف جارحیت نہیں تھیں۔ بلکہ یہ دوسروں کی جارحیت کا جواب تھا جو ہمیشہ تمام دنیا میں جائز سمجھا گیا ہے۔

اس طرح جو واقعات ظہور میں آئے۔ ان کی اہمیت صرف سیاسی نہ تھی۔ اس سے زیادہ بڑی بات یہ تھی کہ اس انقلاب کے ذریعہ انسانی تاریخ کے بند دروازے کو کھول دینا مقصود تھا۔ اس کے ذریعہ وہ انقلاب آنا تھا جو دین حق کو ایک تاریخی حقیقت بنا دے، جو اس سے پہلے تاریخی واقعہ کی حیثیت حاصل کرنے سے محروم تھا۔ وہ پریس کا دور لے آئے جس کے بعد قرآن کی دائمی حفاظت کا انتظام ہو جائے۔ آزادی اور جمہوریت کا زمانہ آئے جو داعیان حق کے لیے حق کی اشاعت کی راہ سے تمام مصنوعی رکاوٹوں کو ہٹا دے۔ اس سے طبیعیاتی علوم کی وہ دریافتیں ظاہر ہوں جو دین کی صداقت کو عقلیاتی سطح پر مدلل و مبرہن کر دیں۔

اس انقلاب کا اس سے بھی اہم پہلو یہ ہے کہ نبی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے قیامت سے پہلے قیامت کا منظر دکھا دیا۔ سچے لوگوں کو آپ کے ذریعہ غالب کر دیا گیا جو آخرت میں دائمی برتری حاصل کریں گے، اور برے لوگوں کو آپ کے ذریعہ مغلوب کر دیا گیا جو آخرت میں دائمی پستی اور مغلوبیت کا شکار رہیں گے۔

تاریخ کا یہ اندوہناک منظر ہے کہ خدا کے سچے پرستار یہاں ہمیشہ دبے اور پسے ہوئے نظر آتے ہیں، اور دولت اور اقتدار کو پوجنے والوں کو یہاں تفوق حاصل رہتا ہے۔ تمام انبیاء اور صلحاء کی تاریخ یہی بتاتی ہے۔ یہ صورت حال حقیقی صورت حال کے بالکل برعکس ہے۔ کیونکہ بالآخر جو ہونے والا ہے، وہ تو یہ کہ خدا اپنے پرستاروں کو دائمی عزت اور برتری عطا فرمائے گا اور جو لوگ اپنے نفس کی اور دنیا کی پوجا میں لگے رہے، ان کو ہمیشہ کے لیے ذلت اور رسوائی میں دھکیل دے گا۔

یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں لوگوں کو موقع ہے کہ وہ جو چاہیں کریں۔ اس لیے یہاں خدا کسی کا ہاتھ نہیں پکڑتا۔ تاہم پیغمبر اسلام کے ذریعہ، کم از کم ایک بار اس زمین پر وہ منظر ابتدائی شکل میں دکھا دیا گیا ہے جو کامل اور دائمی صورت میں آخرت میں سامنے آنے والا ہے۔ آپ کے ساتھی جن کا حال یہ تھا کہ ان کے گھروں کو اجاڑ دیا گیا، جن کے لیے زمین کو تنگ بنا دیا گیا، جن کی معاشیات تباہ کر دی گئیں، جن کو اس قدر خوف و ہراس میں مبتلا کیا گیا کہ ان کو ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا کہ لوگ انھیں اچک لیں گے —— ان کو عزت اور اقتدار کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ دوسری طرف قریش اور یہود، رومی اور ایرانی، یمنی اور غسانی جو دولت اور اقتدار کے گھمنڈ میں مبتلا تھے، ان کو ذلیل کر کے پستی کے گڑھے میں ڈال دیا گیا۔

ہر نبی جو خدا کی طرف سے آتا ہے، وہ زمین پر خدا کی عدالت ہوتا ہے۔ اس کی معرفت خدا اپنے ان فیصلوں سے لوگوں کو باخبر کرتا ہے جس کو وہ آخرت میں براہ راست خود سنانے والا ہے۔ مگر پیغمبر اسلام کے ذریعہ یہ عدالت الٰہی ایسی خصوصی شکل میں ظاہر ہوئی کہ وہ خود تاریخ انسانی کا جزو بن گئی۔ جس طرح بہت سے دوسرے انسانی تجربات

تاریخی حقیقت کا درجہ اختیار کر چکے ہیں، اسی طرح یہ واقعہ بھی ایک تاریخی حقیقت کی حیثیت سے انسانی معلومات میں ثبت ہو چکا ہے کہ خدا اپنے متقی بندوں کو سرفراز کرتا ہے اور جو لوگ سرکشی اختیار کریں، ان کو ذلت و بربادی کے دائمی عذاب میں دھکیل دیتا ہے۔ جنت اور جہنم اگرچہ دوسری دنیا میں قائم ہونے والی حقیقتیں ہیں۔ مگر انسان کی نصیحت کے لئے اللہ نے اس کا ایک ابتدائی منظر اسی دنیا میں لوگوں کو دکھا دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نبوت محمدی کا ظہور، خدا کی خدائی کا ظہور تھا، اسی لئے انجیل میں اس کو "خدا کی بادشاہت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آپ کے لائے ہوئے انقلاب کی بلاشبہ سیاسی اور عمرانی اہمیت بھی ہے اور دوسری بہت سی اہمیتیں بھی۔ مگر اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ انسان کو خدا کے جلال کا مشاہدہ کراتا ہے۔ وہ خدا کی عدالت کا منظر دکھا رہا ہے، اس نے ان حقیقتوں کو آخرت سے پہلے انسان کے سامنے بے نقاب کر دیا ہے جن کو انسان آخرت میں اپنی کلی شکل میں دیکھے گا۔

مثالی کردار

پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ۲۲ اپریل ۵۷۱ء کو عرب میں پیدا ہوئے اور ۸ جون ۶۳۲ء کو آپ کی وفات ہوئی۔ آپ نہایت تندرست اور طاقت ور تھے۔ بچپن سے یہ حال تھا کہ جو دیکھتا، کہہ اٹھتا: ان لھذا الغلام لشأنا۔ بڑے ہوئے تو آپ کی شخصیت اور زیادہ نمایاں ہوگئی۔ آپ کو دیکھنے والے آپ سے مرعوب ہو جاتے۔ اسی کے ساتھ اتنے نرم اور شیریں زبان تھے کہ تھوڑی دیر بھی جو شخص آپ کے قریب رہتا، آپ سے محبت کرنے لگتا۔ برداشت، سچائی، معاملہ فہمی، حسن سلوک آپ کے اندر کامل درجہ میں پایا جاتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ آپ اس انسانی بلندی کی اعلیٰ ترین مثال تھے جس کو نفسیات کی اصطلاح میں متوازن شخصیت (Balanced Personality) کہا جاتا ہے۔ داؤد بن حصین کا بیان ہے کہ عرب کے لوگ عام طور پر یہ کہتے سنے جاتے تھے کہ محمد بن عبد اللہ اس شان سے جوان ہوئے کہ آپ اپنی قوم میں سب سے زیادہ با اخلاق، پڑوسیوں کی خبر گیری کرنے والے، حلیم و بردبار، صادق و امین، جھگڑے سے دور رہنے والے، فحش گوئی و دشنام طرازی سے پرہیز کرنے والے تھے۔ اسی وجہ سے آپ کی قوم نے آپ کا نام "الامین" رکھا تھا (خصائص کبریٰ، جلد ۱، صفحہ ۹۱)

۲۵ سال کی عمر میں جب آپ نے شادی کی تو اس موقع پر آپ کے چچا ابو طالب نے نکاح کا خطبہ پڑھتے ہوئے کہا تھا:

ان ابن اخی محمد ابن عبد اللہ لا یوزن بہ رجل الا رجح بہ شرفا و نبلا و فضلا و عقلا، وھو واللہ بعد ھذا لہ نبأ عظیم و خطر جلیل	میرے بھتیجے محمد بن عبد اللہ کا مقابلہ جس شخص سے بھی کیا جائے، وہ شرافت، نجابت، بزرگی اور عقل میں اس سے بڑھ جائے گا۔ خدا کی قسم اس کا مستقبل عظیم ہوگا، اور اس کا رتبہ بلند ہوگا۔

ابو طالب نے یہ الفاظ ان معنوں میں نہیں کہے تھے جن معنوں میں بعد کو تاریخ نے اسے سچا ثابت کیا۔ انھوں نے یہ بات تمام تر دنیوی معنوں میں کہی تھی۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ جو شخص فطرت سے وہ پرکشش شخصیت لے کر پیدا ہوا ہو، جو محمد بن عبد اللہ میں نظر آتی ہے، وہ بہر حال قوم کے اندر معزز مقام حاصل کرتا ہے اور دنیا کے بازار میں اس کی بڑی قیمت مل کر رہتی ہے۔ ایسے شخص کی اعلیٰ صلاحیتیں اس کی ترقی اور کامیابی کی یقینی ضمانت ہیں۔

پیغمبر اسلام کے لئے یہ امکانات، بلاشبہ، پوری طرح موجود تھے۔ آپ اپنی صلاحیتوں کی بڑی سے بڑی دنیوی قیمت وصول کر سکتے تھے۔ آپ مکہ کے ایک اونچے خاندان میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ آپ کو اپنے باپ سے وراثت میں صرف

ایک اونٹنی اور ایک خادمہ ملی تھی۔ مگر آپ کی شاندار پیدائشی خصوصیات نے مکہ کی سب سے امیر خاتون کو متاثر کیا۔ ۲۵ سال کی عمر میں ان سے آپ کا نکاح ہوگیا۔ یہ ایک تاجر خاندان کی بیوہ تھیں۔ ان سے آپ کو نہ صرف مال اور جائداد ملی، بلکہ عرب میں اور عرب کے باہر تجارت کا زبردست میدان بھی ہاتھ آیا۔ اب آپ کے لئے ایک پرسکون اور کامیاب زندگی بنانے کے سارے مواقع فراہم ہو چکے تھے۔ مگر آپ نے ان کو چھوڑ کر ایک اور ہی چیز کا انتخاب کیا۔ آپ نے جانتے بوجھتے اپنے کو ایک ایسی راہ پر ڈال دیا جو صرف دنیا کی بربادی کی طرف لے جاتی تھی۔ خدیجہ سے نکاح سے پہلے آپ اپنی گزر اوقات کے لئے کچھ معاشی کام کر لیتے تھے۔ اب وہ بھی چھوٹ گیا، اب آپ ہمہ تن اس تلاش میں لگ گئے جس کی جستجو آپ کو بچپن سے تھی۔ یہ کہ سچائی کیا ہے۔ آپ گھنٹوں بیٹھے ہوئے زمین و آسمان پر غور کرتے رہتے۔ مکہ کے شرفاء میں اپنے تعلقات بڑھانے اور وہاں کی مجلسوں میں اپنی جگہ پیدا کرنے کے بجائے آپ نے یہ کیا کہ صحراؤں اور پہاڑوں کو اپنا ہم نشین بنا لیا۔ مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑی سلسلہ ہے جس میں ایک کھوہ ہے جس کا نام حرا ہے۔ آپ ستو اور پانی لے کر وہاں چلے جاتے۔ پہاڑ کے سنسان ماحول میں زندگی کی حقیقت پر غور کرتے۔ زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے سے دعائیں مانگتے کہ میرے رب! تو اپنے آپ کو میرے اوپر ظاہر کر دے۔ سچائی کیا ہے، مجھ کو بتا دے۔ جب پانی کی مشک خالی ہو جاتی اور ستو ختم ہو جاتے تو گھر واپس آتے تاکہ دوبارہ اسی طرح کھانے پینے کا سامان لے کر قدرت کے اس ماحول میں لوٹ جائیں جہاں صحرا اور درخت تھے۔ پہاڑ اور آسمان کی پرسکون فضائیں تھیں۔ آپ کی بے چین طبیعت انسانی ہنگاموں میں اپنے سوال کا جواب نہ پا سکی تھی۔ اب آپ نے قدرت کی خاموش دنیا کو اپنا ہم نشین بنایا تھا کہ شاید وہ اس کا کچھ جواب دے سکے۔

جوانی کی طاقتوں سے بھرپور ایک شخص کے لئے اس قسم کی زندگی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ خوشی کے راستہ کو چھوڑ کر غم کے راستہ کو اپنانا تھا۔ بیوی بچوں کے ساتھ آرام کی زندگی گزارنا، تجارت کو ترقی دینا اور سوسائٹی میں اپنی جگہ بنانا، یہ تمام امکانات آپ کے لئے پوری طرح کھلے ہوئے تھے۔ مگر آپ کی بے تاب اور متلاشی طبیعت ان چیزوں پر راضی ہونے کے لئے تیار نہ تھی۔ تمام چیزیں اس وقت تک آپ کو ہیچ معلوم ہوتی تھیں جب تک آپ زندگی کا راز معلوم نہ کر لیں۔ آپ جاننا چاہتے تھے کہ ان ظاہری چیزوں سے اوپر اگر کوئی حقیقت ہے تو وہ کیا ہے۔ نفع نقصان اور آرام و تکلیف کی اصطلاحوں میں سوچنے کے بجائے آپ اس سوال کو حل کرنے میں منہمک رہتے کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔

پیغمبر اسلام کی زندگی کا یہی وہ پہلو ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے: وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى (والضحیٰ) ضال کے معنی ہیں راہ بھولا ہوا، سرگرداں۔ (ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ضل فی شعاب مکۃ وھو صغیر ثم رجع) یہ لفظ اس مسافر کے لئے بولا جاتا ہے جو راستہ سے بھٹک گیا ہو اور حیران و پریشان مختلف راستوں کو دیکھ رہا ہو، اس کی سمجھ میں نہ آتا ہو کہ کدھر جائے۔ اسی لئے اس درخت کو ضالہ کہتے ہیں جو صحرا میں اکیلا کھڑا ہو اور اس کے آس پاس کوئی دوسرا درخت نہ ہو۔ اسی سے کہا جاتا ہے ضل الماء فی اللبن (پانی دودھ میں کھو گیا) آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ جاہلیت کے بیابان میں اکیلے درخت کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ صحراؤں اور پہاڑوں میں یہ غم لئے پھرتے تھے کہ سچائی کیا ہے جس کو میں اپناؤں۔ دنیا کے مروجہ نقشوں میں اپنی جگہ بنانے کے بجائے حیران و متفکر ہو کر الگ تھلگ

جا پڑے تھے۔ سچائی سے کمتر کوئی چیز آپ کی روح کے لئے تسکین کا ذریعہ نہیں بن سکتی تھی۔ حتیٰ کہ آپ کی تلاش حق کی سرگردانی اس نوبت کو پہنچ گئی تھی کہ زندگی آپ کے لئے ایک ایسا بوجھ بن گئی جو آپ کی کمر توڑے دے رہی تھی۔ (الم نشرح)

اس وقت اللہ کی رحمت آپ کی طرف متوجہ ہوئی۔ آپ کے لئے ہدایت اور روشنی کے دروازے کھول دیئے گئے۔ ۱۲ فروری ۶۱۰ کو جب کہ آپ حرا میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے، خدا کا فرشتہ انسان کی صورت میں آپ کے سامنے ظاہر ہوا اور خدا کی طرف سے آپ کو وہ کلمات سکھائے جو قرآن کی سورہ نمبر ۹۶ کی ابتدا میں درج ہیں۔ آپ کی تلاش نے بالآخر اپنا جواب پالیا۔

پیغمبر اسلام کی بے چین روح کا ربط رب العالمین سے قائم ہوگیا۔ خدا نے آپ کو نہ صرف ہدایت دی بلکہ اپنے نمائندۂ خاص کی حیثیت سے چن لیا۔ آپ کے اوپر خدا کا کلام اترنے لگا۔ آپ کی نبوت کی یہ مدت ۲۳ سال تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس مدت میں خدا کی کتاب (قرآن) مکمل طور پر آپ کے اوپر اتاری گئی۔

پیغمبر اسلام نے اپنی مشکل زندگی کے چالیسویں سال میں سچائی دریافت کرلی۔ مگر یہ سچائی آپ کے لئے کوئی آسان سودا نہ تھی۔ اس سچائی کا مطلب یہ تھا کہ آدمی ایک عظیم تر خدا کی زد میں ہے۔ یہ اپنے عجز کے مقابلہ میں خدا کی کبریائی کی دریافت تھی یہ خدا کے اثبات کے مقابلہ میں اپنی نفی کا پتہ لگانا تھا۔ یہ اس راز کو معلوم کرنا تھا کہ اس دنیا میں بندۂ مومن کی صرف ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں ہیں، یہاں اس کا کوئی حق نہیں ہے۔

سچائی کی دریافت کے بعد، پیغمبر اسلام کے لئے، زندگی کے معنے کیا تھے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہاں صرف ایک حدیث نقل کی جاتی ہے۔ آپ نے ایک بار فرمایا:

امرنی ربی بتسع	میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے
خشیۃ اللہ فی السر والعلانیۃ	کھلے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈرتا رہوں
وکلمۃ العدل فی الغضب والرضا	غصہ میں ہوں یا خوشی میں، ہمیشہ انصاف کی بات کہوں
والقصد فی الفقر والغنا	محتاجی اور امیری دونوں حالتوں میں اعتدال پر قائم رہوں
وان اصل من قطعنی	جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں
واعطی من حرمنی	جو مجھے محروم کرے میں اسے دوں
واعفو من ظلمنی	جو مجھ پر ظلم کرے، میں اس کو معاف کردوں
وان یکون صمتی فکرا	اور میری خاموشی غور و فکر کی خاموشی ہو
ونطقی ذکرا	میرا بولنا یاد الٰہی کا بولنا ہو
ونظری عبرۃ (رواہ رزین)	میرا دیکھنا عبرت کا دیکھنا ہو

یہ محض تقریر یا گفتگو کے الفاظ نہ تھے۔ یہ خود آپ کی زندگی تھی جو لفظوں کی صورت میں ڈھل رہی تھی۔ یہ حیرت انگیز حد تک موثر کلمات اور اس قدر پہنچی ہوئی باتیں ایک خالی انسان کی زبان سے نکل ہی نہیں سکتیں۔ یہ الفاظ تو خود بولنے والے

کا مقام بتا رہے ہیں۔ وہ کہنے والے کے اندرون کو انڈیل رہے ہیں۔ وہ بولنے والے کی روح کو الفاظ کے آئینہ میں بے نقاب کر رہے ہیں۔

آپ کی زندگی اگرچہ نبوت ملنے سے پہلے بھی اسی قسم کی تھی، مگر وہ تمام تر فطرت کے زور پر تھی۔ اب سچائی کی دریافت نے اس کو شعور کا درجہ دے دیا۔ جو کردار اب تک طبعی تقاضے کے تحت ظاہر ہوتا تھا، اب وہ ایک سوچے سمجھے ذہن کا ارادی جزء بن گیا۔ یہی بندۂ خدا کا وہ مقام ہے جہاں دنیوی تقاضے انتہائی حد تک گھٹ کر صرف بقدر حاجت رہ جاتے ہیں۔ آدمی کی جینے کی سطح عام انسانوں سے مختلف ہو جاتی ہے۔ اس کا جسم اسی ظاہری دنیا میں ہوتا ہے مگر نفسیاتی اعتبار سے وہ ایک اور دنیا میں زندگی گزارنے لگتا ہے۔

ایک روایت کے مطابق پیغمبر اسلام نے فرمایا:

وعلی العاقل مالم یکن مغلوبا علی عقلہ ان تکون لہ ساعات	عقلمند شخص کے لئے لازم ہے کہ اس پر کچھ گھڑیاں گزریں
ساعۃ یناجی فیھا ربہ	ایسی گھڑی جب کہ وہ اپنے رب سے باتیں کرے،
وساعۃ یحاسب فیھا نفسہ	ایسی گھڑی جب کہ وہ اپنی ذات کا محاسبہ کرے،
وساعۃ یتفکر فیھا فی صنع اللہ	ایسی گھڑی جب کہ وہ خدا کی تخلیق میں غور کر رہا ہو۔
وساعۃ یخلو فیھا لحاجتہ من المطعم والمشرب	اور ایسی گھڑی جب کہ وہ کھانے پینے کی ضرورتوں کے لیے وقت نکالے۔
رواہ ابن حبان فی صحیحہ والحاکم	
وقال صحیح الاسناد عن ابی ذر الغفاری)	

گویا خدا کا وفادار بندہ وہ ہے جس کے روز و شب کے لمحات اس طرح گزریں کہ کبھی اس کی بے قراریاں اس کو خدا سے اتنا قریب کر دیں کہ وہ اپنے رب سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ کبھی یوم الحساب میں کھڑے ہونے کا خوف اس پر اس طرح طاری ہو کہ وہ دنیا ہی میں اپنا حساب کرنے لگے۔ کبھی کائنات میں خدا کی کاریگری کو دیکھ کر وہ اس میں اتنا محو ہو کہ اس کے اندر اس کو خالق کے جلوے نظر آنے لگیں۔ اس طرح گویا خدا سے ملاقات، اپنے آپ سے ملاقات اور کائنات سے ملاقات میں اس کے لمحات گزر رہے ہوں۔ اور بدرجہ حاجت وہ کسی وقت کھانے پینے کے لئے بھی اپنے کو فارغ کر لیا کرے۔

یہ الفاظ دور کے کسی انسان کا تعارف نہیں ہیں۔ اس میں خود پیغمبر اسلام کی اپنی شخصیت بول رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ظاہری جسم کے اندر جو مومنانہ روح تھی اس میں ہر وقت کس قسم کے طوفان اٹھتے رہتے تھے۔ آپ کی زندگی کس قسم کی "ساعات" کے درمیان گزر رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص خود ان گھڑیوں کا تجربہ نہ کر رہا ہو، وہ کبھی اتنے اعلیٰ الفاظ میں اس بات کو بیان ہی نہیں کر سکتا۔ یہ ایک ایسی روح سے نکلے ہوئے کلمات ہیں جس نے ان کیفیات کو خود کمال درجہ میں پایا تھا جس کو وہ لفظوں کے ذریعہ دوسروں پر کھول رہا تھا۔

پیغمبر اسلام کو، وحی خداوندی ملنے سے پہلے، موجودہ دنیا اپنی کمیوں اور محدودیتوں کے ساتھ بے معنی معلوم ہوتی تھی۔ مگر جب آپ پر خدا نے اس حقیقت کو کھولا کہ اس دنیا کے سوا ایک اور دنیا ہے جو کامل اور ابدی ہے اور جو

انسان کی اصلی قیام گاہ ہے، تو زندگی اور کائنات دونوں آپ کے لئے بامعنی ہوگئے۔ اب آپ نے زندگی کی وہ سطح پالی جہاں آپ جی سکتے تھے، جس میں آپ اپنا دل لگا سکتے تھے۔ اب آپ کو ایک ایسی حقیقی دنیا مل گئی جس سے اپنی امیدوں اور تمناؤں کو وابستہ کرسکیں جس کے پیش نظر اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کریں۔

یہی مطلب ہے الدنیا مزرعۃ الآخرۃ (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) کا۔ اس احساس کے تحت جو زندگی بنتی ہے، اس کو آج کل کی اصطلاح میں آخرت رخی زندگی (*Akhirat* Oriented Life) کہا جاسکتا ہے۔ ایسا آدمی، اپنے تصور حیات کے لازمی نتیجہ کے طور پر، آخرت کو اپنا اصل مسئلہ سمجھنے لگتا ہے۔ وہ اس سے باخبر ہو جاتا ہے کہ دنیا ہماری منزل نہیں، وہ صرف راستہ ہے۔ وہ آخرت کے مستقبل کی تیاری کا ایک ابتدائی مرحلہ ہے۔ جس طرح ایک دنیا پرست آدمی کی تمام سرگرمیاں دنیوی مصالح کے گرد گھومتی ہیں، اسی طرح ایک بندہ خدا کی پوری زندگی کا رخ آخرت کی طرف ہو جاتا ہے۔ ہر معاملہ میں اس کا رویہ اس فکر کے تحت بنتا ہے کہ آخرت میں اس کا انجام کیا ہوگا۔ خوشی ہو یا غم، کامیابی ہو یا ناکامی، زبردستی کی حالت ہو یا زور آوری کی، تعریف کی جارہی ہو یا تنقید، غصہ کا موقع ہو یا محبت کا، ہر حال میں آخرت کا خیال اس کا رہنما بنا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ وقت آتا ہے جب کہ آخرت کا فکر اس کے لاشعور کا جزء بن جاتا ہے۔ اگرچہ اب بھی وہ بشریت سے خالی نہیں ہوتا۔ مگر اس کا ذہن انھیں امور میں چلتا ہے جو آخرت سے تعلق رکھنے والے ہوں۔ جن باتوں میں آخرت کا کوئی پہلو نہ ہو ان سے اس کی دلچسپیاں اتنی کم ہو جاتی ہیں کہ بعض اوقات اس کو کہنا پڑتا ہے: انتم اعلم بامور دنیاکم (تم اپنے دنیا کے معاملات کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو)

اس حقیقت کی حیثیت محض ایک علمی دریافت کی نہیں۔ اس کو پانے کے بعد آدمی کی جینے کی سطح بدل جاتی ہے۔ آدمی کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال خود پیغمبر اسلام کی ذات ہے۔ آپ کی زندگی کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ جب تک جینے کی سطح نہ بدلے، عمل کی سطح نہیں بدل سکتی۔

پیغمبر اسلام نے جب یہ حقیقت پائی تو وہ ان کی پوری زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا۔ جس جنت کی خبر آپ دوسروں کو دے رہے تھے، اس کے آپ خود سب سے زیادہ حریص بن گئے اور جس جہنم سے دوسروں کو ڈرا رہے تھے، اس سے آپ خود سب سے زیادہ ڈرنے لگے۔ آپ کا یہ اندرونی طوفان بار بار دعا اور استغفار کی صورت میں آپ کی زبان سے ظاہر ہوتا رہتا تھا۔ آپ کی جینے کی سطح عام انسانوں سے کس طرح مختلف تھی اس کا اندازہ چند واقعات سے ہوگا۔

عن ام سلمۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان فی بیتہا فدعیٰ وصیفۃ لہ اولہا فابطأت فاستبان الغضب فی وجہہ فقامت ام سلمۃ الی الحجاب فوجدت الوصیفۃ تلعب ومعہ سواک فقال لولا خشیۃ القود یوم القیامۃ لاوجعتک بہذا السواک۔

(الادب المفرد، باب قصاص العبد، صفحہ ۲۹)

ام سلمہ بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر میں تھے آپ نے خادمہ کو بلایا۔ اس نے آنے میں دیر کی۔ آپ کے چہرہ پر غصہ ظاہر ہوگیا۔ ام سلمہ نے پردہ کے پاس جا کر دیکھا تو خادمہ کو کھیلتے ہوئے پایا۔ اس وقت آپ کے ہاتھ میں ایک مسواک تھی۔ آپ نے خادمہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: اگر قیامت کے دن مجھے بدلہ کا ڈر نہ ہوتا تو میں تجھ کو اس مسواک سے مارتا۔

بدر کی جنگ (رمضان ۲ھ) کے بعد جو لوگ قیدی بن کر آئے، وہ آپ کے بدترین دشمن تھے۔ مگر آپ نے ان کے ساتھ بہترین سلوک کیا۔ ان قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمرو تھا جو آتش بیان خطیب تھا اور تمام مجمعوں میں آپ کے خلاف بیہودہ تقریریں کیا کرتا تھا۔ عمر فاروقؓ نے رائے دی کہ اس کے نیچے کے دو دانت اکھڑوا دیئے جائیں تاکہ آئندہ کے لئے اس کا تقریر کا جوش ختم ہو جائے۔ آپؐ نے یہ سن کر فرمایا:

خدا میرا چہرہ قیامت میں بگاڑ دے گا اگرچہ میں خدا کا رسول ہوں"

پیغمبر اسلام عام انسانوں کی طرح ایک انسان تھے۔ خوشی کی بات سے آپ کو خوشی ہوتی تھی اور غم کی بات سے آپ غمگین ہوتے تھے۔ مگر آپ کی عبدیت آپ کو خدا کے مقرر کئے ہوئے دائرہ سے باہر نہیں جانے دیتی تھی۔

پیغمبرؐ اسلام کی آخر عمر میں ماریہ قبطیہ سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ لڑکا خوبصورت اور تندرست تھا۔ اس کا نام آپ نے اپنے بزرگ ترین جد امجد کے نام پر ابراہیم رکھا۔ ابو رافع نے جب ابراہیم کی پیدائش کی خبر دی تو آپ اتنا خوش ہوئے کہ ابو رافع کو ایک غلام انعام میں دے دیا۔ آپ ابراہیم کو گود میں لے کر کھلاتے اور پیار کرتے۔ عرب قاعدہ کے مطابق ابراہیم کو ایک دایہ ام بردہ بنت المنذر بن زید انصاری کے حوالے کیا گیا تاکہ وہ دودھ پلائیں۔ یہ دایہ ایک لوہار کی بیوی تھیں۔ ان کے چھوٹے سے گھر میں اکثر بھٹی کا دھواں ہوتا رہتا۔ آپ لڑکے کو دیکھنے کے لئے لوہار کے گھر جاتے اور وہاں دھواں آپ کی آنکھ اور ناک میں گھستا رہتا اور آپ انتہائی نازک طبع ہونے کے باوجود اس کو برداشت کرتے۔ ابراہیم ابھی ڈیڑھ سال کے ہوئے تھے کہ ہجرت کے دسویں سال (جنوری ۶۳۲) ان کا انتقال ہو گیا۔ آپؐ بیٹے کی موت کو دیکھ کر رونے لگے۔

ان واقعات میں پیغمبر اسلام ایک عام انسان کی طرح نظر آتے ہیں۔ ان کے جذبات، ان کی حسرتیں ویسی ہی ہیں جیسی ایک عام باپ کی ہوتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود خدا کا دامن آپ کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ آپ غم زدہ ہیں مگر زبان سے نکل رہا ہے:

واللہ یا ابراہیم انا بفراقک لمحزونون	خدا کی قسم اے ابراہیم ہم تمھاری موت سے غمگین ہیں،
تبکی العین و یحزن القلب ولا نقول	آنکھ رو رہی ہے، دل دکھی ہے، مگر ہم کوئی ایسی بات
ما یسخط الرب	نہ کہیں گے جو رب کو ناپسند ہو۔

جس دن ابراہیم کا انتقال ہوا۔ اتفاق سے اسی دن سورج گرہن پڑا۔ قدیم زمانہ میں اعتقاد تھا کہ سورج گرہن اور چاند گرہن کسی بڑے آدمی کی موت سے ہوا کرتے ہیں۔ اس کے اثر سے مدینہ کے مسلمان کہنے لگے کہ یہ سورج گرہن پیغمبر کے بیٹے کی موت کی وجہ سے ہوا ہے۔ آپ کو یہ بات بہت ناپسند ہوئی کیوں کہ یہ انسان کی عاجزانہ حیثیت کے خلاف تھی۔ آپ نے لوگوں کو جمع کر کے تقریر کی، آپ نے فرمایا:

ان الشمس والقمر لا ینخسفان لموت احد من الناس	سورج چاند میں کسی انسان کی موت سے گہن نہیں لگتا۔ وہ اللہ کی
ولکنھما آیتان من آیات اللہ، فاذا رأیتموھا فصلوا	نشانیوں میں سے دو نشانی ہیں۔ جب تم ایسا دیکھو تو نماز پڑھو

آپ کا ایک واقعہ تاریخ ان لفظوں میں بتاتی ہے :

روی انه کان فی سفر وامر اصحابه باصلاح شاة، فقال رجل، یارسول الله علیّ ذبحها، وقال آخر علیّ سلخها، وقال آخر علیّ طبخها، فقال علیه السلام وعلیّ جمع الحطب۔ فقالوا یارسول الله نکفیک العمل، قال علمت انکم تکفوننی، ولکن اکره ان اتمیز علیکم، ان الله سبحانه وتعالیٰ یکره من عبده ان یراه متمیزا بین اصحابه

ایک بار آپ سفر میں تھے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں سے ایک بکری تیار کرنے کا حکم دیا۔ ایک شخص بولا: میں اس کو ذبح کروں گا۔ دوسرے نے کہا میں اس کی کھال اتاروں گا۔ تیسرے نے کہا، میں اس کو پکاؤں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں لکڑی جمع کروں گا۔ لوگوں نے کہا، اے خدا کے رسول، ہم سب کام کرلیں گے۔ آپ نے فرمایا، میں جانتا ہوں کہ تم لوگ کرلوگے۔ مگر میں امتیاز کو پسند نہیں کرتا۔ اللہ کو یہ پسند نہیں کہ اس کا کوئی بندہ اپنے ساتھیوں کے درمیان امتیاز کے ساتھ رہے۔

آپ کی عبدیت کا یہ حال تھا کہ آپ نے فرمایا:

والله لا ادری والله لا ادری وانا رسول الله مایفعل بی ولا بکم (بخاری)

خدا کی قسم میں نہیں جانتا، خدا کی قسم میں نہیں جانتا۔ اگرچہ میں خدا کا رسول ہوں۔ کیا کیا جائے گا میرے ساتھ اور کیا کیا جائے گا تمھارے ساتھ۔

ابوذر غفاری بتاتے ہیں۔ ایک روز میں ایک مسلمان (صحابی) کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ان کا رنگ کالا تھا۔ کسی ضرورت سے میں نے ان کو خطاب کیا تو میری زبان سے نکل گیا:

یا ابن السوداء — اے کالے رنگ والے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو سخت ناپسند کیا اور فرمایا:

طفّ الصاع، طفّ الصاع — پیمانہ پورا بھر، پیمانہ پورا بھر

یعنی سب کو ایک پیمانہ سے دو۔ ایسا نہ کرو کہ کسی کو اچھے الفاظ کے ساتھ خطاب کرو اور کسی کو برے الفاظ کے ساتھ۔ انسان اور انسان کے درمیان امتیاز نہ کرو۔ پھر آپ نے فرمایا:

لیس لابن البیضاء علی ابن السوداء فضل — کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔

ابوذر غفاری کو اس تنبیہ کے بعد فی الفور اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ شدت خوف سے زمین پر لیٹ گئے اور اس شخص سے کہا: قُم فَطَأ علی خدّی (کھڑا ہو اور میرے چہرے کو اپنے پیروں سے مسل دے)

ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مال دار مسلمان کو دیکھا کہ وہ اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک غریب مسلمان سے بچنے کی کوشش کر رہا ہے اور اپنے کپڑے سمیٹ رہا ہے۔ آپ نے فرمایا:

اخشیتَ ان یعدو الیک فقره (غزالی، احیاء علوم الدین) — کیا تم کو ڈر ہے کہ اس کی غریبی تم کو لپٹ جائے گی

مدینہ میں باقاعدہ اسلامی حکومت قائم ہو چکی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ذمہ دار اعلیٰ ہیں۔ اس زمانہ میں آپ کو ایک بار ایک یہودی سے قرض لینے کی ضرورت پیش آئی جس کا نام زید بن سعنہ تھا۔ قرض کی ادائگی کے لئے جو مدت طے ہوئی تھی، ابھی اس میں چند دن باقی تھے کہ یہودی تقاضا کرنے کے لئے آگیا۔ اس نے آپ کے کندھے کی چادر اتار لی اور کرتا پکڑ کر سختی سے بولا: "میرا قرض ادا کرو۔" پھر کہنے لگا "عبدالمطلب کی اولاد بڑی نادہند ہے"

حضرت عمر فاروق رضؓ اس وقت آپ کے ساتھ تھے۔ یہودی کی بدتمیزی پر ان کو سخت غصہ آگیا۔ انھوں نے اس کو ڈانٹا۔ قریب تھا کہ اس کو مارنا شروع کر دیں۔ مگر پیغمبر اسلام صرف مسکراتے رہے۔ یہودی سے صرف اتنا کہا: ابھی تو وعدہ میں تین دن باقی ہیں (لقد بقی من اجلہ ثلاث) پھر عمر فاروق رضؓ سے فرمایا:

انا وھو کنا الیٰ غیر ھذا امنک احوج یا عمر، تامرنی بحسن القضاء وتامرہ بحسن التقاضی (رواہ البیہقی مفصلاً)	عمر! میں اور یہ یہودی تم سے ایک اور برتاؤ کے زیادہ ضرورت مند تھے، مجھ سے تم بہتر ادائگی کے لئے کہتے اور اور اس سے بہتر تقاضے کے لئے۔

پھر عمر فاروق رضؓ سے فرمایا کہ جاؤ فلاں شخص سے کھجوریں لے کر اس کا قرض ادا کر دو۔ اور بیس صاع (تقریباً ۴۰ کیلو) زیادہ دینا، کیونکہ تم نے اسے جھڑکا تھا۔

پیغمبر اسلام کو اپنی زندگی میں اتنی کامیابی حاصل ہوئی کہ آپ عرب سے لے کر فلسطین تک کے علاقہ کے حکمراں بن گئے۔ رسول اللہ ہونے کی وجہ سے آپ کی زبان قانون کا درجہ رکھتی تھی۔ آپ ایسے لوگوں کے درمیان تھے جو آپ کی عقیدت و تعظیم اتنی زیادہ کرتے تھے جو کبھی کسی انسان کی نہیں کی گئی۔ حدیبیہ کی بات چیت کے موقع پر عروہ بن مسعود قریش کے سفیر کی حیثیت سے آئے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جب آپ وضو کرتے ہیں تو لوگ دوڑ پڑتے ہیں کہ آپ کا غسالہ زمین پر گرنے سے پہلے ہاتھ پر لے لیں اور اس کو تبرک کے طور پر جسم پر مل لیں۔ انسؓ کہتے ہیں کہ انتہائی محبت کے باوجود ہم لوگ آنکھ بھر کر آپ کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مغیرہ کہتے ہیں کہ کسی صحابی کو آپ کی رہائش گاہ پر دستک دینے کی ضرورت ہوتی تو وہ ناخن سے دروازہ کھٹکھٹاتا تھا۔ جابر بن سمرہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سرخ چادر اوڑھ کر چاندنی رات میں سو رہے تھے۔ میں کبھی چاند کو دیکھتا، کبھی آپ کو۔ بالآخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ آپ چاند سے زیادہ خوش نما ہیں (فاذا ھو احسن عندی من القمر) حنین میں جب جنگ کے شروع میں مسلم فوج کو شکست ہوئی اور مخالف فوج نے آپ کے اوپر تیروں کی بارش شروع کر دی تو آپ کے ساتھیوں نے آپ کو گھیرے میں لے لیا، وہ سارے تیر اپنے ہاتھ اور جسم پر اس طرح روکتے رہے جیسے وہ انسان نہیں، لکڑی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض ساتھیوں کا یہ حال ہوا کہ ان کے جسم پر سیاہی کے کانٹے کی طرح تیر لٹکنے لگے تھے۔

اس قسم کا مرتبہ اور عقیدت آدمی کے مزاج کو بگاڑ دیتا ہے۔ وہ اپنے کو دوسروں سے بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ مگر آپ لوگوں کے درمیان بالکل عام انسان کی طرح رہتے۔ کوئی تلخ تنقید یا اشتعال انگیز رویہ آپ کو آپے سے باہر کرنے والا ثابت نہ ہوتا۔ صحیحین میں حضرت انس رضؓ سے منقول ہے کہ ایک دیہاتی آیا۔ اس نے آپؐ کی چادر کو زور سے کھینچا جس

کی وجہ سے آپ کی گردن میں نشان پڑ گیا۔ پھر بولا: "محمد! میرے یہ دو اونٹ ہیں۔ ان کی لاد کا سامان مجھے دو، کیونکہ جو مال تیرے پاس ہے، وہ نہ تیرا ہے، نہ تیرے باپ کا ہے۔" آپؐ نے فرمایا مال تو اللہ کا ہے اور میں اس کا عبد ہوں۔ پھر دیہاتی سے پوچھا "جو برتاؤ تم نے مجھ سے کیا، اس پر تم ڈرتے نہیں" وہ بولا نہیں۔ آپ نے پوچھا کیوں۔ اس نے کہا، مجھے معلوم ہے کہ تم برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے۔ آپ یہ سن کر ہنس پڑے اور حکم دیا کہ دیہاتی کو ایک اونٹ کا بوجھ جو اور ایک کی کھجوریں دی جائیں۔

آپ پر خدا کی ہیبت اتنی طاری رہتی کہ آپ بالکل عجز اور بندگی کی تصویر بنے رہتے تھے۔ بہت کم بولتے، چلتے تو جھک کر چلتے۔ تنقید سے کبھی خفا نہ ہوتے۔ کپڑا پہنتے تو فرماتے کہ میں خدا کا بندہ ہوں اور بندوں کی طرح لباس پہنتا ہوں انما انا عبد البس کما یلبس العبد) کھانا کھاتے تو ادب کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے اور فرماتے کہ میں بندوں طرح کھانا کھاتا ہوں: (انا اکل کما یاکل العبد)

اس معاملہ میں آپ کے نزاکت احساس کا عالم یہ تھا کہ آپ کے ایک ساتھی نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے ایک بار کہا: ماشاء اللہ وماشئت (جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں) یہ سنتے ہی آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، آپ تے درشتی کے ساتھ فرمایا: اجعلتنی للہ ندا (کیا تم نے مجھے اللہ کے برابر کر دیا) تم کو اس طرح کہنا چاہئے: ماشاء اللہ وحدہ (وہ ہوگا جو اللہ چاہے) اسی طرح ایک صحابی نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

من یطع اللہ ورسولہ فقد رشد ومن یعصھما فقد غوی — جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے وہ راہ راست پر ہے اور جو ان دونوں کی نافرمانی کرے وہ گمراہ ہے۔

آپؐ نے یہ سن کر فرمایا: بئس خطیب القوم انت (تو قوم کا برا خطیب ہے) آپؐ نے پسند نہیں فرمایا کہ اللہ اور رسول کو تثنیہ کی ایک ہی ضمیر میں جمع کر دیا جائے۔

پیغمبر اسلام کے یہاں تین لڑکے پیدا ہوئے جو بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔ چار صاحبزادیاں بڑی عمر کو پہنچیں۔ چاروں حضرت خدیجہ کے بطن سے تھیں۔ حضرت فاطمہؓ آپؐ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ آپؐ حضرت فاطمہؓ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ کسی سفر سے واپس لوٹتے تو مسجد میں دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ کے گھر جاتے۔ ان کے ہاتھ اور پیشانی کو چومتے۔ حضرت عائشہؓ سے جمیع بن عمیر صحابی نے پوچھا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب کون تھا۔ انھوں نے جواب دیا "فاطمہؓ"

مگر پیغمبر اسلام کی پوری زندگی آخرت میں ڈھل گئی تھی۔ اس لئے اولاد سے محبت کا مفہوم بھی آپ کے یہاں دوسرا تھا۔ ایک روایت جو نسائی کے سوا دوسری تمام کتب صحاح میں نقل ہوئی ہے، یہ ہے کہ علی مرتضیٰؓ نے ایک بار ابن عبد الواحد سے فرمایا۔ میں تجھ کو فاطمہ بنت رسولؐ کی ایک بات سناؤں جو سارے کنبہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب تھیں۔ ابن عبد الواحد نے کہا، ہاں۔

حضرت علیؓ نے کہا۔ فاطمہ کا یہ حال تھا کہ چکی پیستیں تو ہاتھ میں چھالے پڑ جاتے۔ پانی کی مشک اٹھانے کی وجہ

سے گردن میں نشان پڑ گیا تھا۔ جھاڑو دیتیں تو کپڑے میلے ہو جاتے۔ انھیں دنوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ خادم آئے۔ میں نے فاطمہ سے کہا، تم اپنے والد کے پاس جاؤ اور اپنے لئے ایک خادم مانگو۔ فاطمہؓ گئیں۔ مگر وہاں ہجوم تھا مل نہ سکیں۔ اگلے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر آئے اور پوچھا کہ کیا ضرورت تھی۔ فاطمہ چپ ہو گئیں۔ میں نے قصہ بتایا اور یہ بھی کہا کہ میں نے ان کو کہلا کر بھیجا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سننے کے بعد فرمایا:

اتقی اللہ یا فاطمۃ وادّی فریضۃ ربک واعمل عمل اہلک، واذا اخذت مضجعک فسبحی ثلاثا وثلاثین واحمدی ثلاثا وثلاثین و کبّری اربعا وثلاثین، فذلک مائۃ، ھی خیر لک من خادم	اے فاطمہ خدا سے ڈرو۔ اپنے رب کے فرائض ادا کرو، اپنے گھر والوں کا کام کرو۔ جب بستر پر جاؤ تو ۳۳ بار خدا کی تسبیح کرو، ۳۳ بار خدا کی حمد کرو۔ ۳۴ بار خدا کی تکبیر کرو۔ یہ پورا سو ہو گیا۔ یہ تمھارے لئے خادم سے بہتر ہے۔

حضرت فاطمہؓ نے یہ سن کر کہا رضیت عن اللہ وعن رسولہ (میں خدا و رسول سے اس پر خوش ہوں) حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بس یہ جواب دیا اور فاطمہ کو خادم نہیں دیا۔ (ولم یخدمہا)

پیغمبر اسلام پر جو حقیقت کھولی گئی، وہ یہ تھی کہ یہ عالم بے خدا نہیں ہے۔ اس کا ایک خدا ہے اور وہی اس کا خالق اور مالک ہے۔ سارے انسان اس کے بندے ہیں اور اسی کے سامنے بالآخر جواب دہ ہیں۔ مرنے کے بعد آدمی ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ دوسری دنیا میں اپنی مستقل زندگی شروع کرنے کے لئے داخل ہو جاتا ہے۔ وہاں نیک آدمیوں کے لئے جنت کا آرام ہے اور برے لوگوں کے لئے جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ۔

خدا نے جب آپ کو اس حقیقت کا علم دیا تو یہ بھی حکم دیا کہ سارے انسانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر دو۔ مکہ کے کنارے صفا نام کی ایک چٹان تھی جو اس زمانہ میں عوامی اجتماعات کے لئے قدرتی اسٹیج کا کام دیتی تھی۔ آپ نے صفا پر چڑھ کر لوگوں کو پکارا۔ لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے تقریر کی۔ آپ نے خدا کی عظمت بیان کرنے کے بعد کہا:

واللہ لتموتنّ کما تنامون ولتبعثنّ کما تستیقظون۔ ولتحاسبنّ بما تعملون ولتجزونّ بالاحسان احسانا وبالسوء سوءا۔ وانہا لجنۃ ابدا او لنار ابدا (جمہرۃ خطب العرب)	خدا کی قسم تمھیں مرنا ہے جس طرح تم سوتے ہو اور پھر تم کو اٹھنا ہے جس طرح تم جاگتے ہو اور ضرور تم سے حساب لیا جائے گا جو تم کرتے ہو اور پھر اچھے کام کا اچھا بدلہ ہے اور برے کا برا بدلہ اور اس کے بعد یا تو ہمیشہ کے لئے باغ ہے یا ہمیشہ کے لئے آگ

زمانہ کے خلاف کسی طریقہ کو آدمی صرف ذاتی طور پر اختیار کرے، اس وقت بھی اگرچہ قدم قدم پر مشکلیں پیش آتی ہیں، تاہم یہ مشکلیں جارحانہ نوعیت کی نہیں ہوتیں۔ یہ مشکلیں آدمی کے جذبات کو ٹھیس پہنچاتی ہیں۔ مگر وہ آدمی کے جسم کو زخمی نہیں کرتیں۔ یہ زیادہ سے زیادہ آدمی کے خاموش صبر کا امتحان ہوتی ہیں۔ مگر اس وقت صورت حال بالکل بدل جاتی ہے جب آدمی زمانہ کے خلاف ایک آواز کا داعی بن کر کھڑا ہو جائے، جب وہ دوسروں سے کہنے لگے کہ یہ کرو اور وہ نہ کرو۔ پیغمبر اسلام صرف ایک بندۂ مومن نہ تھے بلکہ پیغام الٰہی کو دوسروں تک پہنچانے کا مشن بھی آپ کے سپرد کیا گیا

تھا۔ آپ کی اس دوسری حیثیت نے آپ کو پوری عرب قوم سے ٹکرادیا۔ فاقہ سے لے کر جنگ تک سخت ترین حالات پیش آئے۔ مگر ۲۳ سال کی پوری زندگی میں آپ مکمل طور پر انصاف اور تقویٰ پر قائم رہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپ کے اندر انسانی جذبات نہیں تھے، اصل یہ ہے کہ خدا کے خوف نے آپ کو پابند بنا رکھا تھا۔

ہجرت کے تیسرے سال مکہ کے مخالفین نے مدینہ پر چڑھائی کی اور وہ معرکہ پیش آیا جس کو غزوۂ احد کہا جاتا ہے اس جنگ میں ابتداءً مسلمانوں نے فتح پائی۔ مگر اس کے بعد آپ کے بعض ساتھیوں کی غلطی سے دشمنوں کو موقع مل گیا اور انھوں نے پیچھے سے حملہ کر کے جنگ کا نقشہ بدل دیا۔ یہ بڑا بھیانک منظر تھا۔ آپ کے اکثر ساتھی میدان جنگ سے بھاگنے لگے۔ یہاں تک کہ آپ مسلح دشمنوں کے نرغہ میں تنہا ہو گئے۔ مخالف ہجوم بھوکے بھیڑیئے کی طرح آپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو پکارنا شروع کیا الی عباداللہ (خدا کے بندو میری طرف آؤ) من رجل یشری لنا نفسہ (کون ہے جو ہمارے لئے اپنی جان قربان کرے) کون ہے جو ان ظالموں کو مجھ سے ہٹائے، وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا (مسلم)

وہ کیسا ہولناک سماں ہوگا۔ جب خدا کے رسول کی زبان سے اس قسم کے الفاظ نکل رہے تھے۔ اگرچہ آپ کے ساتھیوں میں سے ایک تعداد نے آپ کی پکار پر لبیک کہی۔ مگر اس وقت اتنا انتشار کا عالم تھا کہ آپ کے جاں نثار بھی آپ کو پوری طرح بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ عتبہ ابن ابی وقاص نے آپ کے اوپر ایک پتھر پھینکا۔ یہ پتھر آپ کو اتنے زور سے لگا کہ ہونٹ کچل گئے اور نیچے کے دانت ٹوٹ گئے۔ عبداللہ ابن قمیہ قریش کا مشہور پہلوان تھا۔ اس نے آپ پر شدید حملہ کیا۔ جس کے نتیجہ میں لوہے کی خود کی دو کڑیاں آپ کے رخسار میں گھس گئیں۔ یہ کڑیاں اتنی گہرائی تک گھسی تھیں کہ ابو عبیدہ بن الجراح نے جب ان کو نکالنے کے لئے اپنے دانتوں سے پکڑ کر کھینچا تو ابو عبیدہ رضؓ کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ایک اور شخص عبداللہ بن شہاب زہری نے آپ کو پتھر مارا جس سے آپ کی پیشانی زخمی ہو گئی۔ مسلسل خون بہنے سے آپ بے حد کمزور ہو گئے۔ حتیٰ کہ آپ ایک گڑھے میں گر پڑے۔ میدان میں جب آپ دیر تک نظر نہیں آئے تو مشہور ہو گیا کہ آپ شہید ہو گئے۔ اس دوران میں آپ کے ایک صحابی کی نظر گڑھے کی طرف گئی وہ آپ کو دیکھ کر خوشی میں بول پڑے: "رسول اللہ یہاں ہیں۔" آپ نے انگلی کے اشارے سے ان کو منع کیا کہ چپ رہو۔ دشمنوں کو میری یہاں موجودگی کا علم نہ ہونے دو۔ (فاشار الیہ الرسول ان اصمت، نور الیقین فی سیرۃ سید المرسلین، محمد الخضری، صفحہ ۱۳۰)

ایسے خوفناک حالات میں آپ کی زبان سے قریش کے بعض سرداروں (صفوان، سہیل، حارث) کے لئے بددعا کے الفاظ نکل گئے۔ آپ نے کہا: کیف یفلح قوم شجوا نبیھم (وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جو اپنے نبی کو زخمی کرے) آپ کی زبان سے اتنی بات بھی اللہ کو پسند نہیں آئی۔ اور جبریل خدا کی طرف سے یہ وحی لے کر آ گئے:

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ (آل عمران - ۱۲۸)

تم کو معاملہ کا کوئی اختیار نہیں۔ خدا یا ان کو توبہ کی توفیق دے گا یا ان کو عذاب دے گا۔ کیوں کہ وہ ظالم ہیں۔

خدا کی طرف سے اتنی تنبیہ کافی تھی۔ فوراً آپ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ آپ زخموں سے نڈھال ہیں۔ مگر ظالموں

کے حق میں ہدایت کی دعا فرمارہے ہیں۔ آپ کے ایک ساتھی عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ "اس وقت بھی گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے سامنے ہیں۔ آپ اپنی پیشانی سے خون پونچھتے جاتے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں :

رب اغفر لی قومی فانھم لا یعلمون — خدایا میری قوم کو معاف کردے۔ کیونکہ وہ نہیں جانتے

مسلم، غزوہ احد، جلد ۲، صفحہ ۱۰۸)

اوپر جو واقعات نقل ہوئے، وہ اس قسم کے ان بے شمار واقعات میں سے صرف چند ہیں جو حدیث اور سیرت کی کتابوں میں بھرے ہوئے ہیں۔ یہ واقعات بتاتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کی زندگی کس طرح انسانی کردار کا معیاری نمونہ تھی۔ یہ واقعات عمل کی زبان میں یہ سبق دیتے ہیں کہ انسان خدا کا بندہ ہے اور اس کو ہر حال میں خدا کا بندہ بن کر رہنا چاہیے خدا اور بندے کے درمیان تعلق کا تقاضا ہے کہ بندے کے دل میں ہر وقت خدا کا اور اس کی آخرت کا طوفان برپا رہے ساری کائنات اس کے لئے یاد الٰہی کا دسترخوان بن جائے۔ وہ ہر واقعہ کو خدا کی نظر سے دیکھے اور ہر چیز میں خدا کا نشان پائے۔ دنیا میں کوئی معاملہ کرتے وقت وہ کبھی یہ نہ بھولے کہ بالآخر سارا معاملہ خدا کے ہاتھ میں جانے والا ہے۔ جہنم کا خوف اس کو انسانوں سے تواضع اختیار کرنے پر مجبور کرے اور جنت کا شوق دنیا کو اس کی نظر میں بے حقیقت بنادے۔ خدا کی بڑائی کا خیال اس کے ذہن پر اس قدر چھا جائے کہ اپنی بڑائی کا کوئی بھی مظاہرہ اس کو مضحکہ خیز دکھائی دینے لگے۔ کوئی تنقید اس کو مشتعل نہ کرے اور کوئی تعریف اس کے ذہن کو بگاڑنے والی ثابت نہ ہو ——— یہ ہے انسانی کردار کا وہ نمونہ جو خدا کے رسول ؐ نے اپنے عمل سے ہمیں بتایا ہے۔

برتر اخلاقیات

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد ہوا ہے : انك لعلیٰ خُلُق عظیم (تم ایک اعلیٰ کردار پر ہو) امام عطیہ نے خُلُق عظیم کی تفسیر ادب عظیم سے کی ہے (تفسیر ابن کثیر) یہ بلند اخلاق اور اعلیٰ کردار کیا ہے، اس کی وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اقوال سے ہوتی ہے :

عن حذیفة قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا تکونوا اِمَّعَةً تقولون اِن اَحسَنَ النّاسُ اَحْسَنّا وَاِن اَساؤا ظَلَمنا ولکن وَطِّنوا انفسکم اِن احسنَ الناسُ اَن تُحسِنوا واِن اساؤا فلا تظلموا (مشکوٰۃ باب الظلم)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگ اِمّعہ نہ بنو، یہ کہنے لگو کہ لوگ اچھا سلوک کریں گے تو ہم بھی اچھا سلوک کریں گے۔ اور لوگ برا کریں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ ظلم کریں گے۔ بلکہ اپنے آپ کو اس کا خوگر بناؤ کہ لوگ اچھا سلوک کریں تب بھی تم اچھا سلوک کرو اور لوگ برا سلوک کریں تو تم ان کے ساتھ ظلم نہ کرو۔
قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم : صِل مَن قَطَعَكَ وَاعفُ عَمَّن ظلمك واحسن الیٰ من اَسَاءَ اِلیك	جو تم سے کٹے تم اس سے جُڑو۔ جو تم پر ظلم کرے تم اس کو معاف کر دو اور جو تمہارے ساتھ برا سلوک کرے تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

یہ اعلیٰ اخلاق جو حدیث میں بتایا گیا ہے اس اخلاق میں آپ بلند ترین مرتبہ پر تھے۔ عام مسلمانوں سے یہ اعلیٰ اخلاق عزیمت کے درجہ میں مطلوب ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ لازم تھا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے میرے رب نے حکم دیا ہے کہ جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں، جو مجھ کو نہ دے میں اسے دوں۔ جو مجھ پر ظلم کرے میں اسے معاف کر دوں (امرنی ربی بتسع ۔۔۔ وان اصل من قطعنی واعطی من حرمنی واعفو عمن ظلمنی)

اخلاق کی دو سطحیں ہیں۔ ایک معمولی سطح اور دوسری برتر سطح۔ اخلاق کی معمولی سطح یہ ہے کہ آدمی کا اخلاق جوابی اخلاق ہو "جو مجھ سے جیسا کرے گا میں بھی اس کے ساتھ ویسا ہی کروں گا"، یہ اس کا اصول ہو جو شخص اس سے کٹے وہ بھی اس سے کٹ جائے۔ جو شخص اس پر ظلم کرے وہ بھی اس پر ظلم کرنے لگے۔ جو شخص اس کے ساتھ برائی کرے وہ بھی اس کے لئے برا بن جائے۔

یہ عام اخلاق ہے۔ اس کے مقابلہ میں برتر اخلاق یہ ہے کہ آدمی دوسرے کے رویہ کی پروا کئے بغیر اپنا رویہ متعین کرے۔ اس کا اخلاق اصولی ہو نہ کہ جوابی۔ اعلیٰ اخلاقیات اس کا ایک عام اصول ہو جس کو وہ ہر جگہ برتے، خواہ معاملہ موافق کے ساتھ ہو یا مخالف کے ساتھ۔ وہ جُڑنے والا ہو حتیٰ کہ اس سے بھی جو اس سے

قطع تعلق کرے۔ وہ بہتر سلوک کرنے والا ہو حتیٰ کہ اس کے ساتھ بھی جو اس سے برا سلوک کرے۔ وہ نظرانداز کرنے والا ہو حتیٰ کہ اس سے بھی جو اس پر ظلم کرتا ہو۔

فرانس کے مشہور فلسفی والٹیر (۱۷۷۸-۱۶۹۴) نے کہا تھا کہ کوئی شخص اپنے قریبی لوگوں میں ہیرو نہیں ہوتا:

No one is a hero to his valet

کیوں کہ قریبی لوگوں کی نظر میں آدمی کی نجی زندگی ہوتی ہے اور نجی زندگی میں کوئی بھی کامل نہیں ہوتا۔ دور والوں کو ایک شخص جتنا اچھا معلوم ہوتا ہے، قریب کے لوگوں کو وہ اتنا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے قریبی لوگوں کے اندر اس کے بارے میں ہیرو کے جذبات پیدا نہیں ہوتے۔ مگر سورن اسمتھ نے لکھا ہے کہ یہ کلیہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق نہیں آتا، کیوں کہ تاریخ بتاتی ہے کہ جو شخص جتنا زیادہ آپ سے قریب تھا، اتنا ہی زیادہ وہ آپ کی خوبیوں کا شیدائی تھا۔

زید بن حارثہ رضؓ قبیلہ کلب کے ایک شخص حارثہ بن شراحیل کے لڑکے تھے۔ ان کی ماں سُعدی بنت ثعلبہ تھیں جو قبیلہ طے کی ایک شاخ بنی معن سے تعلق رکھتی تھیں۔ زید جب آٹھ سال کے تھے، اس وقت ان کی ماں ان کو لے کر اپنے میکے گئیں۔ وہاں بنی قین بن جسر کے لوگوں نے ان کے پڑاؤ پر حملہ کیا۔ وہ جو کچھ لوٹ کر لے گئے اس میں زید بھی تھے۔ اس کے بعد انھوں نے عکاظ کے میلے میں لے جا کر ان کو بیچ دیا۔ ان کو حکیم بن حزام نے خریدا جو حضرت خدیجہ رضؓ کے بھتیجے تھے۔ وہ اس بچہ کو مکہ لائے اور غلام کی حیثیت سے اپنی پھوپھی کو دے دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت خدیجہ سے ہوا تو حضرت خدیجہ نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دے دیا۔ اس وقت زید کی عمر ۱۵ سال تھی۔ کچھ عرصہ بعد زید رضؓ کے باپ اور چچا کو معلوم ہوا تو وہ مکہ آئے تاکہ اپنے بچے کو حاصل کر کے اپنے ساتھ لے جائیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور کہا کہ آپ جو فدیہ لینا چاہیں ہم دینے کے لئے تیار ہیں۔ آپ ہمارا بچہ ہم کو دے دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے کوئی فدیہ نہیں چاہئے۔ اگر لڑکا تمھارے ساتھ جانا چاہے تو تم اس کو لے جا سکتے ہو۔ آپؐ نے زید کو بلایا اور کہا ان کو پہچانتے ہو۔ انھوں نے کہا ہاں، یہ میرے باپ اور چچا ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: یہ لوگ تم کو لے جانا چاہتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو ان کے ساتھ اپنے گھر جا سکتے ہو۔ زید رضؓ نے جواب دیا: میں آپؐ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہ سن کر ان کے باپ اور چچا بگڑ گئے۔ انھوں نے کہا: تم آزادی کو چھوڑ کر غلامی کو پسند کرتے ہو اور اپنوں کو چھوڑ کر غیروں میں رہنا چاہتے ہو۔ زید نے کہا: میں نے محمدؐ کے اندر جو خوبیاں دیکھی ہیں اس کے بعد اب میں کسی کو بھی ان کے اوپر ترجیح نہیں دے سکتا۔ اس کے بعد زید کے باپ اور چچا اپنے وطن کو واپس چلے گئے ——— یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی خصوصیت کی طرف قرآن میں ان لفظوں میں اشارہ کیا گیا ہے:

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لانفضوا من حولك (آل عمران ۱۵۹)

یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان کے لئے نرم ہو۔ اگر تم درشت اور سخت دل ہوتے تو وہ تمھارے پاس سے منتشر ہو جاتے

پیغمبر اسلام کا یہی اعلیٰ کردار تھا جس نے آپ کے اندر تسخیری قوت پیدا کر دی۔ جو شخص بھی آپ سے قریب ہوا وہ آپ کی عظمتوں کو دیکھ کر مفتوح ہو کر رہ گیا۔

طائف کی وہ شام بھی کس قدر بھیانک تھی جب شہر کے لڑکے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو پتھر مار مار کر شہر سے باہر لے جا رہے تھے۔ آپ مکہ سے پچاس میل کا پیدل سفر طے کر کے حجاز کے رئیسوں کے گرمائی صدر مقام پہنچے تھے تاکہ انھیں دین اسلام کی دعوت دیں۔ مگر طائف کے رئیسوں نے آپ کے خیر خواہانہ پیغام کو سننے کے بجائے شہر کے لڑکوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔ یہ شریر لڑکے اس وقت تک آپ کا پیچھا کرتے رہے جب تک سورج نے غروب ہو کر آپ کے اور ان لڑکوں کے درمیان تاریکی کا پردہ نہ ڈال دیا۔ آپ کا جسم زخموں سے چور تھا۔ سر سے پاؤں تک آپ خون میں نہائے ہوئے تھے۔ اس وقت آپ نے تھک کر انگور کے ایک باغ میں پناہ لی۔ غور کیجئے۔ یہ کسی آدمی کے لئے کتنا نازک وقت ہوتا ہے۔ آپ نے خود ایک بار اپنی بیوی حضرت عائشہ رضؓ سے فرمایا کہ طائف کی یہ شام میری زندگی کی سخت ترین شام تھی۔ مگر آپ کی زبان سے اس انتہائی سنگین موقع پر اپنے دشمنوں کے خلاف کوئی برا کلمہ نہیں نکلا۔ بلکہ آپ نے فرمایا "خدایا ان کو صحیح راستہ دکھا، کیوں کہ وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں،" اللہ کے رسولؐ کا یہی اخلاق تھا جس نے آپ کے دشمنوں کو اس طرح زیر کیا کہ سارے عرب نے آپ کے پیغام کو قبول کر لیا۔ آپ کے اعلیٰ کردار کے آگے کوئی تعصب، کوئی عداوت اور کوئی ہٹ دھرمی ٹھہر نہ سکی۔ آپ کی بلند سیرت لوگوں کو جادو کی طرح مسخر کرتی چلی گئی۔

ایک بار آپ نے فرمایا: صلۂ رحمی یہ نہیں ہے کہ تم صلۂ رحم کرنے والوں کے ساتھ صلۂ رحم کرو۔ بلکہ صلۂ رحمی یہ ہے کہ جو قطع رحم کرے اس کے ساتھ تم صلہ رحم کرو (بخاری، کتاب الادب) تاریخ اسلام کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار اسلام کے کچھ دشمنوں نے حضرت عائشہ رضؓ پر بدکاری کی تہمت لگائی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ اور حضرت ابوبکر رضؓ کی صاحبزادی تھیں۔

یہ تہمت سراسر جھوٹ اور بے بنیاد تھی۔ اس فرضی داستان کو گھڑنے اور اس کو پھیلانے میں ایک شخص مسطح نام کا بھی شریک تھا۔ یہ شخص حضرت ابوبکر رضؓ کا رشتہ دار تھا۔ اس کو ضرورت مند سمجھ کر حضرت ابوبکر رضؓ اس کو ماہانہ کچھ رقم دیا کرتے تھے۔ جب حضرت ابوبکر رضؓ کو معلوم ہوا کہ ان کی معصوم صاحبزادی پر جھوٹی تہمت لگانے میں مسطح بھی شریک رہا ہے تو انھوں نے مسطح کی امدادی رقم بند کر دی۔ اس پر اللہ کے رسول ﷺ کے پاس یہ وحی آئی کہ اگر کوئی شخص معاشی اعتبار سے ضرورت مند ہے تو اس کے اخلاقی جرم کی وجہ سے اس کی مالی امداد بند نہ کرو، بلکہ اس کے جرم سے درگزر کرتے ہوئے اس کی معاشی امداد کو جاری رکھو۔

قرآن میں کہا گیا کہ تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور کشائش والے ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ اپنے رشتہ داروں، محتاجوں اور اللہ کی راہ میں وطن چھوڑنے والوں کی مدد نہ کریں گے۔ ان کو معاف کر دینا چاہئے اور درگزر کرنا چاہئے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کر دے اور اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے (نور ۲۲) حضرت ابوبکرؓ ہی کا واقعہ ہے کہ ایک بار وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے آکر آپ کو برا بھلا کہا۔ حضرت ابوبکرؓ پہلی بار سن کر چپ رہے۔ اس نے دوسری بار برا بھلا کہا تو اس وقت بھی آپ چپ رہے۔ مگر جب اس نے تیسری بار بدزبانی کی تو آپ خاموش نہ رہ سکے اور جواب میں بول اٹھے۔ یہ دیکھ کر رسول اللہؐ فوراً وہاں سے اٹھ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا: اے خدا کے رسول آپ کیوں اٹھ گئے۔ آپ نے کہا: ابوبکر! جب تک تم چپ تھے، خدا کا فرشتہ تمھاری طرف سے جواب دے رہا تھا، جب تم خود بول پڑے تو فرشتہ وہاں سے چلا گیا (سنن ابی داؤد، کتاب الادب) اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ برائی کے جواب میں جب آدمی اپنی طرف سے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کرتا تو وہاں خدا اس کی طرف سے انتقام لینے کے لئے موجود ہوتا ہے۔ مگر جب آدمی خود انتقام لینے پر اتر آئے تو خدا اس کے معاملہ کو اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ خدا سے بہتر انتقام لے سکے۔

حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی عالم سے کچھ اشرفیاں قرض لیں۔ کچھ دن گزر گئے تو وہ یہودی تقاضے کے لئے پہنچا۔ آپ نے فرمایا کہ " اس وقت میرے پاس تمھارا قرض ادا کرنے کے لئے کچھ نہیں ہے " یہودی نے کہا " جب تک تم میرا قرض ادا نہ کرو گے میں تم کو نہیں چھوڑوں گا " چنانچہ ظہر کے وقت سے لے کر رات تک وہ آپ کو گھیرے میں لئے ہوئے بیٹھا رہا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب کہ مدینہ میں آپ کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ آپ اس کے خلاف کارروائی کرنے کی طاقت رکھتے تھے۔ چنانچہ آپ کے ساتھیوں نے اس کو ڈانٹ کر بھگانا چاہا۔ مگر آپ نے سب کو منع کر دیا۔ کسی نے کہا: " اے خدا کے رسول، ایک یہودی آپ کو قید کئے ہوئے ہے "۔ آپ نے کہا کہ ہاں، مگر مجھ کو ظلم کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اسی حال میں صبح ہو گئی۔ جب اگلا دن شروع ہوا تو یہودی کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ یہ دیکھ کر بہت متاثر ہوا کہ آپ قدرت رکھتے ہوئے بھی برداشت کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مسلمان ہو گیا۔ یہ یہودی مدینہ کا ایک مالدار آدمی تھا۔ کل تک اس نے چند اشرفیوں کے لئے آپ کا گھراؤ کر رکھا تھا۔ مگر آپ کے اعلیٰ کردار نے اس پر اتنا اثر کیا کہ اس نے اپنی ساری دولت آپ کی خدمت میں پیش کر دی اور کہا کہ آپ اس کو جس طرح چاہیں خرچ کریں (بیہقی) عبداللہ بن ابی الحسماء بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار میں نے خرید و فروخت کا ایک معاملہ کیا۔ ابھی معاملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ مجھے کچھ ضرورت پیش آگئی۔ میں نے کہا کہ آپ ٹھہرئے۔ میں گھر سے واپس آتا ہوں تو بقیہ معاملہ کو مکمل کروں گا۔ گھر پہنچنے کے بعد میں بعض کاموں میں ایسا مشغول ہوا کہ اپنا وعدہ بھول گیا۔ تین دن کے بعد یاد آیا تو میں اس مقام پر پہنچا۔ دیکھا کہ وہاں رسول اللہؐ موجود ہیں۔ آپ نے مجھ کو دیکھنے کے بعد صرف اتنا کہا: تم نے مجھ کو بہت تکلیف دی۔ میں تین دن سے یہاں تمھارا انتظار کر رہا ہوں (ابوداؤد) اس طرح کا عمل اپنے اندر اتنی کشش رکھتا ہے کہ انتہائی کٹر آدمی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

حضرت عائشہ رض بتاتی ہیں کہ یہودی عالموں کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی۔ جب وہ لوگ آپ کے پاس پہنچے تو انھوں نے کہا: السام علیکم (تباہی ہو تم پر) حضرت عائشہ نے سنا تو ان سے برداشت نہ ہوسکا، انھوں نے کہا " بلکہ تم لوگ غارت ہو جاؤ اور تم پر خدا کی لعنت ہو" آپ نے حضرت عائشہ کو اس قسم کے جواب سے منع فرمایا اور کہا: " خدا مہربان ہے اور وہ ہر کام میں مہربانی کو پسند کرتا ہے" حقیقت یہ ہے کہ مخالف کا دل جیتنے کے لئے اس سے بڑا کوئی حربہ نہیں ہوسکتا کہ اس کی بدزبانی کا جواب نرم باتوں سے دیا جائے۔ ہتھیار کے حملہ کی تاب لانا تو ممکن ہے مگر کردار کے حملہ کے مقابلہ میں کوئی ٹھہر نہیں سکتا۔ یہاں ہر شخص کو اپنی ہار ماننی پڑتی ہے۔

براء بن عازبؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے موقع پر تین شرطوں کے ساتھ قریش سے معاہدہ کیا تھا۔ ان میں سے ایک شرط یہ تھی کہ کوئی غیر مسلم اسلام قبول کرکے مسلمانوں کے یہاں چلا جائے تو مسلمان اس کو واپس کردیں گے۔ مگر جو مسلمان قریش کے پاس پہنچ جائے اس کو قریش واپس نہیں کریں گے۔ یہ معاہدہ ہو رہا تھا کہ ایک مسلم نوجوان ابو جندل مکہ سے بھاگ کر حدیبیہ پہنچے۔ ان کو ان کے گھر والوں نے اسلام کے جرم میں قید کر رکھا تھا۔ وہ بیڑیاں پہنے ہوئے اس حال میں حدیبیہ پہنچے کہ ان کا جسم بیڑیوں کی رگڑ سے زخمی ہو رہا تھا۔ وہ فریاد کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ مجھ کو دشمنوں کے چنگل سے بچاؤ۔ یہ بے حد نازک وقت تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں نے تلواریں نکال لیں۔ ابو جندل کے جذباتی واقعہ کو دیکھنے کے بعد لوگوں کا رجحان ہوگیا کہ معاہدہ کو توڑ کر ابو جندل کی زندگی کو بچایا جائے دوسری طرف مکہ والوں نے کہا: " محمد! ہمارے اور تمھارے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے، یہ اس کی تکمیل کا پہلا موقع ہے"۔ بالآخر اللہ کے رسول نے فیصلہ کیا کہ جو معاہدہ طے ہو چکا ہے اب اس سے ہم پھر نہیں سکتے۔ آپ کے ساتھیوں کے لئے یہ بات بے حد تکلیف کی تھی۔ مگر آپ نے ابو جندل کو دوبارہ مکہ والوں کے حوالے کر دیا (صحیحین) بظاہر اس واقعہ کے معنی یہ تھے کہ مظلوم کو دوبارہ ظالم کے چنگل میں دے دیا جائے۔ مگر اس واقعہ میں اصول پسندی کا جو شاندار عملی مظاہرہ ہوا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ظالم اندر سے بالکل ڈھ گئے۔ اب ان کا ابو جندل کو لے جانا اور اپنے یہاں ان کو قید میں رکھنا محض ایک عام واقعہ نہ رہا بلکہ ان کی طرف سے اخلاقی گراوٹ اور اسلام کے لئے اخلاقی بلندی کی ایک مثال بن گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ کے لوگ اسلام کی اخلاقی برتری سے مرعوب ہوگئے۔ وہاں کثرت سے لوگ مسلمان ہونے لگے۔ ابو جندل کا وجود مکہ میں اسلام کی زندہ تبلیغ بن گیا۔ حتیٰ کہ قید و بند کی حالت میں بھی ابو جندل ان کو اپنی قومی زندگی کے لئے خطرہ معلوم ہونے لگے۔ چنانچہ انھوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ ان کو رہا کرکے مکہ کے باہر بھیج دیا جائے۔

حضرت ابوہریرہ رض مدنی زندگی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجد کے لوگوں کی طرف چند سوار بھیجے جو آپ کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ وہ شہر یمامہ کے حاکم ثمامہ بن اثال کو راستہ میں پاگئے اور اس کو گرفتار کر لائے۔ مدینہ پہنچ کر انھوں نے اس کو مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا۔ رسول اللہ اس کے پاس آئے اور حال پوچھا۔ ثمامہ نے جواب دیا: " اگر تم نے مجھ کو قتل کر دیا تو میری قوم تم سے میرے خون کا بدلہ لے گی۔ اور اگر تم مجھ کو چھوڑ دوگے تو میں عمر بھر تمھارا احسان مانوں گا اور اگر مال کی خواہش ہے تو جتنا مال چاہو میں دینے کے لئے تیار ہوں"۔ رسول اللہ صنے اس

کی رہائی کا حکم دے دیا۔ یہ واقعہ اس وقت کی دنیا میں بہت عجیب تھا۔ کیوں کہ قبائلی زندگی میں کسی دشمن کے ہاتھ آجانے کے بعد اس کا ایک ہی انجام تھا۔ اور وہ یہ کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ رسول اللہ نے اس کے جسم کو تو قتل نہیں کیا مگر اپنے اخلاقی سلوک سے اس کی روح کو قتل کر دیا۔ چنانچہ قید سے چھوٹنے کے بعد ثمامہ قریب کے ایک باغ میں گیا اور غسل کر کے دوبارہ مسجد میں آیا۔ لوگ حیران تھے کہ وہ دوبارہ کس لئے یہاں آیا ہے۔ مگر جب اس نے بلند آواز سے کلمہ شہادت ادا کر کے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا تو معلوم ہوا کہ رسول اللہ ؐ نے اس کو چھوڑ کر دراصل ہمیشہ کے لئے اس کو گرفتار کر لیا تھا۔ اس کے بعد ثمامہ عمرہ کرنے کے لئے مکہ گیا۔ جب وہ حرم میں پہنچا اور وہاں کے لوگوں کو ثمامہ کے اسلام کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے کہا "تم بے دین ہو گئے"۔ ثمامہ نے جواب دیا کہ میں بے دین نہیں ہوا بلکہ میں نے خدا کے رسول کے دین کو اختیار کر لیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ثمامہ اسلام کی قوت کا ذریعہ بن گیا۔ اس زمانہ میں مکہ کے لوگوں کو باہر کے جن مقامات سے گندم فراہم ہوتی تھی ان میں یمامہ ایک خاص مقام تھا۔ چنانچہ ثمامہ نے مکہ والوں سے کہا کہ سن لو، محمد ؐ کی اجازت کے بغیر اب گندم کا ایک دانہ بھی تمھارے یہاں نہیں آئے گا (صحیح مسلم) ——— کردار بظاہر ایک بے قیمت چیز ہے مگر اس کو دے کر آدمی ہر چیز خرید لیتا ہے۔

اخلاق کی بلندی یہ ہے کہ کہنے والا جو کچھ کہے اس پر وہ خود عمل کرتا ہو۔ کمزوروں کے ساتھ بھی وہ رعایت و شرافت کا وہی طریقہ اختیار کرے جو کوئی شخص طاقت ور کے ساتھ کرتا ہے۔ اپنے لئے اس کے پاس جو معیار ہو وہی معیار دوسروں کے لئے بھی ہو۔ مشکل حالات میں بھی وہ اپنے اصولوں سے نہ ہٹے۔ حتیٰ کہ دوسروں کی طرف سے پست کردار کا مظاہرہ ہو تب بھی وہ اعلیٰ کردار پر قائم رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس اعتبار سے اخلاق کے کمال درجہ پر تھے۔ آپ نے کبھی اعلیٰ اخلاق کو نہیں چھوڑا۔ کوئی مصلحت یا کوئی اختلاف آپ کو اخلاق سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آپ کے انتہائی قریبی ساتھیوں نے اس معاملہ میں جو گواہی دی ہے اس سے بڑی اور کوئی گواہی نہیں ہو سکتی۔

سعید بن ہشام تابعی نے آپ کی زوجہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ ؐ کا اخلاق کیسا تھا۔ انھوں نے جواب دیا: آپ کا اخلاق تو قرآن تھا۔ گویا قرآن کی صورت میں مطلوب زندگی کا جو نقشہ آپ نے دوسروں کے سامنے پیش کیا خود آپ اسی نقشہ میں ڈھل گئے۔ انس بن مالک رضؓ کہتے ہیں کہ میں نے دس سال تک رسول اللہ ؐ کی خدمت کی مگر کبھی آپ نے اف تک نہ کیا اور نہ کبھی میرے کسی کام کی بابت آپ نے کہا کہ تم نے ایسا کیوں کیا اور جو کام میں نے نہیں کیا اس کی بابت بھی آپ نے کبھی یہ نہ کہا کہ تم نے اس کو کیوں نہیں کیا۔ وہ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ اچھے اخلاق والے تھے (صحیحین) امام احمد نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی خادم کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا نہ کسی عورت کو مارا اور نہ کسی دوسرے کو اپنے ہاتھ سے مارا۔ البتہ آپ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے تھے۔ جب بھی آپ کو دو چیزوں میں سے کسی ایک چیز کو لینے کا اختیار دیا گیا تو آپ نے آسان کو اختیار فرمایا، الّا یہ کہ وہ گناہ ہو۔ جو چیز گناہ ہوتی اس سے آپ تمام لوگوں سے زیادہ دور رہنے والے تھے۔ آپ کو خواہ کوئی بھی تکلیف پہنچائی گئی ہو کبھی آپ نے اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہیں لیا، الا یہ کہ اللہ کی حرمتوں کو توڑا گیا ہو اور آپ نے اللہ کی خاطر اس کا بدلہ لیا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی کردار تھا جس نے آپ کو دشمنوں کی نظر میں بھی قابل عزت بنا دیا۔ جن لوگوں نے آپ کا ساتھ دیا وہ ہر طرح کی مصیبت اور نقصان کے باوجود آپ کے ساتھ جڑے رہے۔ اپنی مظلومی کے دور میں بھی آپ لوگوں کی نظر میں اتنے ہی محبوب تھے جتنا فتح وغلبہ کے دور میں۔ آپ کو دور سے دیکھنے والوں نے آپ کو جیسا پایا ویسا ہی ان لوگوں نے بھی پایا جو آپ کو قریب سے دیکھ رہے تھے۔ آپ کا کردار ایسا نمونہ بن گیا جیسا نمونہ تاریخ میں دوسرا نہیں پایا جاتا۔

آپ کا اعلیٰ کردار آپ کی یا اصول زندگی کا ایک مستقل جزء تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان افراد کے ساتھ بھی بدستور باقی رہتا تھا جن سے آپ کو شکایت یا تکلیف پہنچی ہو۔

کعبہ کی دربانی (حجابہ) جاہلیت کے زمانہ میں بھی نہایت عزت کی چیز سمجھی جاتی تھی۔ یہ دربانی قدیم ترین زمانہ سے ایک خاص خاندان میں چلی آرہی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس خاندان کے ایک فرد عثمان بن طلحہ کعبہ کے دربان تھے۔ انھیں کے پاس کعبہ کی کنجیاں رہتی تھیں۔

بخاری نے روایت کیا ہے کہ ہجرت سے پہلے ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ کعبہ کے اندر داخل ہو کر عبادت کریں۔ آپ نے عثمان بن طلحہ سے کنجی مانگی تاکہ اس کا دروازہ کھول سکیں۔ مگر عثمان بن طلحہ نے انکار کیا اور آپ کو برا بھلا کہا۔ آپ نے فرمایا: اے عثمان، کسی دن تم دیکھو گے کہ یہ کنجی میرے ہاتھ میں ہو گی۔ مجھے اختیار ہو گا کہ میں جس کو چاہوں اسے دوں۔ یہ سن کر عثمان بن طلحہ نے کہا:

لقد هلكت قريش يومئذ وذلت — وہ دن قریش کی تباہی اور رسوائی کا دن ہو گا

آپ نے فرمایا: نہیں، اس دن وہ آباد اور باعزت ہوں گے۔

اس کے بعد وہ وقت آیا کہ مکہ فتح ہوا اور تمام اختیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں آگیا۔ آپ مکہ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے بیت اللہ گئے۔ آپ نے کعبہ کا سات بار طواف کیا۔ اس کے بعد آپ نے عثمان بن طلحہ کو بلوایا۔ ایک روایت کے مطابق وہ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی زمانہ میں مسلمان ہو چکے تھے۔ آپ نے ان سے کنجی لی اور دروازہ کھول کر کعبہ کے اندر داخل ہوئے۔ آپ کچھ دیر اس کے اندر رہے اور وہاں جو بت تھا اس کو اپنے ہاتھ سے توڑ دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے باہر نکلے تو آپ کے ہاتھ میں اس کی کنجی تھی اور آپ یہ آیت پڑھ رہے تھے: ان الله يأمركم ان تؤدوا الامانات الى اهلها (اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں اہل امانت کے سپرد کر دو) اس وقت آپ کے چچا زاد بھائی اور داماد حضرت علی کھڑے ہو گئے اور کہا: یا رسول اللہ اجمع لنا الحجابة مع السقاية صلى الله عليك۔ یعنی اللہ کی رحمت آپ پر ہو، ہم بنو ہاشم کو پہلے سے زائرین کعبہ کو پانی پلانے کی خدمت حاصل ہے۔ اب کعبہ کی کلید برداری بھی ہمیں کو دے دیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے حضرت علی کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آپ نے فرمایا: عثمان بن طلحہ کہاں ہیں۔ ان کو بلایا گیا۔ آپ نے کعبہ کی کنجی ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا:

هاك مفتاحك يا عثمان، اليوم يوم بر و وفاء۔ خذوها خالدة تالدة، لا ينزعها منكم الا ظالم (زاد المعاد، جلد اول)

اے عثمان، اپنی کنجی لو۔ آج وفا اور سلوک کا دن ہے۔ اس کو لو۔ یہ تمہارے خاندان میں ہمیشہ موروثی طور پر رہے گی۔ ظالم کے سوا کوئی بھی تم سے اس کو نہیں چھینے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ حقوق کی ادائگی اور امانتوں کی واپسی کے معاملہ میں مسلمانوں کو اتنا زیادہ پابند ہونا چاہئے کہ صاحب حق کی طرف سے تلخی کا مظاہرہ ہو تب بھی جس کا جو حق ہے اس کو اس کا حق پورا پورا ادا کیا جائے۔ ادائگی حقوق سے کسی حال میں بھی تجاوز نہ کیا جائے خواہ وہ اپنی طبیعت کے کتنا ہی خلاف ہو۔

دنیا پرست لوگوں کا یہ طریقہ ہے کہ جب ان کو کسی قسم کا اقتدار ملتا ہے تو سب سے پہلے وہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے سابق مخالفین کو سزا دیں اور ان کو ان کے منصب سے ہٹا کر اپنے عقیدت مندوں کو تمام مناصب پر بٹھا دیں۔ ہر صاحب اقتدار موافق اور مخالف کی اصطلاحوں میں سوچتا ہے۔ موافقین کو اٹھانا اور مخالفین کو کچلنا اس کی پالیسی کا سب سے اہم جزء ہوتا ہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں اقتدار حاصل ہوا تو آپ نے اس کے بالکل برعکس معاملہ کیا۔ آپ نے معاملات کو "موافق" اور "مخالف" کے اعتبار سے نہیں دیکھا بلکہ حق پسندی اور امانت داری کے لحاظ سے دیکھا۔ اور تمام شکایتی باتوں کو نظر انداز کر کے ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو رحمت اور عدل کا تقاضا تھا۔

اسباق سیرت

قرآن میں اہلِ ایمان کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے :

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الآخر و ذکر اللہ کثیرا (الاحزاب ۲۱)

تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لئے جو اللہ کا اور آخرت کے دن کا امیدوار ہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہر انسان کے لئے مکمل نمونہ ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ یہ نمونہ صرف اس شخص کے لئے ہے جو اللہ کو بہت زیادہ یاد کرنے والا ہو، جو اللہ اور آخرت کا امیدوار بن چکا ہو۔

گویا رسول کی زندگی کا نمونہ، پوری طرح موجود ہونے کے باوجود، اپنے آپ ہر آدمی کے لئے نمونہ نہیں بن جائے گا۔ وہ صرف اس بندۂ خدا کے لئے نمونہ بنے گا جس نے اللہ کو اتنی گہرائی کے ساتھ پایا ہو کہ وہ اس کی یادوں میں سما جائے۔ اللہ جس کی تمناؤں کا سرمایہ بن چکا ہو۔ جس کا حال یہ ہو کہ وہ اللہ کے عذاب سے ڈرنے لگے اور آخرت کا انعام جس کی نظر میں اتنا اہم بن جائے کہ وہ دل وجان سے اس کا آرزومند ہو۔

رسول کے اسوۂ حسنہ کو پانے کے لئے یہ شرط کیوں لگائی گئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی حقیقت کے ادراک کے لئے اس کے بارے میں سنجیدہ ہونا شرط لازم ہے۔ خدا اور آخرت سے مذکورہ قسم کا تعلق ہونا آدمی کو خدا اور آخرت کی باتوں میں سنجیدہ بناتا ہے۔ یہی سنجیدگی اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کو صحیح نظر سے دیکھے اور اس سے مطلوبہ سبق لے سکے۔

اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے ایک مثال لیجئے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

من قتل دون مالہ فھو شھید۔ ومن قتل دون دمہ فھو شھید ومن قتل دون دینہ

جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔ جو شخص اپنے خون کی حفاظت میں مارا جائے

فهو شهید۔ ومن قتل دون اهلہ فهو شهید (ترمذی، نسائی، ابوداؤد) | وہ شہید ہے۔ جو شخص اپنے دین کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔ جو شخص اپنے گھر والوں کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔

جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے، یہ حدیث "لڑنے" کے بارے میں نہیں ہے بلکہ "مارے جانے" کی صورت میں مومن کے انجام کو بتانے سے متعلق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ نہیں ہے کہ جب بھی کہیں کوئی مال یا خون یا دین یا اہل وعیال کا مسئلہ پیش آئے، تم فوراً لڑ جاؤ، خواہ اس کے نتیجہ میں یہی کیوں نہ ہو کہ تم قتل کر دئے جاؤ۔ بلکہ اصل مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی ایسا ہو کہ مذکورہ اسباب سے کوئی شخص مومن کو قتل کر دے تو اس کا قتل قتل نہیں بلکہ شہادت ہوگا۔ گویا یہ حدیث اصلاً لڑائی پر اکسانے کے لئے نہیں ہے بلکہ قتل کر دئے جانے کی صورت میں شہادت کا درجہ پانے سے متعلق ہے۔

اب جو شخص دین کے بارے میں سنجیدہ نہ ہو، جس کو اپنے ذاتی ذوق کے لئے رسول اللہ کا جواز مطلوب ہو وہ بس حدیث کے الفاظ کو لے لے گا اور اپنے نفسانی جھگڑوں اور قومی لڑائیوں کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے اس کو بطور دلیل پیش کرے گا۔ وہ کہے گا کہ اسلام آدمی کو مردانگی کی تعلیم دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ اپنے دین وایمان، جان ومال، زمین وجائداد، بیوی بچوں اور خویش واقارب کی حفاظت کے لئے لڑ جاؤ۔ اگر تم جیت گئے تو تم نے اپنا مقصد پالیا۔ اگر تم ہار گئے تو تم شہید ہوئے۔ اور شہادت وہ رتبہ بلند ہے جو خوش قسمت انسانوں ہی کو ملتا ہے۔

مگر جو آدمی اللہ سے ڈرتا ہو وہ اس کو نہایت سنجیدہ ہو کر دیکھے گا۔ اس کی سنجیدگی اس کو اس سوال تک پہنچائے گی کہ جب مال اور خون اور دین اور خاندان کے دفاع میں لڑنا مرنا مطلوب ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس قسم کی برعکس مثالیں کیوں ہیں کہ آپ بہت سے مواقع پر صریح ظلم کے باوجود صبر کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی صبر کی تلقین کرتے ہیں۔

۱۔ مثال کے طور پر ابن ہشام نے ابوعثمان النہدی کے حوالہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے:

بلغنی ان صهیباً حین اراد الهجرة قال لہ کفار قریش اتیتنا صعلوکاً حقیراً فکثر مالک عندنا وبلغت الذی بلغت ثم ترید ان تخرج بمالک ونفسک، واللہ لا یکون ذلک۔ فقال | مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت صہیب نے جب مکہ سے ہجرت کا ارادہ کیا تو کفار قریش نے ان سے کہا کہ تم ہمارے یہاں آئے تو بالکل غریب تھے۔ پھر تمہارے پاس یہاں بہت مال ہو گیا اور تم اس درجہ کو

فهم صهيب ارأيتم ان جعلتُ لكم مالي اتخلون سبيلي۔ قالوا نعم۔ قال فاني جعلت لكم مالي ۔ قال فبلغ ذلك رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال ربحَ صُهيب ربحَ صهيب۔
(سیرۃ النبی لابن ہشام، الجزء الثانی، صفحہ ۸۹)

پہنچے جس درجہ میں تم اب ہو۔ تم چاہتے ہو کہ اپنے جان و مال کے ساتھ یہاں سے چلے جاؤ تو خدا کی قسم ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ حضرت صہیب نے ان سے کہا، اگر میں اپنا مال تمھارے حوالے کر دوں تو تم مجھ کو جانے دوگے۔ انھوں نے کہا، ہاں۔ حضرت صہیب نے کہا پھر میں نے اپنا مال تمھارے حوالے کیا۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ نے فرمایا: صہیب کی تجارت کامیاب رہی، صہیب کی تجارت کامیاب رہی۔

مذکورہ حدیث میں مال کے مقابلہ میں لڑکر جان دینا اگر مطلق معنوں میں ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چاہئے تھا کہ حضرت صہیب کو ناکامی کا الزام دیں نہ کہ انھیں کامیابی کا کریڈٹ عطا فرمائیں۔

۲۔ ہجرت کے چھٹے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کے ارادہ سے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو قریش نے آگے بڑھ کر روکا۔ اس موقع پر فریقین کے درمیان صلح کی گفت و شنید ہو رہی تھی کہ وہاں ابوجندل بن سہیل آگئے۔ انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اس کی وجہ سے مکہ والے ان کو سخت تکلیفیں دے رہے تھے اور ان کے پیروں میں لوہے کی زنجیریں ڈال دی تھیں۔ انھوں نے جب سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب حدیبیہ میں ہیں تو وہ کسی طرح بھاگ کر مکہ سے حدیبیہ پہنچے۔ اس وقت بھی ان کے پیروں میں بیڑیاں تھیں اور ان کا جسم خون آلود ہو رہا تھا۔ ان کو دیکھ کر قریش کے سردار سہیل بن عمرو (ابوجندل کے والد) نے کہا کہ ابوجندل کو ہمیں واپس کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے بہت چاہا کہ انھیں دوبارہ مکہ نہ بھیجا جائے۔ مگر سہیل بن عمرو نے کہا کہ اگر آپ نے ابوجندل کو ہمارے حوالے نہ کیا تو ہم آپ سے کسی طرح کی کوئی صلح نہیں کریں گے۔

یہ بڑا جذباتی لمحہ تھا۔ ابوجندل بیڑیوں میں خون آلود سامنے کھڑے تھے۔ انھوں نے کہا: اے مسلمانو، کیا میں مشرکین کی طرف لوٹا دیا جاؤں گا، حالانکہ میں اسلام قبول کر چکا ہوں۔ کیا تم لوگ دیکھتے نہیں کہ ان لوگوں نے مجھے کس قدر عذاب پہنچایا ہے۔ اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مکہ کی طرف لوٹا دیا اور ان سے کہا:

یا ابا جندل اصبر واحتسب فان اللہ جاعل لک ولمن معک من المستضعفین فرجا ومخرجا	اے ابوجندل، صبر کرو، اللہ تمہارے لئے اور دوسرے کمزور مسلمانوں کے لئے گنجائش پیدا کرے گا۔

(سیرۃ النبی لابن ہشام۔ الجزء الثالث، صفحہ ۳۶۷)

مذکورہ حدیث میں لڑنا اور شہید ہوجانا اگر مطلق معنوں میں ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر حضرت ابوجندل کو صبر و رضا کی نصیحت نہ فرماتے۔ بلکہ انھیں شہادت کا راستہ بتاتے اور خود بھی اپنے اصحاب سمیت قریش سے لڑ جاتے۔

۳۔ اسی حدیبیہ کا واقعہ ہے کہ قریش نے آپ کو روکا اور کہا کہ ہم اس سال آپ کو عمرہ کے لئے مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ آپ اس پر راضی ہو کر واپس مدینہ چلے آئے۔ اور عمرہ کے لئے مکہ جانے پر اصرار نہیں کیا۔ حالانکہ یہ خالص دینی معاملہ تھا اور آپ خدائی بشارت کی بنیاد پر اپنے اصحاب کو لے کر زیارت حرم کے لئے جا رہے تھے۔ اگر مذکورہ حدیث میں دین کے لئے لڑ کر شہید ہونا مطلق معنوں میں ہو تو آپ کو چاہئے تھا کہ اسی سال عمرہ کرنے کے لئے اصرار کریں، خواہ اس کے نتیجہ میں عمرہ ملے یا شہادت۔

۴۔ مکہ میں عمار بن یاسر اور ان کے والدین بنو مخزوم کے غلام تھے۔ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر اسلام میں داخل ہوگئے۔ بنو مخزوم کو ان کا اسلام لانا سخت ناپسند تھا۔ چنانچہ وہ ان کو عین دوپہر کے وقت صحرا میں لے جاتے اور تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر انھیں سخت عذاب دیتے۔ حتیٰ کہ عمار کی والدہ کو انھوں نے قتل کر دیا۔ ابن ہشام اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فیمر بھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیقول فیما بلغنی: صبرًا آل یاسر موعدکم الجنۃ (الجزء الاول صفحہ ۳۴۲)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرتے اور جیسا کہ مجھے روایت پہنچی ہے ان سے کہتے: اے خاندان یاسر، صبر کرو، تمہارے لئے جنت کا وعدہ ہے۔

مذکورہ حدیث اگر مطلق معنوں میں ہو تو ایسا کہنا، نعوذ باللہ، بزدلی کی تعلیم دینا ہوگا۔ پھر تو آپ کو آل یاسر سے کہنا چاہئے تھا کہ تم لوگ لڑ کر شہید ہو جاؤ اور خود بھی اس مقدس جنگ میں ان کے ساتھ شریک ہو جاتے۔ خواہ آل یاسر کو بچا سکیں یا اسی راہ میں شہادت کا درجہ حاصل کر لیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسوۂ رسول ان چیزوں میں سے ہے جن کی ایک سے زیادہ تعبیر ممکن ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسوۂ رسول کے معاملہ میں آدمی ہمیشہ صحیح تعبیر اور غلط تعبیر کے درمیان رہتا ہے۔ اور جو چیز کسی کو غلط تعبیر سے بچاتی ہے وہ صرف ایک ہے۔ یہ کہ خوف خدا نے آدمی کو حقیقت پسندی کی اُس سطح پر پہنچا رکھا ہو جس کو سنجیدگی کہا جاتا ہے۔

آدمی اگر فی الواقع سنجیدہ ہو تو اس کی سنجیدگی اس کو اسوۂ رسول کے بارے میں مذکورہ سوالات سے دوچار کرے گی۔ اس کو چونکہ صرف مفید مطلب بات نہیں لینی تھی بلکہ یہ معلوم کرنا تھا کہ حقیقی طور پر اسوۂ نبوت کیا ہے۔ اس کا یہ ذہن اس کو غلط تعبیر سے بچائے گا۔ وہ بے آمیز ذہن کے تحت اس مسئلہ پر غور کرے گا اور خدا کی توفیق سے بات کی تہ تک پہنچ جائے گا۔ اب اس کو معلوم ہوگا کہ اس کا راز ہے —— بڑے فائدہ کی خاطر چھوٹے نقصان کو برداشت کرنا۔

اہل ایمان کے لئے سب سے اہم چیز دعوتی مصلحت ہے نہ کہ شخصی مصلحت۔ اگر دعوتی مصلحت اور شخصی مصلحت میں ٹکراؤ ہو تو شخصی مصلحت کو قربان کر کے دعوتی مصلحت کو حاصل کیا جائے گا۔ مذکورہ واقعات میں رسول کی طرف سے صبر کی تلقین کی وجہ یہی دعوتی مصلحت ہے۔ دعوتی کام کو مؤثر طور پر جاری رکھنے کے لئے خدا کے رسول نے جان، مال اور خاندان کی قربانیاں برداشت کیں۔ حتیٰ کہ دشمنوں کی طرف سے "دین میں مداخلت" کو بھی وقتی طور پر گوارا کر لیا۔ تاکہ دعوت کا کام جاری رہے جو اہل ایمان کے لئے ہر قسم کی کامیابیوں کا واحد ذریعہ ہے۔

جب آدمی کے سامنے کوئی مقصد ہو تو وہ مقصد کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ وہ دوسرے تمام نقصانات کو نظر انداز کرتا رہتا ہے تاکہ اصل مقصد ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ اور جب کوئی مقصد سامنے نہ رہے تو وہ ہر چیز میں الجھتا ہے۔ وہ ہر بات کے لئے دوسروں سے لڑتا ہے۔ خواہ اس کے نتیجہ میں یہی کیوں نہ ہو کہ چھوٹے نقصان کو برداشت نہ کرنے کی بنا پر اس کو زیادہ بڑا نقصان برداشت کرنا پڑے —— داعی اس دنیا کا سب سے زیادہ بامقصد انسان ہے، اس لئے وہ ہمیشہ پہلے رویہ کو اختیار کرتا ہے نہ کہ دوسرے رویہ کو۔ اس کلیہ سے مستثنیٰ صرف وہ امور ہیں جب کہ معاملہ خالص دفاعی ہو، اس کا دعوتی مقصد سے کوئی تعلق نہ ہو۔

اس تمہید کے بعد یہاں ہم مختلف پہلوؤں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ واقعات نقل کرتے ہیں جن میں ہماری زندگی کے لئے زبردست سبق اور نصیحت موجود ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آغاز نبوت کا ذکر کرتے ہوئے ابن ہشام لکھتے ہیں: اللہ نے جب ارادہ کیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے منصب پر مقرر کرے تو آپ کا یہ حال ہوا کہ جب آپ اپنی کسی ضرورت کے لئے بستی سے نکلتے تو بہت دور چلے جاتے، یہاں تک کہ مکانات نظر نہ آتے۔ آپ مکہ کی پہاڑیوں اور وادیوں میں کھو جاتے۔ ابن ہشام نے عبداللہ بن زبیر کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال میں ایک مہینہ حرا پہاڑ میں چلے جاتے اور اس کے پڑوس میں رہتے (کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یجاور فی حراء من کل سنۃ شہراً) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ابوطالب کے کچھ اشعار ابن ہشام نے نقل کئے ہیں۔ ایک مصرعہ یہ ہے:

وَرَاقٍ لِیَرقیٰ فی حِرَاءٍ وَنَازِلِ

(وہ حرا پر چڑھنے والے ہیں اور پھر اس سے اترنے والے ہیں)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر جب حقیقت کی تلاش کا جذبہ ابھرا تو آپ کا یہ حال ہوا کہ انسانی بستیوں سے نکل کر آپ پہاڑی علاقوں میں چلے جاتے۔ یہ گویا ایک صالح روح کا واقعات انسانی کا ماحول چھوڑ کر واقعات خداوندی کے ماحول میں جانا تھا ــــ صحرائی جغرافیہ خصوصیت سے اس کام کے لئے موزوں ترین جگہ ہوتی ہے۔

رومانیہ کے مستشرق کونستان ورژیل جارج (-۱۹۱۶) نے اسلام کے جغرافیہ کو سمجھنے کے لئے خود عرب کا سفر کیا تھا۔ وہ اپنی کتاب "پیغمبر اسلام" میں لکھتے ہیں:

جب تک کوئی انسان عرب اور مشرق کے جنگلوں میں ایک مدت نہ گزارے، وہ اس کو سمجھ ہی نہیں سکتا کہ صحرا کی وسعت اور اس کا سکوت کس طرح فکر انسانی کی وسعت کا سبب ہوتا ہے اور خیال کو تقویت دیتا ہے۔ عرب کی گھاس اور یورپ کی گھاس میں بہت فرق ہے۔ گرم جنگلوں میں کوئی گھاس ایسی نہیں جس میں خوشبو نہ ہو۔ یہاں تک کہ عرب جنگلوں کے ببول بھی خوشبو دار ہیں۔ ۳۰ لاکھ کیلو میٹر والا مسطح جنگل اور گرم عربستان ایسی جگہ ہے جہاں انسان گویا بلا واسطہ خدا تک پہنچ جاتا ہے۔

دوسرے ملک ایسی عمارت کے مثل ہیں جن کے درمیان بڑی بڑی دیواریں حائل ہیں۔ مگر عرب کے جنگلوں میں ایسا کوئی مانع نہیں جو دیدار حق کو روک سکے۔ لوگ جس طرف بھی نظر ڈالتے ہیں، لامحدود جنگل اور بے کنار آسمان انھیں دکھائی دیتا ہے۔ یہاں خدا اور فرشتوں کی شناسائی کے لئے کوئی چیز مانع نہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں عرب کے کچھ لوگوں نے ایک باہمی معاہدہ کیا تھا جس کو حلف الفضول کہا جاتا ہے۔
اس معاہدہ کا مقصد لوٹ کھسوٹ اور ظلم کو روکنا تھا۔ اس معاہدہ میں شریک ہونے والوں کے نام تھے فضل بن فضالہ، فضل بن نزداعہ اور فضیل بن حارث۔ چنانچہ انھیں کے نام پر اس معاہدہ کا نام حلف الفضول (فضل والوں کا معاہدہ) پڑ گیا۔ یہ معاہدہ ابتدائی بانیوں تک زندہ رہا۔ ان کے مرنے کے بعد صرف ان کا نام رہ گیا۔ زبیر بن عبدالمطلب نے اپنے بعض اشعار میں اس معاہدہ کا ذکر اس طرح کیا ہے (روض الانف از سہیلی)

اِنَّ الفُضولَ تَحالفوا وتعاقدُوا ان لَّا یُقیمَ بِبَطنِ مکۃَ ظالمٌ
اَمرٌ علیہِ تعاھدوا وتواثقوا فالجارُ والمعترُّ فیھم سالمٌ

فضل نامی افراد نے باہم معاہدہ کیا اور عہد باندھا کہ مکہ میں کوئی ظالم نہ رہنے پائے گا
انھوں نے اس بات پر باہم عہد باندھا اور اقرار کیا۔ پس مکہ میں پڑوسی اور ضرورت سے آنے والا سب محفوظ ہیں

واقعہ فیل کے بعد عرب میں ایک باہمی جنگ ہوئی جس کو حرب الفجار (حرام مہینوں میں کی جانے والی جنگ) کہا جاتا ہے۔ اس جنگ کے بعد دوبارہ عرب میں بدامنی بڑھ گئی۔ اسی زمانہ میں یہ واقعہ ہوا کہ یمن کے قبیلہ زبید کا ایک شخص کچھ تجارتی سامان لے کر مکہ آیا۔ قریش کے ایک سردار عاص بن وائل سہمی نے اس کا سامان خرید امگر اس کی مطلوبہ قیمت نہیں ادا کی۔ مذکورہ یمنی تاجر نے مکہ والوں سے فریاد کی۔ اس نے کچھ اشعار کہے اور ان کے ذریعہ عام لوگوں تک اپنی شکایت پہنچائی۔ اس واقعہ نے مکہ کے کچھ دردمند لوگوں کو چوکنا کر دیا۔ زبیر بن عبدالمطلب کی تحریک پر بنو ہاشم اور بنو تمیم کے لوگ عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہوئے تاکہ صورت حال کے بارے میں مشورہ کریں۔ انھوں نے حلف الفضول کی از سرنو تجدید کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے باہمی عہد کے ذریعہ اپنے کو پابند کیا کہ وہ مظلوم کا ساتھ دیں گے اور ظالم سے اس کا حق دلا کر رہیں گے (تعاقدوا باللہ لیکونن مع المظلوم حتی یؤدی الیہ حقہ) اس عہد کے بعد وہ لوگ عاص بن وائل کے پاس گئے۔ اس سے مذکورہ شخص کا سامان چھینا اور اس کو اس کے مالک کے حوالے کیا۔

یہ معاہدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی عمر میں ہوا تھا۔ وہ اگرچہ عربوں کا ایک معاہدہ تھا مگر آپ نے اس کی تصدیق فرمائی۔ اس کی بابت آپ کے یہ الفاظ سیرت کی کتابوں میں نقل کئے گئے ہیں:

لقد شھدت فی دار عبد اللہ بن جدعان حلفا لو دعیت بہ فی الاسلام لاجبت تحالفوا ان یردوا الفضول علی اھلھا وان لا یعز ظالم مظلوما (سیرت ابن کثیر)

میں عبداللہ بن جدعان کے گھر میں ہونے والے معاہدہ میں شریک تھا۔ اگر اسلام کے بعد بھی مجھے اس میں بلایا جاتا تو میں ضرور اس میں شریک ہوتا۔ انھوں نے اس بات کا عہد کیا تھا کہ وہ حقدار تک اس کا حق پہنچائیں گے اور یہ

کہ کوئی ظالم کسی مظلوم پر غالب نہ آسکے گا۔

ابن ہشام نے اس ذیل میں بعض واقعات نقل کئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حلف الفضول کا ذہنی اثر بعد کے عربوں میں بھی باقی تھا۔ ولید بن عتبہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان کے بھتیجے تھے۔ حضرت معاویہ نے ان کو مدینہ کا امیر بنایا تھا۔ اسی زمانہ میں ولید بن عتبہ اور حضرت حسین بن علی رض کے درمیان ایک جائداد کا جھگڑا ہوا جو کہ ذوالمروہ نامی گاؤں میں تھی۔ ولید نے طاقت کے زور پر اس پر قبضہ کرنا چاہا۔ حضرت حسین نے فرمایا:

احلف باللہ لتُنصِفَنّي من حقي او لآخُذَنَّ سيفي ثم لا قُومَنَّ في مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم لأدْعُوَنَّ بحلف الفضول

میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم کو میرے حق کے معاملہ میں انصاف کرنا ہوگا ورنہ میں اپنی تلوار لوں گا اور مسجد نبوی میں کھڑا ہو جاؤں گا اور حلف الفضول کے نام پر پکاروں گا۔

عبداللہ بن زبیر جو اس وقت وہاں موجود تھے انھوں نے بھی یہی بات کہی۔ انھوں نے کہا: میں بھی خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر حسین اس کے لئے پکاریں گے تو میں اپنی تلوار لوں گا اور ان کے ساتھ کھڑا ہو جاؤں گا یہاں تک کہ ان کا حق ان کو دیا جائے یا ہم دونوں ایک ساتھ قتل ہو جائیں۔ یہ بات مسور بن مخرمہ زہری کو پہنچی تو انھوں نے بھی اسی طرح کہا۔ اسی طرح یہ بات عبدالرحمن بن عثمان تیمی کو پہنچی تو انھوں نے بھی ایسا ہی کہا۔ جب ولید بن عتبہ کو اس کا علم ہوا تو اس نے حضرت حسین کو ان کا حق ادا کر دیا (سیرۃ ابن ہشام، جزءاول، ۱۴۶)

اوپر کی تفصیلات سے معلوم ہوا کہ بدامنی اور فساد کے مسئلہ کے حل کے لئے اسلام کا مصدقہ طریقہ حلف الفضول کا طریقہ ہے۔ یعنی معاشرہ کے ذمہ دار افراد کا خدا کے سامنے عہد باندھ کر اپنے آپ کو اس کا پابند کرنا کہ جب بھی کوئی ایسا واقعہ ہوگا کہ ایک شخص دوسرے شخص پر ظلم کر رہا ہو تو وہ فوراً دوڑ کر موقع پر پہنچیں گے۔ مظلوم کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ بنائیں گے۔ وہ اپنی ساری قوت اور ساری کوشش صرف کر کے ظالم کو مجبور کریں گے کہ وہ اپنے ظلم سے باز آئے اور مظلوم کو اس کا حق ادا کرے۔

آج ہر بستی میں یہ صورت حال ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو ستاتا ہے۔ کوئی کسی کو ذلیل کرنے پر تلا ہوا ہے، کوئی کسی کے اوپر جھوٹا مقدمہ قائم کئے ہوئے ہے۔ کوئی کسی کا مال ہڑپ کر لینا چاہتا ہے۔ غرض جس کو ذرا بھی کوئی طاقت یا موقع ہاتھ آتا ہے تو وہ اس کوشش میں لگ جاتا ہے کہ کمزور کو دبائے اور ظالمانہ طریقہ پر دوسرے کے حقوق کو غصب کرے۔ اس قسم کے واقعات ہر بستی میں اور ہر محلہ میں ہو رہے ہیں۔ مگر تمام لوگ غیر جانب دار بنے رہتے ہیں حتیٰ کہ ذمہ دار افراد بھی ان معاملات میں کوئی دخل نہیں دیتے۔ کسی کو اگر اصلاح امت یا خدمت قوم کا شوق ہوتا ہے تو وہ جلسوں اور تقریروں کا مشغلہ شروع کر دیتا ہے۔ حالانکہ اصل کام مظلوموں کی عملی دادرسی ہے نہ کہ مظلوموں کے نام پر جلسہ کرنا اور اس میں الفاظ کے دریا بہانا۔ مظلوموں کے نام پر جلسے کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص زخمی ہو جائے اور آپ اس کو اسپتال لے جانے کے بجائے ایک "شان دار زخمی کانفرنس" منعقد کرنے کے لئے دوڑ پڑیں۔

قبائلی نظام میں آدمی قبیلہ کی حمایت کے تحت زندگی گزارتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے ابتدائی زمانہ میں اپنے چچا ابو طالب کی حمایت میں رہے جو قبیلہ بنو ہاشم کے سردار تھے۔ نبوت کے دسویں سال ابو طالب کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد قبائلی روایات کے مطابق ابو لہب قبیلہ بنو ہاشم کا سردار مقرر ہوا۔ اس نے آپ کی حمایت سے انکار کر دیا۔ اب آپ نے ارادہ کیا کہ کسی دوسرے قبیلہ کی حمایت حاصل کر کے اپنا دعوتی کام جاری رکھیں۔ اس غرض کے تحت آپ نے طائف کا سفر فرمایا۔

طائف مکہ کے جنوب مشرق میں ۶۵ میل کے فاصلہ پر ایک سرسبز و شاداب بستی تھی۔ وہاں آپ کے بعض رشتہ دار تھے۔ چنانچہ آپ اپنے خادم زید بن حارثہ کو لے کر طائف پہنچے۔ اس وقت وہاں کی آبادی میں تین ممتاز سردار تھے۔ عبد یالیل، مسعود اور حبیب۔ آپ ان تینوں سے ملے۔ مگر ہر ایک نے آپ کا ساتھ دینے یا آپ کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا: خدا نے اگر تم کو رسول بنایا ہو تو میں کعبہ کا پردہ پھاڑ ڈالوں۔ دوسرے نے کہا۔ خدا کو کیا تمھارے سوا کوئی نہ ملا تھا جس کو وہ رسول بنا کر بھیجتا۔ تیسرے نے کہا: خدا کی قسم میں تم سے بات نہیں کروں گا۔ اگر تم رسول ہو تو تمھارا جواب دینا گستاخی ہے اور اگر تم جھوٹے ہو تو میرے لئے مناسب نہیں کہ میں تم سے بات کروں (فقال له احدهم هو يمرط ثياب الكعبة إن كان الله ارسلك۔ وقال الآخر اما وجد الله احداً ارسله غيرك۔ وقال الثالث والله لا اكلمك ابداً۔ لئن كنت رسولا من الله كما تقول لانت اعظم خطراً من ان ارد عليك الكلام ولئن كنت تكذب على الله ما ينبغي لي ان اكلمك، سيرة ابن هشام جلد ۲ صفحہ ۲۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غمگین ہو کر واپس ہوئے۔ مگر ان لوگوں نے پھر بھی آپ کو نہ بخشا۔ انھوں نے بستی کے لڑکوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔ وہ گالیوں اور پتھروں سے آپ کا پیچھا کرتے رہے۔ آپ کے خادم زید بن حارثہ نے اپنے کمل سے آپ کو آڑ میں لینے کی کوشش کی۔ مگر وہ آپ کو بچانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اور آپ کا جسم لہولہان ہوگیا۔

بستی سے کچھ دور جا کر عتبہ اور شیبہ دو بھائیوں کا انگور کا باغ تھا۔ یہاں پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی اور آپ نے اس باغ میں پناہ لی۔ آپ زخموں سے چور تھے اور اللہ سے دعا کر رہے تھے کہ خدایا میری مدد فرما، مجھے تنہا نہ چھوڑ دے۔

عتبہ اور شیبہ دونوں مشرک تھے۔ مگر جب انھوں نے آپ کا حال دیکھا تو ان کو آپ کے اوپر

رحم آگیا۔ انھوں نے اپنے نصرانی غلام کو بلایا جس کا نام عداس تھا۔ انھوں نے عداس سے کہا کہ ان انگوروں کے کچھ خوشے لو اور ان کو ایک برتن میں رکھ کر اس آدمی کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ اس میں سے کھائے۔ عداس نے ایسا ہی کیا۔ وہ انگور لے کر آیا اور اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھ دیا اور کہا کہ یہ کھاؤ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس کو اپنے ہاتھ میں لیا تو بسم اللہ کہا اور پھر کھایا۔

عداس نے آپ کے چہرہ کی طرف دیکھا اور کہا: خدا کی قسم یہ جو آپ نے کہا، اس ملک کے لوگ ایسا نہیں کہتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اے عداس، تم کس ملک کے رہنے والے ہو اور تمھارا دین کیا ہے۔ عداس نے کہا: میں نصرانی ہوں اور میں نینوا (عراق) کا رہنے والا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: مرد صالح یونس بن متی کے شہر کا۔ عداس نے کہا: آپ کو کیسے معلوم کہ یونس بن متی کون تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: وہ میرے بھائی ہیں۔ وہ نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں (ذاک اخی۔ کان نبیا و انا نبی) یہ سن کر عداس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھک پڑا اور آپ کے سر اور ہاتھ اور پاؤں کو چومنے لگا۔

عتبہ اور شیبہ اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا: دیکھو اس شخص نے تمھارے غلام کو خراب کر دیا۔ عداس جب لوٹ کر آیا تو انھوں نے اس سے کہا: عداس تمھارا برا ہو۔ تم کو کیا ہوا کہ تم اس کے سر اور ہاتھ اور پاؤں کو چومنے لگے۔ عداس نے کہا اے میرے آقا، زمین پر اس سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ اس آدمی نے مجھ کو ایسی بات بتائی جس کو صرف ایک نبی ہی جان سکتا ہے۔ دونوں نے کہا: اے عداس، تمھارا برا ہو۔ وہ تم کو تمھارے دین سے پھیر نہ دے۔ کیونکہ تیرا دین اس کے دین سے بہتر ہے (سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۳۰)

خدا کے رسول کو ایک ہی سفر میں مختلف لوگوں سے تین الگ الگ قسم کے سلوک کا تجربہ ہوا:

ایک نے آپ کے اوپر پتھر پھینکے۔

دوسرے نے آپ کی ضیافت کی۔

تیسرے نے آپ کی نبوت کا اقرار کر لیا۔

اس واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ یہ سبق کہ اس دنیا میں امکانات کی کوئی حد نہیں۔ یہاں اگر چٹیل میدان ہیں تو وہیں سایہ دار درخت بھی کھڑے ہوئے ہیں۔ دنیا کی زندگی میں کچھ لوگوں سے اگر برے سلوک کا تجربہ ہو تو آدمی کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ آدمی اگر خود سچائی پر قائم رہے۔ وہ اپنے دل کو منفی جذبات سے بچائے تو ضرور اس کو خدا کی مدد حاصل ہوگی۔ ایک قسم کے لوگ اگر اس کا ساتھ نہ دیں گے تو کچھ دوسرے لوگوں کے دل اس کے لئے نرم کر دئے جائیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں دعوت کا آغاز کیا تو آپ کی شدید ترین مخالفت کی گئی۔ آپ کو ہر قسم کی تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ آپ کو دبانے اور ناکام کرنے کے لئے وہ لوگ جو کچھ کر سکتے تھے وہ سب انھوں نے کیا۔ مگر آپ کا مشن بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ مدینہ کے لوگوں تک اسلام کی آواز پہنچی۔ وہاں کثرت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ آپ کے ساتھ دوسرے مسلمانوں کو بھی مکہ والے بہت ستاتے تھے۔ آپ نے مکہ کے مسلمانوں سے کہا مدینہ میں اللہ نے تمھارے لئے کچھ بھائی اور مددگار مہیا کر دئے ہیں، تم لوگ وہاں چلے جاؤ۔ لوگ ایک ایک کرکے جانے لگے ۔ قریش کو اس منصوبہ کا علم ہوا تو انھوں نے کوشش کی کہ لوگوں کو جانے سے روکیں۔ کچھ لوگوں کو مارا، کچھ لوگوں کو پکڑ کر گھروں میں بند کر دیا۔ تاہم بیشتر لوگ کسی نہ کسی طرح مکہ سے مدینہ پہنچ گئے۔

آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باری تھی۔ قریش کو اندازہ ہو گیا کہ تمام مسلمانوں کو مدینہ بھیجنے کے بعد اب پیغمبر اسلام خود بھی مدینہ چلے جائیں گے۔ چنانچہ بنو ہاشم کے سوا تمام قبائل قریش کے سردار دار الندوہ (قصی بن کلاب کا مکان) میں جمع ہوئے۔ مشورہ میں مختلف تجویزیں سامنے آئیں۔ بالآخر اس رائے پر اتفاق ہوا کہ ہر قبیلہ کا ایک ایک آدمی تلوار لے اور بیک وقت حملہ آور ہو کر محمدؐ کو قتل کر دے۔ اس طرح محمدؐ کا خون تمام قبائل میں تقسیم ہو جائے گا۔ بنو ہاشم تمام قبائل کا مقابلہ نہ کر سکیں گے اور قصاص کے بجائے دیت پر راضی ہو جائیں گے۔ اس کے بعد اگلی رات کو تمام سرداروں نے آپ کا مکان گھیر لیا۔ تاکہ صبح کو جب آپ گھر سے باہر نکلیں تو اچانک حملہ کرکے آپ کا خاتمہ کر دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان تمام حالات کی خبر تھی اور آپ بھی خاموشی کے ساتھ اپنی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے، چنانچہ اپنے طے شدہ منصوبہ کے مطابق آپ اسی رات کو ابو بکر صدیق رضؓ کے ساتھ مکہ سے نکل گئے۔ آپ مکہ سے چل کر چار میل کے فاصلہ پر جبل ثور کے ایک غار میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ آپ کو اندازہ تھا کہ قریش کو جب معلوم ہوگا کہ آپ مکہ سے چلے گئے ہیں تو وہ آپ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نکلیں گے۔ اس لئے آپ چاہتے تھے کہ چند دن غار ثور میں گزاریں اور جب قریش کی تلاش رکے تو مدینہ کا سفر کریں۔

اب قریش کے سوار چاروں طرف آپ کی تلاش میں دوڑنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک دستہ غار ثور تک بھی پہنچ گیا۔ یہ لوگ تلواریں لئے ہوئے غار ثور کے پاس اس طرح کھڑے تھے کہ ان کے پاؤں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کو دکھائی دے رہے تھے۔ یہ انتہائی خطرناک لمحہ تھا۔ ابو بکر صدیق نے کہا: اے خدا کے رسول، دشمن تو یہاں تک پہنچ گیا۔ آپ نے کہا لا تحزن ان اللہ معنا (غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے) پھر اطمینان کے ساتھ فرمایا: اے ابو بکر، ان دو کے بارے میں تمھارا کیا گمان ہے جن کا تیسرا اللہ ہو (یا ابا بکر ما ظنک باثنین اللہ ثالثھما)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے ایک غزوہ ذات الرقاع ہے جو ۴ھ میں پیش آیا۔ اس غزوہ کے واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے صحیح بخاری (کتاب المغازی) میں نقل ہوا ہے۔ سیرت کی کتابوں میں بھی یہ واقعہ معمولی فرق کے ساتھ آیا ہے۔

بنو غطفان کا ایک شخص جس کا نام غورث ابن الحارث تھا، اس نے اپنی قوم سے کہا: کیا میں تمھارے لئے محمد کو قتل کر دوں (الا اقتل لکم محمدا) انھوں نے کہا ضرور، مگر تم کیسے ان کو قتل کرو گے۔ غورث نے کہا: میں ان کو غفلت کی حالت میں پکڑوں گا اور قتل کر دوں گا۔ اس کے بعد غورث روانہ ہوا۔ وہ ایک مقام پر پہنچا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ اس مقام پر درخت اور جھاڑیاں تھیں لوگ جھاڑیوں کے سایہ میں لیٹے ہوئے تھے۔ رسول اللہ علیہ وسلم بھی ایک درخت کے نیچے آرام کر رہے تھے اور اپنی تلوار آپ نے درخت کی شاخ سے لٹکا دی تھی۔ اتنے میں مذکورہ اعرابی (غورث) آپ کو تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچا۔ اس نے جب دیکھا کہ آپ تنہا لیٹے ہوئے ہیں اور آپ کی تلوار بھی آپ سے الگ درخت کے اوپر لٹک رہی ہے تو اس نے بڑھ کر آپ کی تلوار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پھر تلوار کھینچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھا اور کہا: آپ کو کون مجھ سے بچائے گا (یا محمد من یمنعک منی) آپ نے فرمایا اللہ عز وجل۔ اعرابی نے تلوار کو ہلاتے ہوئے کہا: اپنی اس تلوار کی طرف دیکھو جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ کیا تم کو اس سے ڈر نہیں معلوم ہوتا۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ میں تم سے کیوں ڈروں۔ جب کہ مجھے یقین ہے کہ اللہ مجھے بچائے گا (یمنعنی اللہ منک) آپ کے پُر اعتماد جواب کے بعد اعرابی کو اقدام کی ہمت نہ ہوئی۔ اس نے تلوار میان میں ڈال کر آپ کو واپس کر دی (فشام الاعرابی السیف) اب آپ نے اعرابی کو بٹھایا اور لوگوں کو آواز دی۔ لوگ آئے تو دیکھا کہ ایک اعرابی آپ کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ آپ نے پورا قصہ بتایا۔ اعرابی سہما ہوا تھا کہ اب شاید تلوار میری گردن پر چلے گی۔ مگر آپ نے اس کو چھوڑ دیا۔ اس کو کوئی سزا نہ دی (سیرت ابن ہشام جلد ۳، تفسیر ابن کثیر جلد اول)

جو لوگ اللہ پر پورا بھروسہ کر لیں ان کو کسی دوسری چیز کا خوف نہیں رہتا۔ یہ عقیدہ کہ اللہ ایک زندہ اور طاقت ور ہستی کی حیثیت سے ہر وقت موجود رہے، ان کو ہر دوسری طاقت کے مقابلہ میں نڈر بنا دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دشمن کے مقابلہ میں کسی شخص کی سب سے بڑی طاقت بے خوفی ہے۔ دشمن کو اگر یقین ہو جائے کہ اس کا حریف اس سے نہیں ڈرتا تو وہ خود اس سے ڈرنے لگتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے ایک غزوۂ خندق ہے جو شوال ۵ ھ میں پیش آیا۔ اس کو غزوۂ احزاب بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی فوجوں کا غزوہ۔ اس جنگ میں عرب کے مختلف قبیلوں نے مل کر مدینہ پر حملہ کر دیا تھا۔ قبائل قریش، قبائل غطفان اور قبائل یہود کے دس ہزار سے زیادہ افراد اس میں شریک تھے۔ یہ حملہ کتنا شدید تھا، اس کا اندازہ قرآن کے ان الفاظ سے ہوتا ہے: "جب وہ اوپر سے اور نیچے سے تمھارے اوپر چڑھ آئے۔ اس وقت ڈر کی وجہ سے تمھاری آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منھ کو آگئے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت اہل ایمان کی بڑی جانچ ہوئی اور وہ بہت ہلا مارے گئے (احزاب) مخالفین اسلام کا یہ لشکر پوری طرح ہتھیار بند تھا۔ اس میں ساڑھے چار ہزار اونٹ اور تین سو گھوڑے تھے۔

دشمنوں نے مدینہ کو اس طرح گھیرے میں لے لیا کہ باہر سے ہر قسم کی امداد آنا بند ہو گئی۔ سامان رسد کی اتنی کمی ہوئی کہ لوگ فاقے کرنے لگے۔ اسی دوران کا واقعہ ہے کہ ایک صحابی نے بھوک کی شکایت کی اور کُرتا اٹھا کر دکھایا کہ پیٹ پر ایک پتھر باندھ رکھا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں اپنا کُرتا اٹھایا تو آپ کے پیٹ پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معلوم ہوا کہ مختلف قبائل ایک ساتھ ہو کر مدینہ پر حملہ کرنے والے ہیں تو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ سلمان فارسی کی رائے کے مطابق طے ہوا کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے۔ اس وقت مدینہ تین طرف سے پہاڑوں، گھنے درختوں اور مکانات کی دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔ شمال مغربی حصہ خالی تھا۔ طے ہوا کہ اس کھلے ہوئے حصہ میں دو پہاڑوں کے درمیان خندق کھود دی جائے۔ چنانچہ چھ دن کی لگاتار محنت سے ایک خندق کھود کر تیار کی گئی۔ یہ خندق دشمنوں کی یلغار کو روکنے کے لئے اتنی کارآمد ثابت ہوئی کہ اس غزوہ کا نام غزوہ خندق پڑ گیا۔

سیرت کی کتابوں میں خندق کی تفصیلات جب ہم پڑھتے ہیں تو ایک سوال سامنے آتا ہے۔ "ایک معمولی خندق دشمنوں کی فوج کو روکنے کا سبب کیسے بن گئی"، مذکورہ تفصیلات کے مطابق یہ خندق تقریباً چھ کیلومیٹر لمبی تھی۔ اور اس کی گہرائی اور چوڑائی ایک معمولی نہر سے زیادہ نہ تھی۔ وہ تقریباً ڈھائی میٹر گہری اور تقریباً تین میٹر چوڑی تھی۔ اس قسم کی ایک خندق ایک مسلح فوج کے لئے ایک نالی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ وہ لوگ باسانی اس کو عبور کر کے مدینہ میں داخل ہو سکتے تھے۔ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس خندق کے باوجود مسلمان دشمن فوج کی تیروں کی زد میں تھے۔ جیسا کہ حضرت سعد بن معاذؓ کو تیر لگنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم کچھ لوگ خندق کے دوسری طرف پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ عمر بن عبدود اور اس کے کچھ ساتھیوں نے گھوڑے پر سوار ہو کر خندق کا جائزہ لیا اور ایک جگہ خندق کو کچھ کم چوڑی دیکھ کر وہاں ٹھہرے اور گھوڑا کدا کر خندق کے دوسری طرف پہنچ گئے۔ اس کے بعد عمرو بن عبدود کا مقابلہ حضرت علی بن ابی طالبؓ سے ہوا جس میں عمرو بن عبدود مارا گیا۔ تقریباً ایک مہینہ کا یہ محاصرہ اپنے آخری دنوں میں آندھی

اور طوفان کے بعد ختم ہوگیا۔ آندھی نے دشمن کے لشکر میں اتنی بد حواسی پیدا کی کہ ابوسفیان نے اونٹ کی رسی کھولے بغیر اونٹ پر بیٹھ کر اس کو ہانکنا شروع کر دیا۔ پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ باقی ہے کہ ۱۰ ہزار سے زیادہ تعداد کی مسلح فوجیں خندق کو عبور کرکے مدینہ میں کیوں نہ داخل ہوئیں جہاں تین ہزار آدمیوں کا بے سروسامان قافلہ ان کی یلغار کو روکنے کے لئے بالکل ناکافی تھا۔

اس سوال کا جواب خدا کی ایک سنت میں ملتا ہے۔ وہ سنت یہ کہ اللہ اہل ایمان کی طاقت ان کے دشمنوں کو بڑھا کر دکھاتا ہے تاکہ وہ مرعوب اور ہیبت زدہ ہوجائیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے "ہم منکروں کے دلوں میں تمھارا رعب ڈال دیں گے۔ کیوں کہ انھوں نے ایسی چیزوں کو خدا کا شریک ٹھہرایا جن کے حق میں خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری (آل عمران ۱۵۱) اللہ تعالیٰ کی یہ نصرت رعب غزوۂ خندق میں اور دوسرے مواقع پر ظاہر ہوئی۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کی کھودی ہوئی نالی ان کے دشمنوں کو بہت بڑی خندق کی صورت میں دکھائی دی۔ تاہم مسلمانوں کو اپنے ہاتھوں کو تھکا کر ایک "نالی" کھودنا ضروری ہے۔ اگر وہ نالی کھودنے میں اپنے ہاتھوں کو نہ تھکائیں تو خدا ان کی نالی کو خندق بنا کر کس طرح دوسروں کو دکھائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی نصرت رعب جو قرن اول کے مسلمانوں کو کمال درجہ میں حاصل ہوئی وہ بعد کے دور کے مسلمانوں کو بھی مل سکتی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ اس راستہ پر چلیں جس راستہ پر صحابہ خدا کے رسول کی رہنمائی میں چلے۔ کسی اور راستہ پر چلنے والے شیطان کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ پھر ان کو خدا کی نصرت کس طرح ملے گی۔ اللہ کی نصرت کا مستحق آدمی اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو حق کے ساتھ اس طرح شامل کرے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے اس کو وہ حق کے حوالے کردے، وہ اپنے سر کا تاج دوسرے کے سر پر رکھ دے جیسا کہ ہجرت کے بعد مدینہ کے لوگوں نے کیا۔

خدا کی نصرت کا مستحق بننے کی شرط ایک لفظ میں یہ ہے کہ "جب تم مدد کروگے تو تمھاری مدد کی جائے گی" خدا ہماری مدد پر اس وقت آتا ہے جب کہ ہم دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کریں جو ہم خدا سے اپنے لئے چاہتے ہیں۔ ہماری ذات سے اگر دوسروں کو زحمت پہنچ رہی ہو تو خدا کے فرشتے ہمارے لئے خدا کی رحمت کا تحفہ لے کر نہیں آسکتے۔ اگر ہمارا یہ حال ہو کہ جس پر ہمارا قابو چلے اس کو ہم ناحق ستانے لگیں تو ناممکن ہے کہ خدا وہاں ہماری مدد کرے جہاں کوئی دوسرا ہمارے اوپر قابو پاکر ہمیں ستانے لگتا ہے۔ ایک آدمی اپنی مصیبت میں ہم کو پکارے اور ہم استطاعت کے باوجود اس کی پکار پر دھیان نہ دیں تو کبھی یہ ممکن نہیں کہ خدا اس وقت ہماری پکار کو سنے جب کہ کوئی طاقت ور ہمارے اوپر چڑھ آتا ہے اور ہم خدا کو پکارنے لگتے ہیں۔ دنیا کی زندگی میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے مقابلہ میں آدمی طاقت ور ہوتا ہے اور کسی کے مقابلہ میں کمزور۔ یہی صورت حال نصرت خداوندی کے معاملہ میں آدمی کے امتحان کا پرچہ ہے۔ کوئی شخص یا قوم اپنے طاقت وروں کے مقابلہ میں خدا کی جو نصرت چاہے اس کا ثبوت اس کو اپنے کمزوروں کے معاملہ میں دینا پڑتا ہے اگر آدمی اپنے کمزوروں پر ظلم کرتا ہو تو اپنے طاقت وروں کے مقابلہ میں وہ خدا کی مدد کا مستحق نہیں بن سکتا، خواہ وہ کتنا ہی خدا کو پکارے، خواہ وہ کتنا ہی یوم دعا منائے۔

بدر کی لڑائی (۲ ھ) سے کچھ پہلے قریش کا ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ ساٹھ آدمیوں کی سرکردگی میں شام بھیجا گیا تھا۔ اس تجارتی قافلہ میں مکہ کے مردوں اور عورتوں نے اپنا تمام سرمایہ لگا دیا تھا۔ بدر کی لڑائی میں قریش کو مکمل شکست ہوئی۔ تاہم ابوسفیان کو اس میں کامیابی ہوئی کہ وہ تجارتی قافلہ کو ساحلی راستہ سے چلاکر مکہ پہنچ جائیں۔ جنگ کے بعد سارا مکہ جوش انتقام سے بھرا ہوا تھا۔ قریش کے ذمہ دار افراد کا ایک اجتماع دارالندوہ میں ہوا۔ اس اجتماع میں متفقہ طور پر یہ طے پایا کہ تجارتی قافلہ کے شرکا صرف اپنا اصل سرمایہ لے لیں اور منافع کی رقم پوری کی پوری محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف جنگ کی تیاری میں لگا دی جائے۔ منافع کی یہ رقم پچاس ہزار دینار تھی جو اس وقت کے لحاظ سے بہت بڑی رقم تھی۔ اب قریش نے زبردست تیاری کی اور شوال ۳ھ میں مکہ سے نکل کر مدینہ پر حملہ کے لئے روانہ ہوئے۔

اسی جنگ کا نام جنگ احد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی تو آپ نے صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ بڑے صحابہ میں سے اکثر کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے۔ مگر نوجوان طبقہ اس کا پرجوش مخالف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ہم یہاں ٹھہریں گے تو دشمن اس کو ہماری بزدلی اور کمزوری پر محمول کرے گا۔ اس لئے ہمیں باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہئے۔ عبداللہ بن ابی کی رائے بھی وہی تھی جو اکابر صحابہ کی تھی۔ (سیرۃ ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۷)

جن لوگوں کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے، اس کی بڑی وجہ مدینہ کا جغرافیہ تھا جو ایک قدرتی حصار کا کام کرتا تھا۔ مدینہ کا جائے وقوع ایسا تھا کہ اس کے جنوب میں کھجوروں کے گھنے باغات اس کثرت سے تھے کہ ادھر سے کوئی فوج بستی کے اوپر حملہ نہیں کرسکتی تھی۔ اسی طرح مشرق اور مغرب کے بڑے حصہ میں پہاڑیاں تھیں جو کسی فوجی پیش قدمی کے لئے قدرتی روک کا کام کر رہی تھیں۔ اس لئے کوئی دشمن صرف ایک ہی سمت سے مدینہ پر حملہ کرسکتا تھا۔ اس جغرافی پوزیشن نے مدینہ کو جنگی اعتبار سے کافی محفوظ شہر بنا دیا تھا۔ گویا مدینہ ایک قسم کا قلعہ تھا۔ شہر سے باہر نکل کر وہ چاروں طرف سے دشمن کی زد میں ہوجاتے تھے جب کہ مدینہ کے اندر صرف ایک طرف سے مقابلہ کا انتظام کرنا تھا۔ غزوۂ احزاب میں مدینہ کے اسی جائے وقوع سے فائدہ اٹھایا گیا اور اس کی کھلی سمت میں (شمال مغربی رخ پر) خندق کھود کر پورے شہر کو محفوظ کر لیا گیا تھا۔

بڑے صحابہ کی اکثریت اور عبداللہ بن ابی کی رائے اگرچہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کی تھی۔ مگر

آپ نے نوجوان طبقہ کی رائے کا لحاظ کیا اور ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ مدینہ سے نکل کر احد کی طرف روانہ ہوئے۔ عبد اللہ بن ابی نے جب دیکھا کہ اس کی رائے نہیں مانی گئی جو بظاہر حالات معقول بھی تھی تو اس کو بہت دکھ ہوا۔ وہ مدینہ سے ساتھ نکل پڑا تھا مگر دل کے اندر غصہ باقی تھا۔ چنانچہ اسلامی لشکر ابھی مدینہ اور احد کے درمیان تھا کہ عبد اللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر مدینہ کی طرف واپس ہو گیا۔ عبد اللہ بن ابی نے کہا:

اطاعهم وعصاني، ما ندري علامَ نقتلُ انفسنا ههنا ايها الناس

رسول اللہ نے ان کی بات مان لی اور میری بات نہیں مانی۔ اے لوگو! ہم کو نہیں معلوم کہ ہم اپنی جانوں کو یہاں کیوں ہلاک کریں۔

(سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۸)

احد کی جنگ میں شکست نے یہ ثابت کیا کہ انھیں لوگوں کی رائے درست تھی جو مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کے لئے کہتے تھے اور باہر نکلنے سے روکتے تھے۔ چنانچہ اس کے بعد غزوۂ خندق (۵ ھ) میں اسی رائے کو اختیار کیا گیا اور مدینہ میں رہ کر مقابلہ کی تدبیر کی گئی۔ تاہم تمام بڑے صحابہ اپنے اختلاف رائے کو بھول کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے اور جنگ میں شدید نقصان اور تکلیف کے باوجود پوری بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ صرف عبد اللہ بن ابی الگ ہوا اور اس کی بنا پر رئیس المنافقین کہلایا۔ عبد اللہ بن ابی کی رائے اصولاً درست تھی۔ تجربہ نے بھی اس کے صحیح ہونے کی تصدیق کی۔ مگر صحت رائے کے باوجود اطاعت سے نکلنا اس کے لئے گمراہی اور خدا کی ناراضی کا سبب بن گیا۔

اسلام میں مشورہ کی بے حد اہمیت ہے۔ ہر آدمی کو حق ہے کہ وہ اپنا مشورہ پیش کرے۔ لیکن ہر مشورہ دینے والا اگر یہ بھی چاہے کہ اس کے مشورہ پر ضرور عمل کیا جائے تو کبھی کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مختلف رایوں میں سے کسی ایک ہی رائے کو عملاً اختیار کیا جا سکتا ہے نہ کہ ہر رائے کو۔ سچے مسلمان وہ ہیں جو مشورہ پیش کرنے کے بعد اپنا مشورہ بھول جائیں اور ذمہ داروں کی طرف سے جو فیصلہ ہو اس کو اس طرح مان لیں جیسے وہی ان کی اپنی رائے تھی۔

"سب سے بڑی قربانی رائے کی قربانی ہے" کسی شخص کا یہ قول بہت با معنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رائے کی قربانی واحد چیز ہے جس کے اوپر کوئی مضبوط اجتماعیت کھڑی ہوتی ہے۔ کوئی عمارت صرف اس وقت بنتی ہے جب کہ کچھ اینٹیں اپنے آپ کو زمین میں دبانے کے لئے تیار ہوں۔ اسی طرح کوئی حقیقی اجتماعیت صرف اس وقت قائم ہوتی ہے جب کہ کچھ لوگ اس کے لئے تیار ہوں کہ وہ اپنی رایوں کو اپنے سینہ میں چھپا لیں گے اور اختلاف رائے کے باوجود اتحاد عمل کا ثبوت دیں گے۔ اس قربانی کے بغیر کسی انسانی اجتماعیت کا وجود میں آنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا اینٹوں کے بنیاد میں دفن ہوئے بغیر عمارت کا وجود میں آنا۔

سنہ ۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں خواب دیکھا کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ عمرہ کر رہے ہیں۔ صحابہ کو آپ نے یہ خواب بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے کہ چھ سال کے بعد اب مکہ جانے اور حرم کی زیارت کرنے کا موقع ملے گا۔ اس خواب کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ چودہ سو اصحاب بھی آپ کے ساتھ ہوگئے۔ غدیر اشطاط کے مقام پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ قریش آپ کے سفر کی خبر پاکر سرگرم ہوگئے ہیں۔ انھوں نے ایک لشکر جمع کیا ہے اور عہد کیا ہے کہ آپ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے۔

کعبہ کی زیارت سے کسی کو روکنا عرب روایات کے بالکل خلاف تھا۔ مزید یہ کہ آپ اشارۂ خداوندی کے تحت یہ سفر کر رہے تھے۔ مگر اس کے باوجود آپ اس خبر کو سن کر مشتعل نہیں ہوئے۔ آپ کے جاسوس نے بتایا کہ خالد بن ولید دو سو سواروں کو لے کر مقام غمیم تک پہنچ گئے ہیں تاکہ آپ کا راستہ روکیں۔ یہ خبر سن کر آپ نے یہ کیا کہ معروف راستہ کو چھوڑ دیا اور ایک غیر معروف اور دشوار گزار راستہ سے چل کر حدیبیہ تک پہنچ گئے تاکہ خالد سے ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے۔ اس واقعہ کو ابن ہشام نے جن الفاظ میں نقل کیا ہے وہ یہ ہیں:

قال من رجل یخرج بنا علی طریق غیر طریقهم التی هم بها۔ قال رجل انا یا رسول اللّٰہ۔ قال فسلك بهم طریقا وعرا اجرل بین شعاب فلما خرجوا منه وقد شق ذلك علی المسلمین وافضوا الی ارض سهلة عند منقطع الوادی قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم للناس قولوا نستغفر اللّٰہ ونتوب الیه فقالوا ذلك۔ فقال واللّٰہ انها للحطة التی عرضت علی بنی اسرائیل فلم یقولوها (جزء ۳ صفحہ ۳۵۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کون شخص ہے جو ہم کو ایسے راستہ سے لے جائے جو ان کے راستہ سے مختلف ہو۔ ایک شخص نے کہا کہ میں اے اللہ کے رسول۔ چنانچہ وہ لوگوں کو لے کر ایسے راستہ پر چلا جو سخت دشوار اور پتھریلا تھا اور پہاڑی راستوں سے گزرتا تھا۔ جب لوگ اس راستہ کو طے کر چکے اور مسلمانوں کو اس پر چلنا بہت شاق گزرا تھا اور وہ وادی کے ختم پر ایک ہموار زمین میں پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے کہا کہ کہو ہم اللہ سے مغفرت مانگتے ہیں اور اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ لوگوں نے اسی طرح کہا۔ آپ نے فرمایا: خدا کی قسم یہی حطہ ہے جو بنی اسرائیل کو پیش کیا گیا تھا۔ مگر انھوں نے نہیں کہا۔

حطہ کا مطلب توبہ اور بخشش ہے۔ اس صبر آزما موقع پر توبہ واستغفار کرانا ظاہر کرتا ہے کہ خدا کے بتائے ہوئے صابرانہ طریق کار کا آدمی کو اس قدر زیادہ پابند ہونا چاہئے کہ اس راہ پر چلتے ہوئے جو کمزوری یا جھنجھلاہٹ پیدا ہو اس کو بھی آدمی گناہ سمجھے اور اس کے لئے خدا سے معافی مانگے۔ اس کو خدا کے طریقہ پر راضی رہنا چاہئے نہ کہ وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر خود ساختہ طریقے نکالنے لگے۔

حدیبیہ کا مقام مکہ سے ۹ میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں آپ ٹھہر گئے تاکہ حالات کا جائزہ لے سکیں۔
حدیبیہ سے آپ نے خراش بن امیہ خزاعی کو ایک اونٹ پر سوار کرکے اہل مکہ کے پاس بھیجا کہ ان کو خبر کر دیں کہ ہم صرف بیت اللہ کی زیارت کے لئے آئے ہیں، جنگ کے لئے نہیں آئے ہیں۔ جب وہ مکہ پہنچے تو اہل مکہ نے ان کے اونٹ کو ذبح کر ڈالا اور خود حضرت خراش کو بھی قتل کرنے کے لئے دوڑے۔ مگر وہ کسی طرح بچ کر واپس آگئے۔ پھر آپ نے حضرت عثمان کو یہ پیغام لے کر مکہ بھیجا کہ تم لوگ مزاحمت نہ کرو، ہم عمرہ کے مراسم ادا کرکے خاموشی سے واپس چلے جائیں گے۔ اہل مکہ نے حضرت عثمان کو بھی روک لیا۔ پھر مکرز بن حفص پچاس آدمیوں کو لے کر رات کے وقت حدیبیہ پہنچا اور مسلمانوں کے پڑاؤ پر تیر اور پتھر برسانے لگا۔ مکرز کو گرفتار کر لیا گیا۔ مگر اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ اس کو بلا شرط چھوڑ دیا گیا۔ اسی طرح مقام تنعیم کی طرف سے ۸۰ آدمی صبح سویرے آئے اور عین نماز کے وقت مسلمانوں پر چھاپہ مارا۔ یہ لوگ بھی پکڑ لئے گئے۔ مگر آپ نے ان کو بھی غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔
اس کے بعد قریش سے طویل مذاکرات کے بعد دونوں فریقوں کے درمیان صلح ہوئی۔ مگر یہ صلح ظاہر بینوں کے لئے سراسر قریش کی فتح اور مسلمانوں کی شکست کے ہم معنی تھی۔ مسلمان یہ سمجھے ہوئے تھے کہ وہ بشارت الٰہی کے تحت عمرہ کرنے کے لئے مکہ جا رہے ہیں مگر جو صلح ہوئی اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس شرط پر راضی ہو گئے کہ وہ عمرہ کئے بغیر حدیبیہ سے واپس چلے جائیں۔ اگلے سال وہ عمرہ کے لئے آئیں مگر صرف تین دن مکہ میں ٹھہریں اور اس کے بعد خاموشی سے واپس چلے جائیں۔ اس طرح کی ذلت آمیز دفعات مسلمانوں کو مشتعل کرنے کے لئے بالکل کافی تھیں۔ مگر آپ نے بظاہر شکست کے باوجود تمام دفعات کو منظور کر لیا۔
قریش نے اس موقع پر آپ کے ساتھ جو کچھ کیا آپ کو اشتعال دلانے کے لئے کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح آپ کو مشتعل کرکے آپ کی طرف سے کوئی جارحانہ اقدام کرا دیں تاکہ قریش کے لئے آپ سے لڑنے کا جواز نکل آئے۔ حرم کی زیارت سے روکنا یوں بھی عرب روایات کے خلاف تھا۔ مزید یہ کہ یہ ذوقعدہ کا مہینہ تھا جو عربوں میں حرام مہینہ شمار ہوتا تھا۔ اس میں جنگ ناجائز سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے اہل مکہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے اوپر جارحیت کی ذمہ داری ڈال کر ان سے جنگ کی جائے۔ مسلمان اس وقت کم تعداد میں تھے۔ ان کے پاس سامان جنگ نہیں تھا۔ وہ مرکز مدینہ سے ڈھائی سو میل دور اور دشمن کے مرکز (مکہ) کی عین سرحد پر تھے۔ قریش کے لئے بہترین موقع تھا کہ آپ کے اوپر بھرپور وار کرکے آپ کے خلاف اپنے دشمنانہ حوصلوں کو پورا کر سکیں۔ اسی لئے انھوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ کسی طرح آپ مشتعل ہو کر لڑ پڑیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر شرارت کو نظر انداز کرتے رہے اور کسی طرح اشتعال کی نوبت نہ آنے دی۔
یہ معاملہ اتنا سنگین تھا کہ حضرت ابوبکر کے سوا صحابہ کرام میں سے کوئی شخص نہ تھا جو یہ محسوس نہ کر رہا ہو کہ ہم ظالم کے آگے جھک گئے ہیں اور اپنے کو توہین آمیز شرائط پر راضی کر لیا ہے۔ قرآن میں جب اس معاہدہ کے

بارے میں آیت اتری کہ یہ فتح مبین ہے تو صحابہ نے کہا: کیا یہ فتح ہے۔ ایک مسلمان نے کہا: یہ کیسی فتح ہے کہ ہم بیت اللہ جانے سے روک دئے گئے۔ ہماری قربانی کے اونٹ آگے نہ جا سکے۔ خدا کے رسول کو حدیبیہ سے واپس آنا پڑا۔ ہمارے مظلوم بھائی (ابو جندل اور ابو بصیر) کو اس صلح کے تحت ظالموں کے حوالے کر دیا گیا۔ وغیرہ۔ مگر اسی ذلت آمیز صلح کے ذریعہ خدا نے فتح عظیم کا دروازہ کھول دیا۔

یہ معاہدہ بظاہر دشمن کے آگے جھک جانا تھا۔ مگر حقیقۃً وہ اپنے کو مضبوط اور مستحکم بنانے کا وقفہ حاصل کرنا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے تمام مطالبات منظور کر کے ان سے صرف ایک یقین دہانی لے لی۔ یہ کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان دس سال تک کوئی لڑائی نہ ہوگی۔ اب تک یہ تھا کہ مسلسل حالت جنگ کی وجہ سے تبلیغ و تعمیر کا کام رکا ہوا تھا۔ آپ نے حدیبیہ سے لوٹ کر فوراً دعوت و تبلیغ کا کام عرب اور اطراف عرب میں تیزی سے شروع کر دیا۔ ابتدائی زمین پہلے تیار ہو چکی تھی۔ پر امن حالات نے جو موقع دیا اس میں دعوت کا کام تیزی سے پھیلنے لگا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ اسلام قبول کرنے لگے۔ عرب قبائل ایک کے بعد ایک اسلام میں داخل ہونے لگے۔ عرب کے باہر ملکوں میں اسلام کی دعوت پھیلائی جانے لگی۔ مشرکین مکہ کی طرف سے مامون ہو کر آپ نے خیبر کے یہودیوں کے خلاف کارروائی کی اور ان کا خاتمہ کر دیا۔ دعوتی سرگرمیوں کے ساتھ داخلی استحکام اور تیاری کا کام بہت بڑے پیمانہ پر ہونے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صلح کے صرف دو سال بعد اسلام اتنا طاقت ور ہو گیا کہ قریش نے لڑے بھڑے بغیر ہتھیار ڈال دئے۔ جس مکہ سے توہین آمیز واپسی پر اپنے کو راضی کر لیا گیا تھا اسی مکہ میں اس واپسی سے فاتحانہ داخلہ کا راستہ نکل آیا۔

آج لوگوں کا حال یہ ہے کہ حریف کی طرف سے کوئی ناخوش گوار بات پیش آئے تو فوراً بھڑک اٹھتے ہیں اور اس سے لڑ جاتے ہیں۔ اور جب بے فائدہ لڑائی کے نقصانات بتائے جائیں تو کہتے ہیں کہ ہم خود سے نہیں لڑے۔ ہمارے خلاف سازش کر کے ہم کو جنگ میں الجھایا گیا۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ نہ لڑنا حقیقۃً اس کا نام نہیں ہے کہ کوئی لڑنے نہ آئے تو آپ نہ لڑیں۔ نہ لڑنا یہ ہے کہ لوگ لڑنے آئیں پھر بھی آپ ان سے نہ لڑیں۔ لوگ آپ کو اشتعال دلائیں مگر آپ مشتعل نہ ہوں۔ لوگ آپ کے خلاف سازشیں کریں مگر اپنی خاموش تدبیروں سے آپ ان کی سازش کو ناکام بنا دیں۔ لوگ آپ کے خلاف اپنے دلوں میں دشمنی لئے ہوئے ہوں تب بھی آپ ان کی دشمنی کو عمل میں آنے نہ دیں۔

زندگی کا اصل راز حریف سے لڑنا نہیں ہے۔ زندگی کا راز یہ ہے کہ لڑائی سے بچ کر اپنے آپ کو اتنا طاقت ور بنایا جائے کہ لڑائی کے بغیر محض دبدبہ سے حریف ہتھیار ڈال دے۔ جو لوگ مشتعل ہو کر لڑنا جانیں اور خاموش ہو کر تیاری کرنا نہ جانیں ان کے لئے یہاں صرف بربادی کا انجام ہے۔ ناممکن ہے کہ خدا کی دنیا میں وہ کامیاب ہو سکیں۔ کیسی عجیب بات ہے، جو کامیابی پیغمبر نے نہ ٹکرانے کی پالیسی اختیار کر کے حاصل کی اس کو ہم ٹکرانے کا طریقہ اختیار کر کے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ پھر بھی ہمارا یقین ہے کہ ہم رسول خدا کے امتی ہیں اور آپ ضرور خدا کے یہاں ہماری شفاعت فرمائیں گے۔

فتح مکہ کے بعد عرب کے قبائل کثرت سے مسلمان ہوئے۔ مگر یہ لوگ زیادہ تر اسلام کا سیاسی غلبہ دیکھ کر مسلمان ہوئے تھے۔ ان کے اندر وہ ذہنی وفکری انقلاب نہیں آیا تھا جو ابتدائی لوگوں میں آیا تھا۔ اسلام کے بعض احکام، خاص طور پر زکوٰۃ ان کی آزادانہ زندگی کے لئے ناقابل برداشت معلوم ہونے لگی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے چند ماہ پہلے یمن اور نجد کے علاقوں میں ان کے درمیان ایسے لیڈر ابھرے جو اسلام کا ایسا تصور پیش کرتے تھے جس میں زکوٰۃ کو منسوخ کر دیا گیا تھا۔ ان لیڈروں، مثلاً اسود اور مسیلمہ نے اپنی بات کو خدا کی بات ثابت کرنے کے لئے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ تاکہ جس الہامی زبان میں زکوٰۃ کو فرض کیا گیا ہے اسی الہامی زبان میں اس کی فرضیت کو ساقط کیا جا سکے۔ اس قسم کی "نبوت" ان قبائل کی پسند کے عین مطابق ثابت ہوئی جو زکوٰۃ کو اپنے اوپر ایک بوجھ خیال کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے جوق درجوق ان جھوٹے مدعیانِ نبوت کا ساتھ دینا شروع کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ان لوگوں کا حوصلہ اور بڑھا اور یہ فتنہ تیزی سے پھیلنے لگا۔ حتیٰ کہ یہ حال ہوا کہ مکہ، مدینہ اور طائف کے سوا تمام عرب میں بیشتر لوگ باغی ہو گئے۔ اسی کے ساتھ یہ خبریں بھی پھیلنے لگیں کہ یہ لوگ منظم ہو کر مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری زمانہ میں جو کام کئے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ آپ نے اسامہ بن زید کی قیادت میں ایک لشکر تیار کیا اور اس کو حکم دیا کہ وہ رومیوں کے مقابلہ کے لئے شام کی طرف جائے جہاں اس سے پہلے موتہ کے مقام پر رومیوں نے اسامہ کے والد حضرت زید کو شہید کیا تھا۔ یہ لشکر روانہ ہو کر ابھی مدینہ کے باہر پہنچا تھا کہ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر ملی اور وہ خلیفہ اول کے حکم کے انتظار میں وہیں ٹھہر گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت صدیق اکبر نے اس لشکر کو آگے روانہ کرنا چاہا تو بیشتر صحابہ نے اختلاف کیا۔ انھوں نے کہا کہ سارا عرب باغی ہو رہا ہے اور کسی بھی وقت مدینہ پر حملہ ہو سکتا ہے۔ ایسی حالت میں لشکر کو مدینہ کے دفاع کے لئے یہاں رکھنا چاہئے نہ کہ ایسے نازک موقع پر اس کو دور بھیج دیا جائے۔ مگر حضرت ابوبکر صدیق نے ایسی کسی رائے کو ماننے سے شدت کے ساتھ انکار کر دیا۔

تمام بڑے بڑے صحابہ اسامہ بن زید رض کی سرداری میں مدینہ کے باہر جمع تھے۔ اس وقت لوگوں کے اندر دو باتیں بحث کا موضوع بنی ہوئی تھیں۔ ایک یہ کہ اتنے نازک موقع پر اسلامی لشکر کا مدینہ سے دور

جانا حکمت کے خلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ اسامہ بن زید ایک غلام کے لڑکے تھے اس لئے بہت سے لوگوں کو ان کی سرداری پر انقباض تھا۔ نیز وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اسامہ ابھی صرف سترہ سال کے نوجوان ہیں اور ان کی ماتحتی میں بڑے بڑے صحابہ ہیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ کسی عمر قریشی کو سردار مقرر کر دیا جائے تو زیادہ بہتر ہو۔

عمر فاروق رض بھی ابتداءً اس لشکر میں شامل تھے، وہ لوگوں کا پیغام لے کر حضرت ابوبکر رض کے پاس روانہ ہوئے۔ حضرت ابوبکر نے پہلی بات سن کر فرمایا: لشکر کی روانگی کے بعد اگر میں مدینہ میں تنہا رہ جاؤں اور درندے مجھ کو پھاڑ کھائیں تب بھی میں ایک ایسے لشکر کی روانگی کو روک نہیں سکتا جس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روانہ فرمایا ہو۔ دوسرے پیغام کو سن کر آپ نے فرمایا "کیا ان کے دلوں میں ابھی تک جاہلی فخر و تکبر کا اثر باقی ہے"، یہ کہہ کر آپ اٹھے اور لشکر کو خود رخصت کرنے کے لئے پیدل چل کر لشکر گاہ تک پہنچے۔ اسامہ بن زید کو ان کے لشکر کے ساتھ روانہ کیا، جب اسامہ اپنی سواری پر چلے تو آپ ان کے ساتھ ساتھ باتیں کرتے ہوئے چلنے لگے۔ اسامہ نے کہا کہ یا تو آپ بھی سوار ہو جائیں، یا میں سواری سے اتر جاؤں۔ حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا: نہ میں سوار ہوں گا اور نہ تم کو سواری سے اترنے کی ضرورت ہے۔ یہ خلیفہ اول کی طرف سے گویا لوگوں کے سوال کا عملی جواب تھا۔ خلیفہ کو اسامہ کی رکاب میں چلتے دیکھ کر سب کا انقباض ختم ہو گیا۔

اسامہ کی سرکردگی میں صحابہ کا لشکر رومی علاقہ کی طرف روانہ ہوا تو اس کی خبریں چاروں طرف پھیل گئیں۔ بہت سے مخالفین کے لئے یہ مسلمانوں کے اعتماد کا مظاہرہ بن گیا۔ انھوں نے سوچا کہ مدینہ والوں کے پاس کافی طاقت ہوگی جبھی تو وہ اس نازک وقت میں اتنا بڑا لشکر دارالسلطنت سے دور بھیج رہے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے سوچا کہ مدینہ پر اقدام کرنے میں ہم کو توقف کرنا چاہئے۔ پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ مسلمانوں اور رومیوں کی جنگ کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اگر مسلمانوں کو اس جنگ میں شکست ہوتی ہے تو وہ اور زیادہ کمزور ہو جائیں گے اور اس کے بعد ان کے اوپر اقدام کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔

اسامہ بن زید کے لشکر کو رومیوں کے خلاف مہم میں زبردست کامیابی ہوئی۔ اس مہم میں ان کو چالیس دن لگے۔ اسامہ بن زید اس مہم کی قیادت کے لئے موزوں ترین شخص تھے۔ کیونکہ ان کے باپ زید بن حارثہ کو رومیوں نے موتہ کی جنگ میں شہید کیا تھا اور ان کے دل میں اپنے باپ کا انتقام لینے کا جذبہ بھڑک رہا تھا، اسامہ کی رہنمائی میں اسلامی لشکر انتہائی بے جگری سے لڑا اور رومیوں کو شکست دی۔ اس کے بعد وہ کافی قیدی اور مال غنیمت لے کر مدینہ واپس آئے۔ یہ دیکھ کر باغیوں کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ اور نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ ان کو زیر کر لیا گیا ــــ رسول کی پیروی ان کے لئے دشمنوں پر غلبہ کا ذریعہ بن گئی۔

بیہقی اور ابن عساکر نے حضرت عروہ ابن زبیر سے روایت کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ ذات السلاسل کے لئے ایک دستہ حضرت عمرو بن العاص کی سرداری میں بھیجا۔ یہ جگہ شام کے اطراف میں تھی۔ حضرت عمرو بن العاص جب وہاں پہنچے اور حالات معلوم کئے تو دشمن کی کثرت سے ان کو خوف پیدا ہوا۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغام بھیج کر مزید مدد طلب کی۔ آپ نے مہاجرین کو بلایا اور دو سو آدمیوں کا ایک دستہ تیار کیا۔ اس دستہ میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر وغیرہ بھی شامل تھے۔ آپ نے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کو کو اس دستہ کا امیر مقرر کیا اور حکم دیا کہ فوراً روانہ ہوں اور حضرت عمرو بن العاص سے جاکر مل جائیں۔

حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کا دستہ جب منزل پر پہنچا اور دونوں دستے ساتھ ہوگئے تو یہ سوال پیدا ہوا کہ دونوں کا امیر کون ہو۔ حضرت عمرو بن العاص نے کہا: میں تم سب کا امیر ہوں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی مدد کے لئے لکھا تھا تم لوگ اس کے مطابق میری مدد کے لئے بھیجے گئے ہو۔ حضرت ابو عبیدہ کے ساتھ جو مہاجرین آئے تھے انھوں نے اس کو نہیں مانا۔ انھوں نے حضرت عمرو بن العاص سے کہا: تم اپنے ساتھیوں کے امیر ہو اور ابوعبیدہ ہمارے امیر ہیں (بل انت امیر اصحابك وابوعبيدة امير المهاجرين) حضرت عمرو بن العاص اس تقسیم پر راضی نہیں ہوئے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ تمھاری حیثیت امدادی فوج کی ہے اور تم لوگ میرا ساتھ دینے کے لئے بھیجے گئے ہو (انما انتم امددت بكم فانا القائد) حضرت ابو عبیدہ بن الجراح نے جب یہ حال دیکھا تو کہا:

تعلم يا عمرو، ان آخر ما عهد الیّ رسول الله صلی الله عليه وسلم ان قال: اذا قدمت علی صاحبك فتطاوعا ولا تختلفا، وانك والله ان عصيتنی لاطعتك

اے عمرو تم پر واضح ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو رخصت کرتے ہوئے جو آخری عہد لیا وہ یہ تھا کہ جب تم اپنے ساتھی کے پاس پہنچو تو دونوں اتفاق کے ساتھ مل کر کام کرنا، باہم اختلاف نہ کرنا۔ پس خدا کی قسم اگر تم میری بات نہ مانو گے تب بھی میں تمھاری اطاعت کروں گا

راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد ابوعبیدہ نے امارت عمرو بن العاص کے حوالے کر دی اور ان کی ماتحتی میں کام کرنے پر راضی ہو گئے (فسلّم ابوعبيدة الامارة لعمرو بن العاص) البدایہ والنہایہ جلد ۴

اگر دونوں اپنا اپنا اصرار جاری رکھتے تو مسئلہ ختم نہ ہوتا اور جو طاقت دشمن سے مقابلہ کے لئے بھیجی گئی تھی وہ آپس میں لڑ کر فنا ہو جاتی۔ ایسے اختلافی مواقع پر ایک شخص کا جھکنا پوری جماعت کو طاقت ور بنا دیتا ہے اور ایک شخص کے نہ جھکنے سے پوری جماعت کمزور ہو جاتی ہے۔

۱۱

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سب سے آخری ابراہیم تھے۔ وہ ماریہ قبطیہ کے بطن سے ۹ ھ میں پیدا ہوئے تقریباً ۱۸ ماہ کی عمر میں ابراہیم کی وفات ہوگئی۔ جس دن ان کی وفات ہوئی اس دن سورج گرہن تھا۔ محمود پاشا فلکی کی تحقیق کے مطابق یہ ۲۹ شوال ۱۰ ھ کی تاریخ تھی۔ قدیم زمانہ میں گرہن کے متعلق طرح طرح کے توہماتی خیالات پھیلے ہوئے تھے۔ انھیں میں سے یہ تھا کہ جب کوئی بڑا آدمی مرتا ہے تو سورج گرہن یا چاند گرہن ہوتا ہے۔ ابراہیم کی وفات کے دن جب سورج گرہن پڑا تو لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ پیغمبر کے بیٹے کی موت کی وجہ سے یہ سورج گرہن ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے بتایا کہ موت کے واقعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ابوموسیٰ اشعری رضؓ کی روایت کے مطابق آپ نے فرمایا:

هٰذِهِ الآيَاتُ الَّتِي يُرْسِلُ اللّٰهُ لَا تَكُونُ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَلَا لِحَيَاتِهِ وَلٰكِنْ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهَا عِبَادَهُ فَاِذَا رَأَيْتُمْ شَيْئًا مِنْ ذٰلِكَ فَافْزَعُوا اِلٰى ذِكْرِهِ وَدُعَائِهِ وَاسْتِغْفَارِهِ (متفق علیہ)

یہ نشانیاں جو اللہ بھیجتا ہے وہ نہ کسی کی موت کی وجہ سے ہوتی ہیں اور نہ کسی کی زندگی کی وجہ سے بلکہ ان کے ذریعہ اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ پس جب تم اس قسم کی چیز دیکھو تو ڈر کے ساتھ اللہ کو یاد کرو اور اس کو پکارو اور اس سے مغفرت مانگو۔

سورج گرہن یا چاند گرہن محض اتفاقاً نہیں ہوتے بلکہ متعین فلکیاتی قانون کے تحت ہوتے ہیں۔ سورج اور چاند دونوں نہایت محکم قدرتی اصول کے مطابق حرکت کر رہے ہیں۔ اس حرکت کے دوران کبھی ایسا ہوتا ہے کہ زمین، سورج اور چاند کے درمیان آجاتی ہے، اس طرح سورج کی روشنی چاند تک نہیں پہنچ پاتی اور چاند گرہن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ چاند، زمین اور سورج کے درمیان آجاتا ہے، اس کے نتیجہ میں سورج کی روشنی زمین تک نہیں پہنچتی اور وہ صورت پیش آتی ہے جس کو سورج گرہن کہا جاتا ہے۔ گویا سورج گرہن کا مطلب سورج کا چاند کے اوٹ میں آجانا ہے اور چاند گرہن یہ ہے کہ زمین کے اوٹ میں آجانے کی وجہ سے سورج کی روشنی چاند تک نہ پہنچے۔ یہ جو کچھ ہوتا ہے معلوم فلکیاتی نظام کے مطابق ہوتا ہے۔ مثلاً ۱۶ فروری ۱۹۸۰ کو جو سورج گرہن پڑا وہ بہت پہلے سے فلکیات دانوں کو معلوم تھا اور نہایت صحت کے ساتھ اس کے اوقات متعین کئے جا چکے تھے اور انھیں متعین اوقات کے مطابق وہ شروع اور ختم ہوا۔ اس طرح کے گرہن برابر ہوتے رہتے ہیں۔ البتہ ان کے دکھائی دینے کے علاقے الگ الگ ہوتے ہیں۔ کہیں مکمل گرہن دکھائی دیتا ہے اور کہیں جزئی گرہن۔ مکمل سورج گرہن کے وقت سورج کی روشنی تقریباً ایک ہزار گنا کم ہو جاتی ہے۔

سنت یہ ہے کہ سورج گرہن اور چاند گرہن کے موقع پر نماز پڑھی جائے۔ یہ نماز اللہ کے آگے اپنے عجز اور بے بسی کا اظہار ہوتا ہے۔ سورج اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کے ذریعہ اللہ نے ہمارے لئے روشنی اور حرارت کا مستقل انتظام کیا ہے۔ سورج گرہن یہ بتانے کے لئے ہوتا ہے کہ جس خدا نے اس کو روشن کیا ہے وہی اس کو ماند بھی کر سکتا ہے۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ جس نعمت کو جب چاہے واپس لے لے۔ اس لئے جب گرہن ہو تو آدمی کو چاہیے کہ اللہ کو یاد کرے۔ اللہ کے مقابلہ میں اپنی محتاجی کا تصور کر کے اللہ کے آگے گر پڑے۔ وہ پکار اٹھے کہ "خدایا اگر تو سورج کو بجھا دے تو کوئی اس کو جلانے والا نہیں۔ اگر تو ہم کو روشنی

اور حرارت سے محروم کردے تو کوئی ہم کو روشنی اور حرارت دینے والا نہیں "۔

" گرہن "، کا یہ معاملہ صرف چاند اور سورج کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اس قسم کے واقعات اللہ کی دوسری نعمتوں کے ساتھ بھی مختلف صورتوں میں پیش آتے ہیں صحت کے ساتھ بیماری گویا جسم کا گرہن ہے اور اچھے موسم کے ساتھ خراب موسم گویا فضا کا گرہن ۔ اس طرح ایک ملی ہوئی نعمت کو تھوڑی دیر کے لئے روک کر اس کے نعمت ہونے کا احساس دلایا جاتا ہے تاکہ آدمی کے اندر شکر کا جذبہ ابھرے اور وہ یہ سوچے کہ اگر اللہ اس کو مستقل طور پر چھین لے تو آدمی کا کیا حال ہوگا۔ اللہ کو اپنے بندوں سے سب سے زیادہ جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ وہ اپنے رب سے ڈریں۔ انسان کو ڈرنے والا بنانے کے لئے جو اہتمام کئے گئے ہیں ان میں سے ایک قسم کا اہتمام وہ ہے جس کو "گرہن" کہا جاتا ہے۔

زمین مسلسل حرکت میں ہے۔ اس کے علاوہ زمین کے گولے کا اندرونی حصہ نہایت گرم پگھلے ہوئے مادہ کی صورت میں ہے جو ہر وقت کھولتے ہوئے پانی کی طرح جوش میں رہتا ہے۔ اس کے باوجود ہمارے قدموں کے نیچے زمین کی سطح بالکل ٹھہری ہوئی حالت میں ہے ۔ یہ ہمارے لئے بہت بڑی نعمت ہے ۔ مگر عام حالات میں ہم کو اس کے نعمت ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ اس لئے کبھی کبھی بھونچال کے ذریعہ زمین کی اوپری سطح کو ہلا دیا جاتا ہے تاکہ آدمی یہ جانے کہ خدا نے اس کے لئے تباہ کن لاوا کو کس طرح بند کر رکھا ہے۔ اگر وہ اس کو آزاد کر دے تو انسان کا کیا حال ہو۔ اسی طرح بارش ایک عجیب و غریب نعمت ہے ۔ سورج کے اثر سے پانی کے بخارات کا اٹھ کر اوپر جانا، ان کا بدلیوں کی صورت میں جمع ہونا اور پھر ہوا کے ذریعہ جگہ جگہ باران رحمت بن کر نازل ہونا اور پھر زمین کو سرسبز و شاداب کرنا، یہ سب رحمت خداوندی کے عجیب و غریب کرشمے ہیں جو وہ مستقل طور پر اپنے بندوں کے لئے کرتا رہتا ہے۔ مگر خود بخود ملتے رہنے کی وجہ سے آدمی اس نعمت کی قدر بھول جاتا ہے اس لئے کبھی کبھی زمین پر خشک سالی پیدا کی جاتی ہے تاکہ آدمی کا شعور جاگے اور وہ خدا کی نعمت کی قدر کر سکے۔ ہوا کیسی عجیب و غریب نعمت ہے ۔ ہوا ہر آن ہم کو تازہ آکسیجن پہنچا رہی ہے ۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے خدائی پنکھے کی طرح ہم کو فرحت بخشتے رہتے ہیں ۔ ہوا بارش کے نظام کو درست کرتی ہے۔ ہوا کے بے شمار فائدے ہیں ۔ مگر جس طرح وہ ہماری آنکھوں کو نظر نہیں آتی اسی طرح اس کی اہمیت بھی ہمارے شعور سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ اس لئے کبھی کبھی ہوا کو طوفان بنا دیا جاتا ہے تاکہ آدمی یہ جانے کہ ہوا کی صورت میں اللہ نے اس کی زندگی کے لئے کیسا حیران کن انتظام کر رکھا ہے۔ اسی طرح ہر چیز کا ایک "گرہن" ہے اور وہ اس لئے آتا ہے کہ آدمی کے اندر نعمت کے احساس کو جگائے۔

قرآن (واقعہ) میں ارشاد ہوا ہے : " اس چیز کو دیکھو جس کو تم بوتے ہو تم اس سے کھیتی اگاتے ہو یا ہم ہیں اس کو کھیتی بنانے والے ۔ اگر ہم چاہیں تو اس کو بھس بنا کر رکھ دیں پھر تم باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم قرضدار ہو گئے ۔ بلکہ ہم تو بالکل محروم ہو گئے۔ پانی کو دیکھو جس کو تم پیتے ہو۔ کیا تم نے اس کو بادل سے اتارا ہے یا ہم ہیں اتارنے والے ۔ اگر ہم چاہیں تو اس کو کھاری کر دیں پھر کیوں تم شکر نہیں کرتے ۔ آگ کو دیکھو جس کو تم جلاتے ہو۔ کیا تم نے اس کا درخت پیدا کیا ہے یا ہم ہیں اس کے پیدا کرنے والے۔ ہم نے ہی اس کو بنایا ہے یاد دلانے کے لئے اور تمھارے برتنے کے لئے۔ پس اللہ کے نام کی پاکی بیان کرو جو سب سے بڑا ہے "۔ ہماری پوری زندگی ایسی خدائی نعمتوں کے اوپر زبر ہے جو کسی بھی لمحہ واپس لی جا سکتی ہیں۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے خالق و مالک کا شکر گزار رہے تاکہ وہ اپنی نعمتوں سے کبھی اس کو محروم نہ کرے۔ یہ شکر گزاری ہی آدمی کو خدا کی نعمتوں کا مستحق بناتی ہے، موجودہ دنیا میں بھی اور موت کے بعد آنے والی آخرت میں بھی ۔

احمد اور طبرانی نے حضرت عائشہ کی ایک روایت مختلف الفاظ میں نقل کی ہے۔ بعد کے زمانہ میں حضرت عائشہ نے ایک شخص کو وہ احوال بتائے جو ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل خاندان پر گزرے تھے۔ انھوں نے ایک رات کو ٹٹول کر کام کرنے کا ذکر کیا۔ اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں:

نقلت یا ام المومنین علی مصباح۔ قالت لو کان عندنا دھن غیر مصباح لاکلناہ

(الترغیب والترہیب، جلد ۵)

راوی کہتے ہیں۔ میں نے حضرت عائشہ سے چراغ کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا: اگر ہمارے پاس چراغ جلانے کے لئے تیل ہوتا تو چراغ جلانا تو درکنار ہم اس کو بھوک کی وجہ سے پی جاتے۔

ہجرت کے بعد جس بستی کو مدینۃ الرسول اور مدینہ طیبہ کا لقب ملا وہاں اس وقت ایک بھی پکا مکان نہ تھا۔ مسجد نبوی بس ایک بڑا سا چھپر تھی جس کو چاروں طرف سے مٹی اور کھجور کے پتوں سے گھیر دیا گیا تھا۔ مسجد میں رات کے وقت روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ مسجد نبوی میں ہجرت کے نویں سال چراغ جلایا گیا ہے۔ پہلا شخص جس نے مدینہ کی مسجد نبوی میں رات کو چراغ جلایا وہ تمیم داری ہیں۔ تمیم داری نے ۹ھ میں اسلام قبول کیا ہے اس وقت مکہ فتح ہو چکا تھا اور تقریباً سارا عرب اسلام میں داخل ہو چکا تھا۔

جب مسلمانوں کے پاس اپنے گھروں کو روشن کرنے کے لئے چراغ نہ تھے اور مسجدمیں رات کے وقت اندھیرا رہتا تھا تو اسلام اور مسلمانوں کو دنیا میں عزت وغلبہ حاصل تھا۔ آج مسلمانوں کے گھر روشن ہیں۔ ان کی مسجدیں جدید طرز کے قمقموں سے جگمگا رہی ہیں مگر دنیا میں اسلام کا غلبہ نہیں، مسلمانوں کو کہیں عزت حاصل نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عزت وغلبہ کا مقام حاصل کرنے کے لئے اصل اہمیت انسان کی ہوتی ہے۔ آج مسلمانوں کے یہاں سب کچھ ہے مگر وہی چیز نہیں جس کو "انسان" کہا جاتا ہے۔ اسلامی دنیا مردہ روحوں کا ایک عظیم قبرستان معلوم ہوتی ہے جہاں روشنیوں کی رونقیں اور درودیوار کی عظمتیں تو بہت ہیں مگر وہ انسان نہیں جو خدا کے لئے تڑپے، جو سچائی کے آگے جھک جائے، جو آخرت کی خاطر اپنی دنیا کو قربان کرسکے، جو اپنی خواہشوں کو برتر اصولوں کے تابع کر دے۔ اسلام کو سربلند کرنے کے لئے وہ انسان درکار ہیں جن کو عظمت خداوندی کے احساس نے پست کر رکھا ہو، جن کا خوف آخرت ان سے ان کی اکڑ چھین لے۔ اور یہی وہ انسان ہیں جو اسلام کے بھرے ہوئے شان دار پنڈال میں آج کہیں موجود نہیں۔

قدیم عرب کے شمال اور جنوب کے زرخیز حصے اس زمانہ کی دو بڑی شہنشاہیتوں ساسانی سلطنت اور بازنطینی سلطنت کے قبضہ میں تھے۔ شمال میں عمارت غساسنہ اور امارت بُصریٰ تھی۔ یہ دونوں بازنطینی سلطنت (رومیوں) کے ماتحت تھیں اور یہاں ان کی طرف سے عرب سردار حکومت کرتے تھے۔ رومی اثرات کے تحت یہاں کی اکثر آبادی مسیحی مذہب اختیار کر چکی تھی، عرب کے جنوب میں امارت بحرین، امارت عمان، امارت یمامہ تھی۔ یہ ریاستیں ساسانی سلطنت (ایرانیوں) کے ماتحت تھیں اور ان کے اثر سے یہاں کے باشندوں میں مجوسیت پھیلی ہوئی تھی۔

۶ھ میں جب حدیبیہ میں قریش سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ ہوا اور حالات پرامن ہوگئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے اطراف میں واقع سلطنتوں کو دعوتی مراسلے بھیجنے شروع کئے۔ اس سلسلے میں ایک مراسلہ حارث بن ابی شمر غسانی کے نام تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر شجاع بن وہب آپ کا مراسلہ لے کر اس کے پاس گئے۔ اس مراسلہ میں یہ بھی تھا کہ اللہ پر ایمان لاؤ تمہاری حکومت باقی رہے گی (یبقی لک ملکک) اس نے مکتوب نبوی میں یہ جملہ پڑھا تو اس کو غصہ آگیا۔ اس نے خط کو زمین پر پھینک دیا اور کہا: میری حکومت مجھ سے کون چھین سکتا ہے (من ینزع ملکی منی)

حاکم بُصریٰ شرحبیل بن عمرو غسانی نے اس سے بھی زیادہ بیہودہ سلوک کیا۔ اس رومی گورنر کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر حارث بن عمیر ازدی آپ کا خط لے کر گئے تھے، وہ سرحد شام پر قصبہ موتہ میں داخل ہوئے تھے کہ حاکم بصریٰ کے اشارہ پر ایک اعرابی نے آپ کے سفیر کو قتل کر دیا۔

بین اقوامی روایات کے مطابق یہ واقعہ ایک ملک پر دوسرے ملک کی جارحیت کے ہم معنی تھا۔ مختلف قرائن یہ بھی ظاہر کر رہے تھے کہ شام کی فوجیں پیش قدمی کر کے مدینہ میں داخل ہو جانا چاہتی ہیں۔ رومی شہنشاہیت اس کو برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ عرب میں کوئی آزاد حکومت قائم ہو اور ترقی کرے۔

حارث بن عمیر کے قتل کی خبر مدینہ پہنچی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فوجی جواب دینا ضروری سمجھا۔ آپ نے حکم دیا کہ مسلمان اپنے اپنے ہتھیار لے کر موضع جرف میں جمع ہو جائیں۔ چنانچہ تین ہزار کی تعداد میں اسلامی لشکر اکٹھا ہو گیا۔ آپ نے اس لشکر پر زید بن حارثہ کو سردار مقرر کیا اور ضروری نصیحتیں کرنے کے بعد ان کو شام کی طرف روانہ کیا۔

اسلامی لشکر نے معان (شام) پہنچ کر قیام کیا۔ دوسری طرف حاکم بصریٰ بھی جنگ کے لئے تیار ہو گیا۔ اس کی حوصلہ افزائی اس واقعہ سے بھی ہوئی کہ اتفاق سے ہرقل انھیں دنوں مآب (بلقاء) میں آیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک لاکھ مسلح فوج تھی۔ نیز اس علاقے کے عیسائی قبائل لخم، جذام، قین، بھراء، بلی بھی مسیحی حمیت کے جوش میں اٹھ کھڑے ہوئے اور بنی بلی کے سردار مالک بن زافلہ کی قیادت میں لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس طرح شامی محاذ پر ایک لاکھ سے بھی زیادہ کا لشکر جمع ہو گیا جبکہ مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی۔

یہ جنگ جو جمادی الاولیٰ ۸ھ میں ہوئی، اس میں زید بن حارثہ دشمنوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ اس کے بعد

جعفر بن ابی طالب اور عبداللہ بن رواحہ بھی قیادت کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ مسلمانوں کا جھنڈا گر جانے سے انتشار کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس وقت لشکر اسلام کے ایک سپاہی ثابت بن اقرم نے بڑھ کر جھنڈا اٹھالیا اور بلند آواز سے کہا:

"مسلمانو! کسی ایک شخص کو امیر بنانے پر اتفاق کر لو"

مسلمان فوجیوں کی طرف سے آواز آئی رضینا بک (ہم تمہاری سرداری پر راضی ہیں) ثابت ابن اقرم نے جواب دیا: ما انا بفاعل فاتفقوا علی خالد بن الولید (میں یہ کام نہ کر سکوں گا تم لوگ خالد بن ولید کو اپنا سردار بنالو) اب آواز بلند ہوئی: ہم کو خالد بن ولید کی سرداری منظور ہے۔ یہ سنتے ہی خالد بن ولید نے آگے بڑھ کر جھنڈا اپنے ہاتھ میں لے لیا اور رومی لشکر پر حملہ کر کے اس کو پیچھے دھکیل دیا۔

تاہم یہ جنگ فیصلہ کن طور پر ختم نہیں ہوئی تھی۔ ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ رومیوں کی مدد سے غساسنہ مدینہ پر چڑھ آئیں اور اس نومولود ریاست کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ ذی الحجہ ۵ھ میں بنو قریظہ کے خاتمہ کے بعد جب مدینہ میں بعض معاشی مسائل پیدا ہوئے اور ازواج رسول نے اضافہ نفقہ کا مطالبہ کیا تو آپ کو بہت رنج ہوا اور آپ نے ایک مہینہ تک گھر کے اندر نہ آنے کی قسم کھالی۔ اس سلسلے میں تاریخ میں آتا ہے کہ جب ایک صحابی عمر فاروق سے ملے اور ان سے کہا: "کچھ سنا آپ نے" تو عمر فاروق کی زبان سے فوراً نکلا: "کیا غساسنہ آگئے" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں غسانیوں کی طرف سے مدینے کے لئے کتنا خطرہ لاحق تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مسئلہ کا شدید احساس تھا۔ چنانچہ اپنی عمر کے آخری ایام میں جن امور کے لئے آپ نے شدت سے اہتمام کیا، ان میں غساسنہ یا بالفاظ دیگر رومیوں سے مقابلہ کے لئے فوج کی تیاری بھی تھی۔ آپ نے اس مقصد کے لئے ایک فوج ترتیب دی۔ اس فوج میں اگرچہ ابوبکر و عمر جیسے بڑے بڑے اصحاب تھے مگر آپ نے انتہائی دانش مندی سے کام لیتے ہوئے اس لشکر کا سردار اسامہ بن زید کو مقرر کیا۔ اسامہ نہ صرف ایک بہادر نوجوان تھے بلکہ ان کے دل میں رومیوں سے انتقام کا شدید جذبہ بھی موجزن تھا۔ کیونکہ موتہ کی جنگ میں رومیوں نے ان کے والد زید بن حارثہ کو قتل کیا تھا۔

تاہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں یہ لشکر روانہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ عین وقت پر آپ کے اوپر مرض الموت کا غلبہ ہو گیا۔ آپ کی وفات کے بعد صدیق اکبر نے خلیفہ اول کی حیثیت سے اس لشکر کو شام کی طرف روانہ کیا۔

یہ روانگی بھی اسلامی تاریخ کا حیرت انگیز واقعہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہر طرف سے ارتداد کی خبریں آنے لگیں۔ لوگوں نے خلیفہ اول کو مشورہ دیا کہ اب جبکہ مرکز اسلام خطرہ میں پڑ گیا ہے اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں اس لشکر کی روانگی کو ملتوی کر دیا جائے مگر صدیق اکبر کا یہ جواب لوگوں کو خاموش کرنے کے لیے کافی تھا:

"اگر مجھ کو یقین ہو کہ لشکر کی روانگی کے بعد مجھ کو مدینہ میں کوئی درندہ تنہا پاکر پھاڑ ڈالے گا، تب بھی میں اس لشکر کی روانگی کو ملتوی نہیں کر سکتا جس کو خود رسول اللہ نے ترتیب دیا ہو" صدیق اکبر کی یہ ایمانی جرأت کام آئی۔ اسامہ کا لشکر نہ صرف رومیوں کے مقابلہ میں کامیاب ہوا بلکہ رومی شہنشاہیت کے مقابلہ میں مسلمانوں کی فتح نے مرتدین کی بھی حوصلہ شکنی کی اور

نسبتاً آسانی کے ساتھ وہ مغلوب کر لیے گئے۔

اس واقعہ میں ایک اور بہت بڑی حکمت شامل تھی، عرب قبائل ہمیشہ سے آپس میں لڑتے چلے آرہے تھے شدید اندیشہ تھا کہ اپنی قوتوں کے اظہار کا دوسرا میدان نہ پاکر وہ دوبارہ آپس میں لڑنے لگیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت عرب طاقت کو رومی شہنشاہیت سے متصادم کرکے اس کا جواب فراہم کر دیا۔ اب عربوں کی جنگجو فطرت کے لیے ایک بہترین میدان مل چکا تھا۔ چنانچہ تاریخ نے دیکھا کہ وہ لوگ جو اپنے ہم وطنوں کی قتل وغارتگری کے سوا کچھ نہ جانتے تھے انھوں نے ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں ایک پوری دنیا کو فتح کر ڈالا۔

جان بیگٹ گلب پاشا نے اپنی کتاب دی لائف اینڈ ٹائمز آف محمد میں اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"عرب نامعلوم زمانے سے ایک دوسرے کے ساتھ جنگ وجدل میں زندگی بسر کرنے کے عادی رہے تھے۔ یہ جنگ وجدل کسی خاص سبب کا نتیجہ نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ ان کی طرز زندگی میں داخل تھی۔ اب جبکہ وہ بحیثیت مسلمان ایک دوسرے سے لڑنے بھڑنے سے روک دیئے گئے تھے یہ کیسے ممکن تھا کہ فوجی ذہنیت کے قبائلی آدمیوں کو ہمیشہ کے لیے پرامن زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا جائے؟ پیغمبر اسلام نے خود اس مہم کو روانہ کرکے جس نے موتہ میں شکست کھائی تھی اس سوال کا حل پیش کر دیا تھا۔

۶۳۴ء کے سرما میں تین عرب کالموں نے فلسطین اور شام پر حملہ کر دیا اسی اثناء میں مشرقی عرب کے قبیلوں نے جو حیرہ کی لخمی ریاست کی ضبطی کے بعد سے ایران کے دشمن بنے ہوئے تھے، فرات کی طرف پیش قدمی کر کے حیرہ پر قبضہ کر لیا۔ ۲۰ اگست ۶۳۶ء کو بازنطینی (رومی) قوت نے یرموک کے میدان میں مکمل شکست کھائی اور شام کا تمام علاقہ طورس تک عربوں کے قبضہ میں آگیا۔ فروری، ۶۳۷ء میں ایرانی فوج قادسیہ کے مقام پر جو حیرہ سے چند میل کے فاصلہ پر تھا مکمل طور پر تباہ کر دی گئی اور قدیم عراق بشمول ایرانی دارالسلطنت مدائن جو دجلہ کے جنوب میں موجودہ بغداد کے قریب واقع تھا، عربوں کے زیر تسلط آگیا۔ ۶۴۰ء میں مصر پر حملہ ہوا اور ایک بار پھر بازنطینی حکومت شکست یاب ہوئی اور ستمبر ۶۴۲ء تک پورے مصر پر عرب قبضہ مکمل ہوگیا۔ اسی سال بچی کھچی ایرانی فوج نہاوند کے مقام پر تباہ کر دی گئی اور ایرانی سلطنت کا پورے طور پر خاتمہ ہوگیا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد پہلے خلیفہ راشد رضی اللہ عنہ نے، انتہائی نازک حالات کے باوجود حضرت اسامہ کے لشکر کو رومیوں کی طرف بھیجا۔ یہ مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کے لیے ایک عظیم سبق تھا: مسلمانوں کیلئے طاقت آزمائی کا میدان خارجی دنیا ہے نہ کہ داخلی دنیا۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہ اہم ترین سبق بعد کے زمانہ میں مسلمان بھول گئے۔ خاص طور پر موجودہ زمانہ میں تو یہ حال ہے کہ مسلم ممالک دو گروہوں (ترقی پسند اور قدامت پسند) میں بٹ کر ایک دوسرے کے حریف بنے ہوئے ہیں۔ ان کی مسلح فوجیں اپنے ہی ملکوں کو "فتح" کرنے میں مشغول ہیں، مسلم جماعتیں خود اپنے ملکوں کی حکومتوں سے نبرد آزما ہیں۔ باہر کے حریفوں سے مقابلہ کے لیے ہر ایک عاجز ہے اور اپنے بھائیوں سے لڑنے کے لیے ہر ایک بہادر بنا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں اگر اسلام کی توسیع واشاعت کا کام رک جائے تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے۔

مشہور روایات کے مطابق، کعبہ کی تعمیر چار بار ہوئی ہے۔ پہلی بار جب کہ حضرت ابراہیم نے اپنے صاحب زادہ اسمٰعیل کی مدد سے اسے بنایا۔ دوسری بار اسلام سے پہلے قریش نے بنایا جب کہ بارش کی کثرت سے وہ گر گیا تھا۔ اس تعمیر ثانی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی قبل از نبوت شریک تھے۔ قریش نے اس کے طول میں چھ ہاتھ کے بقدر کمی کر دی جہاں اب حطیم واقع ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کے بارے میں حضرت عائشہ سے فرمایا کہ تمہاری قوم اگر جلد ہی جاہلیت سے نہ نکلی ہوتی تو میں کعبہ کو گرا کر دوبارہ بنار ابراہیم پر تعمیر کر دیتا اور اس کے دو دروازے بنا دیتا۔ ایک پورب میں، دوسرا پچھم میں (جامع الاصول، جزء ۹ صفحہ ۲۹۷)

تیسری تعمیر ۶۴ھ میں یزید بن معاویہ کے زمانہ میں ہوئی۔ یزید بن معاویہ کی شامی فوج نے حصین بن نمیر کی قیادت میں عبداللہ بن الزبیر کا مکہ میں محاصرہ کیا اور کعبہ پر منجنیق سے پتھر پھینکے جس کی وجہ سے کعبہ میں آگ لگ گئی اور وہ گر گیا۔ اس کے بعد عبداللہ بن زبیر نے اس کی تعمیر کرائی۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ بالا حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے اس کو دوبارہ بنار ابراہیم پر تعمیر کرایا اور اس میں دو دروازے کھول دئے کہ آدمی ایک دروازے سے داخل ہو اور دوسرے دروازے سے باہر آئے۔ عبداللہ بن زبیر کے قتل کے بعد حجاج نے خلیفہ عبدالملک بن مروان کو صورت حال سے باخبر کیا۔ عبدالملک بن مروان نے حکم دیا کہ ہم عبداللہ بن زبیر کے عمل کے پابند نہیں ہیں۔ تم کعبہ کو دوبارہ سابقہ بنیاد پر تعمیر کراؤ اور وہ دوسرا دروازہ بند کرادو جو عبداللہ بن زبیر نے کھولا ہے۔ یہ کعبہ کی چوتھی تعمیر تھی (جامع الاصول، جزء ۹ صفحہ ۲۹۷)

خلیفہ ہارون الرشید کا زمانہ آیا تو اس نے ارادہ کیا کہ کعبہ کو پھر سے اس طرح تعمیر کرائے جس طرح عبداللہ بن زبیر نے تعمیر کرایا تھا۔ اس وقت امام مالک بن انس نے خلیفہ سے کہا:

انشدك الله يا امير المومنين ان لا تجعل هذا البيت ملعبة للملوك بعدك، لا يشاء احد منهم ان يغيره الا غيره۔ فتذهب هيبته من قلوب الناس فصرفه عن رأيه (فتح الباری)

اے امیر المومنین، میں آپ کو خدا کی قسم دلاتا ہوں کہ اس گھر کو اپنے بعد بادشاہوں کا کھیل نہ بنا دیجئے کہ جو بھی چاہے اس میں تغیر و تبدل کرتا رہے۔ پس اس کی ہیبت لوگوں کے دلوں سے جاتی رہے۔ اس طرح امام مالک نے خلیفہ ہارون رشید کو اس کی رائے پر عمل کرنے سے روک دیا۔

روایات کو توڑے بغیر خاموشی کے ساتھ انقلاب لانا پیغمبرانہ طریق کار کا ایک اہم اصول ہے۔ سماجی زندگی میں روایات کی بے حد اہمیت ہوتی ہے۔ بیشتر لوگ روایات کے سہارے چلتے ہیں۔ روایات اگر اچانک توڑ دی جائیں تو عام لوگوں کے لئے اخلاقیات کا کوئی سہارا باقی نہیں رہتا۔

کسی سماج میں روایات ہمیشہ صدیوں کی تاریخ سے بنتی ہیں۔ کسی نے بجا طور پر کہا ہے کہ ایک چھوٹی سی روایت بنانے کے لئے بہت لمبی تاریخ درکار ہوتی ہے:

It requires a lot of history to make a little tradition

یہی وجہ ہے کہ پیغمبر تدریجی حکمت کے تحت اصلاح لے آتا ہے نہ کہ پُرشور تبدیلیوں کے طریقے سے۔

سنتِ رسول

سنت عربی زبان میں طریقہ کو کہتے ہیں۔ اس سے مراد خدا کا وہ پسندیدہ طریقہ ہے جو رسول کے ذریعہ انسان کو بتایا گیا۔ قرآن میں یہ لفظ شریعت خداوندی کے تمام طریقوں کے لئے آیا ہے۔ اسلامی معاشرت کے احکام بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

يُرِيدُ اللهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَاللهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (نساء ۲۶)	اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے واسطے بیان کرے اور تم کو ان لوگوں کا طریقہ بتا دے جو تم سے پہلے تھے اور تمھارے اوپر توجہ کرے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

اللہ نے جب دنیا بنائی تو اسی وقت یہ بھی طے کر دیا کہ اس دنیا کی کارکردگی کے لئے اس کا پسندیدہ طریقہ کیا ہوگا۔ اس طریقہ کو خدا نے بقیہ دنیا میں بزور اس طرح نافذ کر دیا کہ کوئی چیز اس سے ذرا بھی ہٹ نہیں سکتی۔ مگر انسان کو خدا نے اس کا پابند نہیں کیا۔ انسان کو سوچنے اور کرنے کی آزادی دے کر فرمایا کہ تم میں سے جو لوگ اپنی آزاد مرضی سے میرے پسندیدہ طریقہ پر چلیں گے ان کے لئے میرے یہاں جنت کے باغ ہیں اور جو لوگ اس سے انحراف کریں گے ان کے لئے دوزخ کی آگ۔

خدا کے اسی پسندیدہ طریقہ کو انسانوں کے سامنے واضح کرنے کے لئے خدا کے رسول آئے۔ رسول نے زبانی بھی بتایا اور برت کر عملاً بھی دکھا دیا کہ خدا کی پسند کے مطابق زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو رسول کی سنت کہا جاتا ہے۔ رسول کی سنت کا تعلق مسواک اور غسل جیسے معاملات سے بھی ہے اور ملی تعمیر اور اجتماعی اصلاح جیسے معاملات سے بھی۔ جو لوگ اللہ کے یہاں اس کے مقبول بندوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ اپنے تمام معاملات میں رسول کی سنت کی پیروی کریں۔ اپنی زندگی کے کسی معاملہ کو اس سے آزاد یا غیر متعلق نہ سمجھیں۔

رسول کی انفرادی سنتوں میں سے اہم ترین سنت دعوت الی اللہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو صبح و شام سب سے زیادہ فکر جس بات کی ہوتی تھی وہ یہ کہ آپ خدا کے بندوں کو خدا کے دین کی طرف لے آئیں۔ اس معاملہ میں آپ اتنا زیادہ فکرمند رہتے تھے کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: شاید تم اس غم میں اپنے کو ہلاک کر ڈالو گے کہ لوگ ایمان نہیں لاتے (لعلک باخع نفسک ان لا یکونوا مومنین)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو میری سنت سے بے رغبت ہو وہ مجھ میں نہیں (فمن رغب عن سنتی فلیس منی) اس حدیث کا تعلق جس طرح نکاح اور اس قسم کے دوسرے معاملات سے ہے، ٹھیک اسی طرح دعوت الی اللہ سے بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو اختیار کرنے والا وہی ہے جو دوسری چیزوں کے ساتھ اللہ کی طرف لوگوں کو بلانے کے معاملہ میں بھی آپ کے طریقہ کی پیروی کرے۔

رسول کی اجتماعی سنتوں میں سے ایک سنت تدریج یا حقیقت پسندی ہے۔ یعنی نظریاتی معیاروں کے نفاذ میں حقیقی حالات و واقعات کی رعایت۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتماعی اصلاح کے تمام معاملات میں ہمیشہ تدریجی حکمت کے مطابق عمل کیا ہے۔ آج کل کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا طریقہ انقلابی (Revolutionary) نہیں تھا بلکہ ارتقائی (Evolutionary) تھا۔ حضرت عائشہ رضی ایک روایت میں اسی بات کو اس طرح بتاتی ہیں:

انما نزل اول ما نزل سورۃ من المفصل فیھا ذکر الجنۃ والنار حتی اذا ثاب الناس الی الاسلام نزل الحلال والحرام ولو نزل اول ما نزل لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابدا ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابدا

قرآن میں سب سے پہلے مفصل سورتیں اتریں جن میں جنت اور جہنم کا تذکرہ ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگوں کے دل اسلام کے لئے ہموار ہوگئے تو حرام و حلال کی آیتیں اتریں۔ اگر پہلے ہی یہ اترتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے۔ اور اگر پہلے ہی اترتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہ چھوڑیں گے

(بخاری باب تالیف القرآن)

رمضان ۸ھ میں مکہ فتح ہوا۔ اس کے بعد عرب کا مرکزِ قیادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں آگیا۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ آپ نے بیت اللہ سے متعلق شرعی احکام کا فوری نفاذ نہیں فرمایا۔ بلکہ جو کچھ کرنا تھا تدریج کے ساتھ کیا۔ فتح مکہ کے بعد اسلامی اقتدار قائم ہونے کے باوجود ۸ھ میں جو حج ہوا

وہ بدستور قدیم جاہلی رواج کے مطابق ہوا۔ اس کے بعد ۹ھ میں اسلامی دور کا دوسرا حج اس طرح کیا گیا کہ مسلمانوں نے اپنے طریقہ پر حج کیا اور مشرکین نے اپنے طریقہ پر۔ پھر جب ۱۰ھ میں تیسرا حج آیا تو آپ کے حکم کے مطابق اس کو خالص اسلامی طریقہ پر انجام دیا گیا۔ یہی دورِ اسلامی کا تیسرا حج ہے جو اسلامی تاریخ میں حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔

طبعی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات سخت ناپسند تھی کہ مشرکین بیت اللہ میں آئیں اور اپنے مشرکانہ رواج کے مطابق حج کے مراسم ادا کریں۔ مگر اقتدار حاصل ہونے کے باوجود آپ نے شریعت کے نفاذ میں جلدی نہیں کی۔ فتح مکہ کے بعد دو سال تک آپ حج کی ادائگی کے لئے مکہ نہیں گئے۔ حج کا موسم آیا تو آپ نے فرمایا: مشرکین بیت اللہ میں آئیں گے اور ننگے ہوکر حج کریں گے۔ مجھے پسند نہیں کہ میں حج کروں جب تک یہ چیزیں ختم نہ ہو جائیں (انما یحضر المشرکون فیطوفون عراۃ فلا احب ان احج حتی لا یکون ذلک، تفسیر ابن کثیر، سورہ توبہ)

فتح مکہ کے بعد پہلے سال (۸ھ) میں مسلمانوں نے حج کیا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہیں لے گئے۔ دوسرے سال (۹ھ) میں آپ نے مسلمان حاجیوں کا قافلہ حضرت ابوبکر کی قیادت میں مدینہ سے مکہ روانہ کیا۔ اس کے بعد قرآن میں یہ حکم اترا کہ مشرکین نجس ہیں، اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب نہ آئیں (توبہ ۲۸) چنانچہ آپ نے حضرت علی کو مکہ بھیجا اور حکم دیا کہ حج کے اجتماع میں گھوم گھوم کر یہ اعلان کردیں کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لئے نہ آئے اور اب سے کوئی شخص ننگی حالت میں کعبہ کا طواف نہ کرے (لا یحج بعد العام مشرک ولا یطوف بالبیت عریان) اس طرح تیسرے سال جب دھیرے دھیرے شرک کا خاتمہ کر دیا گیا اس وقت آپ نے مکہ جاکر حج ادا فرمایا۔ یہی رسول اللہ علیہ وسلم کا آخری حج (حجۃ الوداع) تھا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام کے نفاذ میں کس طرح تدریجی حکمت کا لحاظ فرمایا ہے۔ حتیٰ کہ اقتدار پر قبضہ ملنے کے باوجود آپ نے تدریج کے اصول کو ترک نہیں کیا۔ خدا کے پیغمبر نے اپنے آپ کو روک لیا مگر مشرکین کو وقت سے پہلے روکنے کے لئے اقدام نہیں فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت صرف وہی نہیں ہے جس کو عام طور پر لوگ "سنت" کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کے سوا بھی رسول اللہ کی سنتیں ہیں۔ ان میں سے ایک سنت وہ ہے جس کو تدریج یا حقیقت پسندی کہا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں پیغمبر کی حیثیت سے ۱۳ سال رہے مگر آپ نے کبھی یہ نہ کیا کہ کعبہ کی بے حرمتی کے خلاف احتجاجی جلوس نکالیں۔ حتیٰ کہ فتح و غلبہ حاصل ہونے کے بعد بھی

آپ نے بیہودہ مراسم کے خاتمہ کے لئے جلد بازی نہیں کی۔ طاقت ور ہونے کے باوجود آپ نے دو سال تک انتظار فرمایا اور تیسرے حج میں وہ تمام اصلاحات نافذ کیں جو آپ ملک میں نافذ کرنا چاہتے تھے۔

تدریجی ڈھنگ پر عمل کرنے میں بہت سے فائدے ہیں جو کسی اور طریقے سے حاصل نہیں کئے جا سکتے۔

۱۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ مطلوبہ نتیجہ تک پہنچنا یقینی ہو جاتا ہے۔ تدریجی طور پر آگے بڑھنا دوسرے لفظوں میں ایک ایک قدم کو سنبھالتے ہوئے اور مستحکم کرتے ہوئے آگے بڑھنا ہے۔ ایسا آدمی صرف جوش کے تحت میدان میں نہیں کود پڑتا بلکہ خارجی اسباب کی رعایت کرتے ہوئے حسب حالات اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کرتا ہے۔ اور جو شخص اپنے سفر میں اس حکمت کو ملحوظ رکھے وہ ضرور منزل پر پہنچ کر رہے گا۔

۲۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آدمی بے فائدہ نقصانات سے بچ جاتا ہے۔ جو شخص اچانک چھلانگ لگا کر مقصد تک پہنچنا چاہے اس کو غیر ضروری طور پر ایسی طاقتوں سے قبل از وقت لڑنا پڑ جاتا ہے جن سے مؤثر مقابلہ کے لئے وہ ابھی تیار نہیں ہو سکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جان و مال کے ایسے نقصانات بھگتنے پڑتے ہیں جن کی تلافی مدتوں بعد بھی نہ ہو سکے۔

حصّه دوم

پیغمبر انقلاب

اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ اس کا دین سربلند ہو۔ اس کو دنیا میں غالب فکر کا مقام حاصل ہو۔ مگر دین کے فکری غلبہ کے لئے عالمی حالات کی موافقت ضروری ہے۔ خدا نے ہزاروں سال کے عمل سے پیغمبر آخر الزماں کے لئے موافق حالات پیدا کئے۔ آپ نے ان حالات کو جانا اور ان کو حکیمانہ طور پر استعمال کرکے اسلام کو دنیا میں غالب فکر کا مقام عطا کیا۔

اب دوبارہ پچھلے ہزار سال کے عمل کے نتیجہ میں خدا نے وہ تمام موافق حالات جمع کر دئے ہیں جن کو استعمال کرکے ازسرنو اسلام کو دنیا کا غالب فکر بنایا جا سکے۔ اسلام کو دوبارہ وہی برتری اور سربلندی حاصل ہو جو ماضی میں اسے حاصل تھی۔

مگر ان امکانات کو واقعہ بنانے کے لئے ایک ایسی سنجیدہ جدوجہد درکار ہے جو وقت کے گہرے شعور پر ابھری ہو۔ جو ردعمل کی نفسیات سے پاک ہوکر مثبت عمل کرنا جانتی ہو۔ جو ہر دوسرے احساس کو قربان کرکے صرف دین کی سربلندی کے لئے کوشش کرنے والی ہو۔ جو ربانی حکمت کی رہنمائی میں اٹھی ہو نہ کہ انسانی کج فہمیوں کی بنیاد پر۔ جس کا محرک خدا کی بڑائی قائم کرنا ہو نہ کہ قومی فخر اور مادی عظمت کا جھنڈا لہرانا۔ ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی خدا کے دین کو سربلند کیا تھا اور ایسے ہی لوگ آج بھی خدا کے دین کو سربلند کریں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ سطحی نعروں پر بھیڑ جمع کرنے کو کام سمجھیں، جو ہر پیش آمدہ مسئلہ پر دوڑنا شروع کر دیں، وہ صرف خدا کے پیدا کئے ہوئے امکانات کو برباد کریں گے۔ وہ ان امکانات کو واقعہ بنانے والے ثابت نہیں ہو سکتے۔

ایک تقابل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو اسلامی انقلاب آیا اس میں تاریخی روایات کے مطابق کل ۱۰۱۸ آدمی ہلاک ہوئے۔ اس انقلاب کی تکمیل ۲۳ سال میں ہوئی۔ ان ۲۳ سالوں میں جو غزوات پیش آئے ان کی تعداد ۸۱ بتائی جاتی ہے۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ۲۷ غزوات میں شریک تھے اور عملاً باقاعدہ جنگ صرف چند ہی غزوات میں پیش آئی۔ ان لڑائیوں میں مجموعی طور پر ہلاک ہونے والوں کی تعداد اس طرح ہے:

مسلمان مقتولین	۲۵۹	
غیرمسلم مقتولین	۷۵۹	= ۱۰۱۸

صدر اول کا یہ انقلاب تاریخ کا عظیم ترین انقلاب تھا جس نے انسانی تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا۔ اتنے بڑے انقلاب میں مقتولین کی یہ تعداد اتنی کم ہے کہ اس کو غیر خونی انقلاب (BloodlessRevolution) کہا جاسکتا ہے۔

ہمارے لکھنے اور بولنے والے اکثر پُرجوش انداز میں اس انقلاب کا مقابلہ موجودہ زمانہ کے غیر اسلامی انقلابات سے کرتے ہیں۔ وہ فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ اسلامی انقلاب صرف ایک ہزار آدمیوں کی جان دے کر کامیاب ہوگیا۔ جبکہ فرانس میں جمہوری انقلاب لانے کے لئے اور روس میں اشتراکی انقلاب لانے کے لئے اتنے زیادہ آدمیوں کو قربان ہونا پڑا جن کی تعداد لاکھوں میں شمار ہوتی ہے۔

یہ تقابل ہم کو بہت پسند ہے کیونکہ اس میں ہماری پُرفخر نفسیات کو تسکین ملتی ہے۔ مگر یہاں تقابل کی ایک اور صورت ہے جس پر مسلمانوں نے کبھی غور نہیں کیا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ دوسرا تقابل نصیحت کا تقابل ہے اور نصیحت آدمی کے لئے ہمیشہ بہت کڑوی ہوتی ہے۔

یہ دوسرا تقابل یہ ہے کہ آپ صدر اول کی اسلامی دعوت میں مرنے والے کا مقابلہ موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکوں میں مرنے والوں سے کریں۔ بالفاظ دیگر، صدر اول کے انقلاب سے خود اپنی انقلابی کوششوں کا موازنہ کریں۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں دینی انقلاب اور اسلامی جہاد کے نام پر بڑی بڑی تحریکیں اٹھائی ہیں۔ مسلمان جس طرح زمانہ رسالت کے دینی انقلاب کا تقابل غیر مسلموں کے لادینی انقلابات سے کرتے ہیں۔ اسی طرح انھیں چاہئے کہ وہ زمانۂ رسالت کے انقلاب کو سامنے رکھ کر خود اپنی اٹھائی ہوئی تحریکوں کو تولیں اور ان کے نتائج کا جائزہ لیں۔

اگر مسلمان یہ تقابل کریں تو وہ حیرت انگیز طور پر پائیں گے کہ انھوں نے پیغمبر کی تحریک کے مقابلہ میں دوسری اقوام کی لادینی تحریکوں کو جس مقام پر کھڑا کر رکھا ہے، عین اسی مقام پر خود ان کی موجودہ زمانہ کی تحریکیں بھی کھڑی ہوئی ہیں ——— الجزائر کے جہاد آزادی میں ۲۵ لاکھ مسلمان مرے، ہندستان کے جہاد آزادی میں ۵ لاکھ علماء اور مسلمان شہید ہوئے، اسلامی پاکستان کو وجود میں لانے کے درمیان ایک کروڑ انسان کام آگئے۔ اسی طرح شام، عراق، ایران، مصر، فلسطین اور دوسرے علاقوں میں جو لوگ اسلام کے نام پر جانیں دے رہے ہیں ان کی تعداد لاکھوں سے بھی زیادہ ہے۔ مزید یہ کہ ان تمام قربانیوں کا حاصل کچھ بھی نہیں۔ صدر اول کی اسلامی تحریک میں دس سو آدمی کام آئے، اور اس کے بعد ایسا دور رس انقلاب آیا جس کے اثرات ساری دنیا نے محسوس کئے۔

موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں میں مجموعی طور پر دس کروڑ آدمی ہلاک اور برباد ہو گئے۔ اس کے باوجود زمین کے اوپر کوئی ایک چھوٹا سا خطہ بھی نہیں جہاں اسلامی انقلاب حقیقی معنوں میں کامیاب اور نتیجہ خیز نظر آتا ہو۔

پھر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ سخت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہماری کوششوں کا بالکل الٹا نتیجہ برآمد ہوا ہے۔ ہمارے حق میں بائبل کے وہ الفاظ پورے ہوئے ہیں جو یہود کے بارے میں کہے گئے تھے ——— "اور تمھارا بیج بونا فضول ہوگا کیونکہ تمھارے دشمن اس کی فصل کھائیں گے۔ اور جن کو تم سے عداوت ہے وہی تم پر حکمرانی کریں گے۔ اور تمھاری قوت بے فائدہ صرف ہوگی کیونکہ تمھاری زمین سے کچھ پیدا نہ ہوگا۔ اور میدان کے درخت پھلنے ہی کے نہیں" (احبار، باب ۲۶)

ہماری جدید تاریخ ان الفاظ کے عین مصداق ثابت ہو رہی ہے۔ ہم نے خلافت اسلامی اور اتحاد عالمی کی دھواں دھار تحریکیں چلائیں اور اس کی راہ میں ان گنت قربانیاں دیں۔ مگر جب نتیجہ نکلا تو ساری مسلم دنیا بہت سی قومی حکومتوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ہم نے آزادیٔ وطن کے لئے جہاد کیا مگر جب وطن آزاد ہوا تو عملاً وہ دوسرے فرقوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ ہم نے اسلامی پاکستان وجود میں لانے کے لئے قربانیاں دیں مگر جب اسلامی پاکستان بنا تو وہاں غیر اسلامی لیڈروں کی حکومت قائم تھی۔ ہم نے مصر میں اسلامی اقتدار قائم کرنے کے لئے عظیم الشان تحریک اٹھائی مگر جب مصر کی قسمت کا فیصلہ ہوا تو وہ اسلام پسندوں کے بجائے فوجی حوصلہ مندوں کے ہاتھ میں جا چکا تھا۔ تقریباً ثلث صدی سے فلسطین کی یہودی ریاست کو مٹانے کے لئے جہاد جاری ہے اور مسلمانوں کا جان و مال بے پناہ مقدار میں تباہ ہو رہا ہے مگر عملاً صرف یہ ہوا ہے کہ یہودی ریاست کی قوت اور وسعت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں آخری دردناک خبر جو بہت جلد مسلمانوں کو سننی ہوگی وہ یہ کہ ایران میں ناقابل بیان قربانیوں کے بعد اسلامی اقتدار لایا گیا مگر یہ اسلامی اقتدار بہت جلد ملحد طاقتوں کا اقتدار قائم ہونے کا ابتدائی زینہ بن گیا۔

یہ موجودہ زمانہ کی پتھر سے بھی زیادہ سنگین حقیقتیں ہیں۔ کوئی شخص یہ کر سکتا ہے کہ اپنے ذہن میں خوش خیالیوں کی ایک دنیا بنا کر اس میں جیتا رہے مگر آئندہ آنے والا مورخ یقیناً ہماری خوش خیالیوں کی تصدیق نہیں کرے گا۔ وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوگا کہ فرانس اور روس کے انقلاب میں مرنے والوں کے حصہ میں پھر بھی یہ فائدہ آیا کہ انھوں نے عالمی فکر کا دھارا موڑ دیا۔ اس کے بعد دنیا میں شہنشاہی طرز فکر کے بجائے جمہوری طرز فکر رائج ہو گیا اور سرمایہ دارانہ طریق معیشت پر سوشلسٹ طریق معیشت کو فکری غلبہ حاصل ہو گیا۔ مگر اسلام کے نام پر برباد ہونے والے اگرچہ تعداد میں ان سے بھی زیادہ تھے مگر وہ عالمی فکر پر کسی قسم کا اثر نہ ڈال سکے۔

صدر اول کا اسلامی انقلاب بتاتا ہے کہ اگر ایک ہزار آدمی بھی یہ ثبوت دے دیں کہ وہ خدا کے دین کی خاطر قربانی کی حد تک جانے کے لئے تیار ہیں تو خدا ان کی قربانی کو قبول کر کے اسلام کو زمین پر غالب کر دیتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں کروروں آدمیوں نے قربانی کا ثبوت دیا مگر خدا کی نصرت ان کا ساتھ دینے کے لئے آسمان سے نہیں اتری۔ وہ اس کے باوجود مغلوب ہی بنے رہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہماری یہ تمام قربانیاں حقیقۃً اس صراطِ مستقیم کے مطابق نہ تھیں جس کی پیروی پر خدا نے نصر عزیز اور فتح مبین کا وعدہ فرمایا ہے۔ (الفتح)

کوئی کسان اگر کہے کہ میں نے گیہوں کے بیج زمین میں ڈالے مگر اس سے گیہوں اگنے کے بجائے جھاڑ جھنکاڑ اُگے تو ایسا کسان جھوٹ بولتا ہے۔ کیونکہ خدا کی اس دنیا میں یہ ممکن ہی نہیں کہ آدمی گیہوں کے بیج بوئے اور اس سے اس کے لئے جھاڑ جھنکاڑ اگے۔ یہ ناممکن ہے، یہ کرور بار ناممکن ہے۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں ہماری قربانیاں اگر فی الواقع اس راہ پر ہوتیں جس راہ پر رسول اور اصحاب رسول چلے اور اپنی جانیں دیں تو ناممکن تھا کہ اتنی غیر معمولی کوششوں کے باوجود اس کا کوئی مثبت نتیجہ نہ نکلے۔ واقعات کا یہ کھلا ہوا فیصلہ ہے۔ اگر اس کے باوجود کوئی آدمی خوش فہمی کے گنبد میں رہنا چاہے تو رہے۔ بہت جلد قیامت اس کے گنبد کو توڑ دے گی۔ اس کے بعد وہ دیکھے گا کہ وہاں اس کے لئے جھوٹی خوش فہمیوں کے کھنڈر کے سوا اور کچھ نہیں۔

نصرت خداوندی

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اے ایمان لانے والو، اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو خدا تمھاری مدد کرے گا۔ اور تمھارے قدموں کو جما دے گا (یا ایھا الذین آمنوا ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم، محمد ۷)
یہاں خدا کی نصرت کرنے سے مراد خدا کی اسکیم کے ساتھ موافقت ہے، یعنی واقعات کو ظہور میں لانے کے لئے خدا کا جو نقشہ ہے اور اس کے لئے اس نے جو موافق حالات فراہم کئے ہیں ان کے ساتھ اپنی کوششوں کو جوڑ دینا، جو لوگ اس طرح خدا کی نصرت کریں ان کو جماؤ حاصل ہوتا ہے اور بالآخر وہ کامیاب رہتے ہیں۔ خدا کی اس دنیا میں خدائی منصوبہ سے مطابقت کرکے ہی کوئی نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے نہ کہ بطور خود آزادانہ عمل کرکے۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ ایک پادری صاحب اپنے مکان کے سامنے ایک ہرا بھرا درخت دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر میں اس کا بیج بوؤں تو وہ دس سال میں پورا درخت بنے گا۔ انھوں نے ایسا کیا کہ کہیں سے ایک بڑا درخت کھدوایا پھر کئی آدمیوں کے ذریعہ اس کو وہاں سے اٹھوایا اور اس کو لاکر اپنے گھر کے سامنے لگا دیا۔ وہ خوش تھے کہ انھوں نے دس سال کی مدت ایک دن میں طے کرلی ہے، لیکن اگلے دن جب وہ صبح کو سو کر اٹھے تو ان کو یہ دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا کہ درخت کے پتے مرجھا چکے ہیں۔ شام تک شاخیں بھی لٹک گئیں۔ چند دن کے بعد درخت کے پتے سوکھ کر جھڑ گئے اور اس کے بعد ان کے گھر کے سامنے صرف لکڑی کا ایک ٹھنٹھ کھڑا ہوا تھا۔

انھیں دنوں پادری صاحب کا ایک دوست ان سے ملنے کے لئے آیا۔ دوست نے دیکھا کہ پادری صاحب اپنے گھر کے سامنے بے چینی کے ساتھ ٹہل رہے ہیں۔ اس نے کہا، آج میں آپ کو غیر معمولی طور پر پریشان دیکھ رہا ہوں، آخر کیا بات ہے۔ پادری صاحب نے جواب دیا ——— میں جلدی میں ہوں مگر خدا جلدی نہیں چاہتا:

"I am in hurry, but God doesn't"

اس کے بعد پادری صاحب نے درخت کے مذکورہ قصہ کو بتاتے ہوئے کہا کہ دنیا میں جو واقعات ہوتے ہیں ان میں ایک حصہ خدا کا ہوتا ہے اور ایک حصہ انسان کا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے دو دندانہ دار پہیوں (Cog Wheels) کے ملنے سے مشین کا چلنا۔ ایک پہیہ خدا کا ہے، دوسرا پہیہ انسان کا۔ انسان جب خدا کے پہیہ کا ساتھ دیتا ہے تو وہ کامیاب رہتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ خدا کے پہیے کی رفتار کا لحاظ کئے بغیر چلنا چاہے تو وہ ٹوٹ جائے گا کیونکہ خدا کا پہیہ مضبوط ہے اور انسان کا پہیہ کمزور۔

خدا نے کروروں سال کے عمل سے زمین کے اوپر زرخیز مٹی کی تہ بچھائی جس کے اوپر کوئی درخت اگے۔ سورج کے ذریعہ اوپر سے ضروری حرارت بھیجی۔ آفاقی اہتمام کے تحت پانی مہیا فرمایا۔ موسموں کی تبدیلی کے ذریعہ اس کی پرورش کا انتظام کیا۔ کھرب ہا کھرب کی تعداد میں بیکٹیریا پیدا کئے جو درخت کی جڑوں کو نائٹروجن کی غذا فراہم کریں۔ یہ تمام انتظام گویا خدا کا دندانہ دار پہیہ (Cog Wheel) ہے۔ اب انسان کو اس میں اپنا دندانہ دار پہیہ ملانا ہے تاکہ مذکورہ مواقع اس کے لئے درخت کی صورت اختیار کر سکیں۔ انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ ایک بیج لے اور اس کو زمین میں دبا دے۔ اگر وہ ایسا کرے تو گویا اس نے خدا کے پہیے میں اپنے پہیے کو ملایا۔ اس کے بعد فطرت کی مشین چلنا شروع ہو جائے گی اور وقت پر اپنا نتیجہ دکھائے گی۔ اس کے برعکس اگر انسان اپنا بیج پتھر پر ڈال دے، یا بیج کے بجائے اس کے ہم شکل پلاسٹک کے دانے زمین میں بوئے، یا وہ ایسا کرے کہ بیج بونے کے بجائے پورا درخت اکھاڑ کر لائے اور اس کو اپنی زمین میں اچانک کھڑا کرنا چاہے تو گویا اس نے اپنا پہیہ خدا کے پہیے میں نہیں ملایا، اس نے اپنے آپ کو خدا کے منصوبے میں شامل نہیں کیا۔ ایسے آدمی کے لئے اس دنیا میں ہرے بھرے درخت کا مالک بننا مقدر نہیں۔

یہی معاملہ اسلامی انقلاب کا بھی ہے۔ وہ بھی خدا کے پیدا کردہ مواقع کو سمجھنے اور ان کو استعمال کرنے سے ظہور میں آتا ہے، نہ کہ خود ساختہ قسم کی اچھل کود مچانے سے۔ صدر اول میں جو انقلاب آیا وہ اس لئے آیا کہ خدا کے کچھ بندوں نے اپنا پہیہ خدا کے پہیہ میں ملا دیا۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ میں ہماری تمام قربانیاں اس لئے رائگاں چلی گئیں کہ ہم نے خدائی منصوبہ کے ساتھ موافقت نہیں کی بلکہ خود ساختہ راہوں میں غیر متعلق قسم کی

ہنگامہ آرائیاں کرتے رہے۔

دین توحید اور دین شرک

قرآن کے اشارات (البقرہ ۲۱۳) سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم کے بعد جب انسان زمین پر آباد ہوا تو سب کا دین توحید تھا۔ یہ صورت چند سو سال تک جاری رہی۔ اس کے بعد لوگوں کے اندر مظاہر پرستی کا آغاز ہوا جس کا دوسرا نام شرک ہے۔ دکھائی نہ دینے والے خدا کو اپنا مرکز توجہ بنانا انسان کے لئے مشکل تھا، چنانچہ اس نے عقیدۃً خدا کو مانتے ہوئے یہ کیا کہ دکھائی دینے والی چیزوں کو اپنا مرکز توجہ بنالیا۔ یہی وہ دور ہے جب کہ سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش شروع ہوئی۔ پہاڑوں اور سمندروں کو دیوتا سمجھ لیا گیا۔ حتیٰ کہ انسانوں میں سے جس کے پاس عظمت و اقتدار نظر آیا اس کو بھی خدا کا شریک فرض کر لیا گیا۔ اس طرح تقریباً ایک ہزار سال بعد وہ وقت آیا جب کہ توحید کا فکری غلبہ ختم ہوگیا۔ اور انسانی ذہن پر دین شرک غالب آگیا۔

ابتدائی دین توحید میں اس بگاڑ کے بعد خدا نے اپنے پیغمبر بھیجنے شروع کئے۔ مگر ان پیغمبروں کو کبھی اتنی مقبولیت حاصل نہ ہوسکی کہ دین شرک کو مٹا کر دوبارہ دین توحید کو غالب اور سربلند کرتے۔ انسانی نسل اس زمانہ میں جن جن مقامات پر پھیلی تھی، ہر مقام پر خدا کے پیغمبر لگاتار آتے رہے (المومنون ۴۴) ایک حدیث کے مطابق ان پیغمبروں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ لاکھ تھی۔ مگر تمام پیغمبروں کا یہ حال ہوا کہ ان کو استہزار کا موضوع بنالیا گیا (یس ۳۰)

جب آدمی سچائی کا انکار کرتا ہے، بلکہ اس کا مذاق اڑانے پر اتر آتا ہے تو یہ خواہ مخواہ نہیں ہوتا۔ ایسا رویہ آدمی ہمیشہ کسی چیز کے بل پر اختیار کرتا ہے۔ اس کے پاس کوئی ناز ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ حق سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔ یہ کیا ہے۔ اس کا جواب قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے:

فلما جاءتهم رسلهم بالبينات فرحوا بما	جب ان کے پاس ان کے رسول دلائل لے کر آئے تو وہ
عندهم من العلم وحاق بهم ما كانوا به	اس علم پر مگن رہے جو ان کے پاس تھا اور ان کو گھیر لیا
يستهزؤن المومن ۸۳	اس چیز نے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔

یہاں "علم" سے مراد وہ بگڑا ہوا مذہب ہے جو زمانہ گزرنے کے بعد ان قوموں کے نزدیک مقدس بن گیا تھا۔ اس قسم کا آبائی مذہب ہمیشہ ایک قائم شدہ مذہب ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ مانے ہوئے بزرگوں کے نام وابستہ ہوتے ہیں۔ اس کے اوپر بڑے بڑے ادارے چل رہے ہوتے ہیں۔ اس کی بنیاد پر ان کا پورا قومی ڈھانچہ کھڑا ہوا ہوتا ہے۔ اس کو لمبی روایات کے نتیجہ میں عظمت کا سب سے اونچا مقام مل چکا ہوتا ہے۔

ان قوموں کے پاس ایک طرف ان کا یہ مسلمہ مذہب تھا جو شرک کی بنیاد پر قائم تھا۔ دوسری طرف پیغمبر ایک ایسی توحید کی آواز بلند کرتا جو وقت کے ماحول میں اجنبی ہوتی تھی۔ اس کا داعیِ حق ہونا ایک ایسے

دعوے کی حیثیت رکھتا تھا جس کی پشت پر ابھی تاریخ کی تصدیقات جمع نہیں ہوئی ہیں۔ اس کے پاس اپنی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے لفظی دلیل کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس تقابل میں انھیں وقت کا پیغمبر واضح طور پر حقیر نظر آتا اور ان کا اپنا آبائی مذہب واضح طور پر عظیم۔ حضرت مسیح بے گھر تھے اور درخت کے نیچے سوتے تھے۔ دوسری طرف یہودیوں کا مذہبی سردار ہیکل کی عظیم عمارت میں جلوہ افروز تھا۔ پھر ہیکل کے صدر نشین کے مقابلہ میں درخت کے نیچے سونے والا لوگوں کو زیادہ برسرِ حق کیسے نظر آتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قومیں اپنے معاصر پیغمبروں کو استہزار کا موضوع بناتی رہیں۔ اس استہزار پر جو چیز انھیں آمادہ کرتی وہ ان کا یہ احساس تھا کہ ہم تو مسلّمہ اکابر کا دامن تھامے ہوئے ہیں، پھر ان کے مقابلہ میں اس معمولی آدمی کی کیا حیثیت۔ اکابر کی اس فہرست میں اگرچہ قدیم انبیار تک ہوتے تھے۔ مگر ان انبیار کی حیثیت عملاً ان کے یہاں ایک قسم کے قومی ہیرو کی تھی نہ کہ فی الواقع داعئ حق کی۔

اعلار کلمۃ اللہ

آپ نے دیکھا ہوگا کہ سڑکوں کے چوراہے پر کھمبا لگا ہوتا ہے جس میں ہری اور لال روشنیاں ہوتی ہیں۔ جس رخ پر ہری روشنی ہو ادھر سواریوں کو جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ اور جس رخ پر لال روشنی ہو رہی ہو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ادھر سواریاں نہ جائیں۔ اگر کوئی سواری اس نشان دہی کی خلاف ورزی کرے تو وہ ٹریفک قوانین کے مطابق قابل سزا قرار پاتی ہے۔

داعئ حق کی حیثیت اصلاً اسی قسم کے رہنما کھمبا کی ہے۔ وہ خدا کی طرف سے مقرر کیا جاتا ہے کہ زندگی کے راستوں پر کھڑا ہو کر لوگوں کو بتائے کہ وہ کدھر جائیں اور کدھر نہ جائیں۔ کون سا راستہ جنت کی طرف جا رہا ہے اور کون سا جہنم کی طرف۔ (وکذلک جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا)

ابتدائی دور توحید کے بعد غلبۂ شرک کے زمانے میں خدا کی طرف سے جو رسول آئے وہ اسی خاص مقصد کے لئے آئے۔ ان کو خدا نے حقیقت کا صحیح علم دے کر کھڑا کیا کہ وہ قوموں کی رہنمائی کریں اور ان کو یہ بتائیں کہ کہ دنیا کی زندگی میں ان کے لئے صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ ہر نبی نے اپنی اس ذمہ داری کو پوری طرح انجام دیا۔ انھوں نے ان کی قابل فہم زبان میں دلائل کی پوری قوت کے ساتھ لوگوں کے سامنے حق کو پیش کیا اور مسلسل اتنی وضاحت کی کہ ان کے مخاطبین کے سامنے اتمام حجت کی حد تک خدا کا پیغام پہنچ گیا۔ پھر جس نے رسول کا ساتھ دیا وہ خدا کے نزدیک جنتی ٹھہرا۔ جس نے رسول کو نہ مانا وہ سرکش اور باغی قرار دے کر جہنم میں ڈال دیا گیا۔

تاہم اللہ تعالیٰ کو حق کے اعلان کے ساتھ یہ بھی مطلوب تھا کہ دوبارہ حق کا اظہار ہو۔ حق کا اعلان تو یہ ہے

کہ لوگوں کو حق کے بارے میں پوری طرح بتا دیا جائے۔ خیر خواہی اور حکمت کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات کو اس طرح کھول دیا جائے کہ سننے والوں کے لئے یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ ہم اس سے بے خبر تھے۔ ہم یہ جانتے ہی نہ تھے کہ زندگی میں کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ اسی کا نام اتمام حجت ہے۔

اظہار اس سے آگے کی چیز ہے۔ اظہار کا مطلب یہ ہے کہ دینی فکر دنیا کا غالب فکر بن جائے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے افکار پست اور مغلوب ہو کر رہ جائیں۔ اس کو دوسرے لفظوں میں اعلاء کلمۃ اللہ کہا گیا ہے۔ اظہار دین یا اعلاء کلمۃ اللہ سے مراد اصلاً حدود و قوانین کا نفاذ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد فکری غلبہ ہے۔ یعنی اسی قسم کا غلبہ جیسا غلبہ موجودہ زمانہ میں جدید علوم کو قدیم روایتی علوم پر حاصل ہوا ہے۔ مثلاً سرمایہ داری پر سوشلزم کا فکری غلبہ، شہنشاہیت پر جمہوریت کا فکری غلبہ اور قیاسی فلسفہ پر تجرباتی سائنس کا فکری غلبہ۔ جدید سائنسی دنیا میں بعض علوم نے غالب علم کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اور بعض دوسرے علوم نے ان کے مقابلہ میں اپنی برتری کھو دی ہے۔ اسی قسم کا غلبہ دین حق کا بھی دین باطل کے اوپر مطلوب ہے۔

خدا قادر مطلق ہے۔ اس کے لئے بہت آسان تھا کہ وہ حق کو دوسری باتوں پر فائق و برتر کر دے جس طرح اس نے سورج کی روشنی کو دوسری تمام زمینی روشنیوں پر فائق کر رکھا ہے۔ مگر موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں خدا اپنے مطلوب واقعات کو اسباب کے روپ میں ظاہر کرتا ہے نہ کہ معجزات کے روپ میں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اسباب کے دائرہ میں اس مقصد کے لئے تمام ضروری حالات پیدا کئے جائیں اور اس کے بعد ایک ایسا پیغمبر بھیجا جائے جس کو خصوصی طور پر غلبہ کی نسبت دی گئی ہو۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے منصوبہ میں شامل کر کے نہ صرف حق کا اعلان کرے بلکہ حق کا اظہار بھی کر دے تاکہ خدا کے بندوں پر خدا کی نعمت کا اتمام ہو اور ان پر ان برکتوں کے دروازے کھلیں جو ان کی نادانی سے ان کے اوپر بند پڑے ہوئے ہیں۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن کی ان آیتوں میں کہی گئی ہے:

یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکفرون ○ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون ○	وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا خواہ وہ منکروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو تمام دین پر غالب کر دے خواہ وہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو
الصف ۸ - ۹	

ایک نئی قوم برپا کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انا دعوۃ ابراھیم (میں ابراہیم کی دعا ہوں) حضرت ابراہیمؑ

نے کعبہ کی تعمیر کے وقت یہ دعا کی تھی کہ اے خدا تو میرے لڑکے اسمٰعیل کی اولاد میں ایک نبی پیدا کر (البقرہ ۱۲۹) تاہم حضرت ابراہیم کی دعا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے درمیان تقریبًا ڈھائی ہزار سال کا فاصلہ ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ حضرت زکریا نے اپنی اولاد میں ایک پیغمبر پیدا کئے جانے کی دعا کی تو ایک سال کے اندر ہی آپ کے یہاں حضرت یحییٰ پیدا ہو گئے (آل عمران ۳۹) اور حضرت ابراہیم نے اسی قسم کی دعا فرمائی تو اس کی عملی قبولیت میں ڈھائی ہزار سال لگ گئے۔ اس فرق کی وجہ کیا تھی۔

اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ حضرت یحییٰ کو ایک وقتی کردار ادا کرنا تھا۔ آپ اس لئے بھیجے گئے کہ یہود کے دینی بھرم کو کھولیں اور بالآخر ان کے ہاتھوں قتل ہو کر یہ ثابت کریں کہ یہود اب اتنا بگڑ چکے ہیں کہ انھیں معزول کر دیا جائے اور ان کی جگہ دوسری قوم کو کتاب الٰہی کا حامل بنایا جائے۔ اس کے مقابلہ میں پیغمبر اسلام کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ شرک کو مغلوب کر کے توحید کو غالب فکر کی حیثیت دے دیں۔ اس کام کو اسباب کے ڈھانچہ میں انجام دینے کے لئے ایک نئی صالح قوم اور موافق حالات درکار تھے۔ یہی وہ قوم اور یہی وہ حالات ہیں جن کو وجود میں لانے کے لئے ڈھائی ہزار سال لگ گئے۔

اس منصوبہ کے تحت حضرت ابراہیم کو حکم ہوا کہ وہ عراق کے متمدن علاقہ سے نکلیں اور حجاز کے خشک اور غیر آباد مقام پر اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو لاکر بسا دیں (ابراہیم ۳۷) یہ مقام اس وقت وادی غیر ذی زرع ہونے کی وجہ سے دنیا سے الگ تھلگ تھا۔ یہاں تمدنی آلائشوں سے دور رہ کر خالص فطرت کی آغوش میں ایک ایسی قوم کی تعمیر کی جا سکتی تھی جس کے اندر خدا کی پیدا کی ہوئی فطری صلاحیتیں محفوظ ہوں۔ (ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک، البقرہ ۱۲۸) قبولیت دعا میں ڈھائی ہزار سالہ تاخیر کا واضح مطلب یہ تھا کہ مخصوص ماحول میں توالد وتناسل کے ذریعہ وہ جاندار قوم وجود میں آئے جو خدا کے دین کی سچی حامل بن سکے۔ جو پورے معنوں میں ایک جان دار قوم ہو اور ان تمام مصنوعی کمیوں سے پاک ہو جن کی وجہ سے دور اول میں خدا کے دین کے اظہار کے لئے کار آمد آدمی نہ مل سکے۔ جب منصوبہ کے مطابق مکمل اسٹیج تیار ہو گیا اس وقت بنو ہاشم کے یہاں آمنہ بنت وہب کے پیٹ سے وہ پیغمبر غلبہ پیدا کر دیا گیا جس کی دعا حضرت ابراہیم کی زبان پر جاری ہوئی تھی۔

حضرت ابراہیم نے خدا کے حکم سے ہاجرہ اور اسمٰعیل کو موجودہ مکہ کے مقام پر لاکر بسا دیا جہاں اس وقت سوکھی زمین اور خشک پتھروں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جب مشک کا پانی ختم ہو گیا اور اسماعیل پیاس کی شدت سے ہاتھ پاؤں مارنے لگے تو خشک بیابان میں زمزم کا چشمہ نکل آیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ خدا نے اگرچہ تم کو بڑے سخت محاذ پر کھڑا کیا ہے مگر وہ ایسا نہیں کرے گا کہ تم کو بے سہارا چھوڑ دے۔ تمھارا معاملہ خدا

کا معاملہ ہے اور خدا ہر نازک موڑ پر تمھاری مدد کے لئے موجود رہے گا۔ اسماعیل جب نوجوانی کی عمر کو پہنچے تو حضرت ابراہیمؑ نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ اس خواب کو انھوں نے حکم خداوندی سمجھا اور بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گئے مگر عین اس وقت جب کہ ان کی چھری اسماعیل کے گلے پر پہنچ چکی تھی خدا نے آواز دے کر انھیں روک دیا اور اس کے بدلے انھیں ایک مینڈھا دیا جس کو وہ خدا کے نام پر ذبح کریں۔ یہ اس بات کا مظاہرہ تھا کہ تم سے اگرچہ ہم نے بہت بڑی قربانی مانگی ہے مگر یہ صرف جذبہ کا امتحان ہے۔ قربانی پیش تو کرنا ہو گا مگر ابھی قربان ہونے کی نوبت نہیں آئے گی کہ خدا تمھیں بچا لے گا۔ کیونکہ اصل مقصد تم کو ایک بڑے کام کے لئے استعمال کرنا ہے نہ کہ خواہ مخواہ ہلاک کر دینا۔

حضرت اسماعیل بڑے ہوئے تو انھوں نے قبیلۂ جرہم کی ایک لڑکی سے شادی کر لی جو زمزم نکلنے کے بعد آکر مکہ میں آباد ہو گیا تھا۔ حضرت ابراہیم جو اس وقت شام میں تھے، ایک روز گھوڑے پر سوار ہو کر آئے اس وقت گھر پر اسماعیل نہ تھے، صرف ان کی بیوی موجود تھیں جو اپنے خسر کو پہچانتی نہ تھیں، حضرت ابراہیم نے پوچھا کہ اسماعیل کہاں گئے ہیں، بیوی نے کہا کہ شکار کرنے کے لئے۔ پھر پوچھا کہ تم لوگوں کی گزر کیسی ہوتی ہے۔ بیوی نے معاشی تنگی اور گھر کی ویرانی کی شکایت کی، اس کے بعد حضرت ابراہیم واپس چلے گئے اور خاتون سے کہا کہ جب اسماعیل آئیں تو ان سے میرا سلام کہنا اور یہ پیغام پہنچا دینا کہ اپنی چوکھٹ کو بدل دو (غیر عتبۃ بابك) حضرت اسماعیل نے واپسی کے بعد جب پورا واقعہ سنا تو انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ میرے باپ تھے جو ہمارا حال دیکھنے آئے تھے اور "چوکھٹ بدل دو" کا مطلب استعارے کی زبان میں یہ ہے کہ اس بیوی کو چھوڑ کر دوسری بیوی کر و، کیونکہ وہ اس نسل کو پیدا کرنے کے لئے موزوں نہیں جس کا منصوبہ خدا نے بنایا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس بیوی کو طلاق دے دی اور دوسری عورت سے شادی کر لی۔ اس کے کچھ دن بعد حضرت ابراہیم دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے، اب بھی اسماعیل گھر پر موجود نہ ملے۔ حضرت ابراہیم نے دوسری بیوی سے بھی وہی سوال کیا جو انھوں نے پہلی بیوی سے کیا تھا۔ اس بیوی نے اسماعیل کی تعریف کی اور کہا کہ جو کچھ ہے بہت اچھا ہے، سب خدا کا شکر ہے، اس کے بعد حضرت ابراہیم یہ کہہ کر واپس چلے گئے کہ اسماعیل آئیں تو ان کو میرا سلام کہنا اور یہ پیغام پہنچا دینا کہ چوکھٹ کو قائم رکھو (ثبت عتبۃ بابك) یعنی تمھاری یہ بیوی پیش نظر منصوبہ کے لئے بالکل ٹھیک ہے، اس کے ساتھ اپنا تعلق باقی رکھو (تفسیر ابن کثیر)

اس طرح عرب کے الگ تھلگ علاقے میں اسماعیل کے ابتدائی خاندان سے ایک نئی نسل بننا شروع ہوئی جس نے بالآخر اس جاندار قوم (بنو اسماعیل) کی صورت اختیار کی جو نبی آخر الزماں کا گہوارہ بن سکے اور تاریخ کی اس عظیم ترین ذمہ داری کو سنبھالے جو خدا اس کے سپرد کرنا چاہتا تھا۔

یہ قوم جو عرب کے صحراؤں اور چٹیل بیابانوں میں تیار ہوئی، اس کی خصوصیات کو ایک لفظ میں المروۃ کہا جاسکتا ہے۔ المروۃ کے لفظی معنی ہیں مردانگی۔ یہ عربوں کے یہاں کسی کے جوہر انسانیت کو بتانے کے لئے سب سے اونچا لفظ سمجھا جاتا تھا۔ قدیم عربی شاعر کہتا ہے:

اذا المرء اعیته المروۃ ناشئا　　فمطلبها کھلا علیہ شدید

(آدمی اگر اٹھتی جوانی میں مردانگی کا مقام حاصل کرنے سے عاجز رہ جائے تو بڑھاپے میں اس کو حاصل کرنا بہت مشکل ہے)

پروفیسر فلپ ہٹی نے عرب تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عرب کے بیابانوں میں صدیوں کے عمل سے جو قوم تیار ہوئی وہ دنیا کی ایک نرالی قوم تھی جو مندرجہ ذیل اخلاقی صفات میں کمال درجہ رکھتی تھی:

> Courage, endurance in time of trouble (sabr) observance of the rights and obligations of neighbourliness (jiwar) manliness (muruah) generosity and hospitality, regard for women and fulfilment of solemn promises. (p. 253)

ہمت، مشکل کے وقت برداشت، پڑوسی کے حقوق اور ذمہ داریوں کی ادائگی، مردانگی، فیاضی اور مہمان نوازی، عورتوں کی عزت اور وعدہ کر لینے کے بعد اسے پورا کرنا۔

خیر امت

اس طرح ڈھائی ہزار سالہ عمل کے ذریعہ ایک ایسی قوم نکالی گئی جو اپنے انسانی اوصاف کے اعتبار سے تمام قوموں میں سب سے بہتر تھی (کنتم خیر امۃ اخرجت للناس، آل عمران ۱۱۰) حضرت عبد اللہ بن عباس نے خیر امت سے مہاجرین کا گروہ مراد لیا ہے (ھم الذین ھاجروا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من مکۃ الی المدینۃ، تفسیر ابن کثیر) مہاجرین دراصل اس گروہ کی علامت تھے۔ باعتبار حقیقت اس سے وہ پورا عرب گروہ مراد ہے جس کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔

پیغمبروں کو ہر زمانہ میں ایک ہی سب سے بڑی رکاوٹ پیش آئی ہے۔ ان کی مخاطب قوموں کے پاس جو آبائی دین ہوتا تھا اس کے ساتھ مادی رونقیں اور در و دیوار کی عظمتیں شامل ہوتی تھیں۔ دوسری طرف وقت کا پیغمبر دلیل مجرد کی سطح پر کھڑا ہوتا تھا۔ عرب میں جو قوم تیار ہوئی اس کے اندر یہ انوکھی صفت تھی کہ وہ حق کو دلیل مجرد کی سطح پر پاسکے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسے حق کے حوالے کر دے جس نے ابھی ظواہر کا روپ اختیار نہیں کیا ہے۔ کھلے آسمان اور وسیع صحراؤں کے درمیان جو قوم تیار ہوئی وہ حیرت انگیز طور پر اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتی تھی کہ حقیقت کو اس کے بے آمیز روپ میں دیکھ سکے، وہ ایک ایسے حق کے لئے اپنا سب کچھ سونپ دے جس سے بظاہر دنیا میں کچھ بھی ملنے والا نہیں۔ اصحاب رسول کی اس خصوصیت کو حضرت عبد اللہ بن مسعود نے تین

لفظوں میں اس طرح ادا کیا ہے: وہ اس امت کے سب سے افضل لوگ تھے۔ وہ سب سے زیادہ نیک دل، سب سے زیادہ گہرا علم رکھنے والے اور سب سے کم تکلف والے تھے۔ اللہ نے ان کو اپنے نبی کی صحبت اور دین کے قیام کے لئے چن لیا تھا (کانوا افضل ھذہ الامۃ ابرّھا قلوبا واعمقھا علما واقلھا تکلفا اختارھم اللہ لصحبۃ نبیہ ولاقامۃ دینہ)

دور شرک میں انسان سے سب سے اہم صفت جو کھوئی گئی تھی، وہ تھی ———— حقیقت کو مجرد سطح پر دیکھنے کی صلاحیت۔ اب انسان حقیقت کو محسوسات اور مظاہر کی سطح پر دیکھتا تھا، وہ حقیقت کو مجرد سطح پر دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا۔ یہی اصل رکاوٹ تھی جس کی وجہ سے پچھلے زمانے میں نبیوں کا مذاق اڑایا جاتا رہا۔

وہ خدا کے منکر نہ تھے مگر انھوں نے خدا کو محسوسات کے پیکر میں ڈھال لیا تھا۔ وہ غیب میں چھپے ہوئے خدا کو سمجھ نہیں پاتے تھے۔ اس لئے انھوں نے نظر آنے والی چیزوں کو خدائی کا پیکر فرض کرکے ان کو اپنا مرکز توجہ بنا لیا تھا، خواہ یہ مادی بڑائیاں ہوں یا انسانی بڑائیاں۔ ان کی یہی کمزوری پیغمبر کی پیغمبری پر یقین کرنے میں مانع تھی۔ ہر پیغمبر جب آتا ہے تو اپنے زمانہ کے لوگوں کے لئے وہ محض ایک انسان ہوتا ہے۔ ابھی اس کے نام کے ساتھ وہ تاریخی بڑائیاں شامل نہیں ہوتیں جو بعد کے دور میں اس کے ساتھ شامل ہو جاتی ہیں۔

حضرت ابراہیم نے اپنی دعا میں فرمایا تھا: اے میرے رب، اس شہر (مکہ) کو تو امن والا شہر بنا دے اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس سے دور رکھ کہ ہم بتوں کو پوجیں۔ اے میرے رب، ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا۔ پس جس نے میری پیروی کی وہ میرا ہے اور جس نے میرا کہنا نہ مانا تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔ اے میرے رب، میں نے اپنی اولاد کو ایک ایسے میدان میں بسایا ہے جہاں کھیتی نہیں، تیرے محترم گھر کے پاس، اے ہمارے رب تاکہ وہ نماز قائم کریں (ابراہیم ۳۷-۳۵)

حضرت ابراہیم کے زمانہ میں شرک کا غلبہ اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ عالی شان بت خانے ہر طرف قائم تھے۔ انسان کے لئے بظاہر ناممکن ہو گیا تھا کہ وہ اس سے ہٹ کر سوچ سکے۔ اس وقت اللہ کے حکم سے حضرت ابراہیم نے ایک چٹیل زمین میں ایک نئی نسل پیدا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ ایک محفوظ علاقہ میں ایسے افراد تیار کرنے کا منصوبہ تھا جو ظواہر سے اوپر اٹھ کر حقائق کا پرستار بن سکے۔ چنانچہ اسی انسانی مادہ سے وہ قوم بنی جس کے متعلق قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں:

ولکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم وکرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان	مگر اللہ نے ایمان کو تمھارے لئے محبوب بنا دیا اور اس کو تمھارے دلوں میں مزین کر دیا اور تمھارے لئے کفر

اولئک ھم الراشدون (الحجرات ۷) اور فسق اور نافرمانی کو قابل نفرت بنادیا۔ یہی لوگ راہ راست والے ہیں۔

اس آیت کو ہم اس وقت سمجھ سکتے ہیں جب کہ اس کو ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے حالات میں رکھ کر دیکھیں جب کہ اصحاب رسول کے ایمان کا واقعہ پیش آیا۔ انھوں نے دکھائی دینے والے خداؤں کے ہجوم میں دکھائی نہ دینے والے خدا کو پایا اور اس کو اپنا سب کچھ بنا لیا۔ عظمت کے مناروں کے درمیان انھوں نے عظمتوں سے خالی پیغمبر کو پہچانا اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ ایک دین غریب (اجنبی دین) اپنی ساری بے سروسامانی کے باوجود ان کی نظر میں اتنا محبوب ہو گیا کہ اس کی خاطر کوئی بھی قربانی کرنا ان کے لئے مشکل نہ رہا۔ خلاصہ یہ کہ انھوں نے ایک ایسی سچائی کو دیکھ لیا جو ابھی مجرد روپ میں تھی۔ جس کی پشت پر تاریخ کی تصدیقات ابھی جمع نہیں ہوئی تھیں۔ جو ابھی قومی فخر کا نشان نہیں بنا تھا۔ جس میں اپنا سب کچھ دے دینا تھا۔ مگر دنیا میں اس کے بدلے کچھ بھی پانا نہ تھا۔

اس معاملہ کی ایک نمائندہ مثال وہ ہے جو ہجرت سے پہلے بیعت عقبہ ثانیہ کے وقت پیش آئی۔ عین اس زمانہ میں جب کہ مکہ میں اسلام کے حالات بے حد تنگ ہو چکے تھے، مدینہ میں کچھ مسلمانوں کی تبلیغ سے اسلام پھیلنے لگا۔ حتیٰ کہ ہر گھر میں داخل ہو گیا۔ اس وقت مدینہ کے کچھ لوگوں نے طے کیا کہ وہ مکہ جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر نصرت کی بیعت کریں اور آپ کو مکہ چھوڑ کر مدینہ آنے کی دعوت دیں۔ حضرت جابر انصاری کہتے ہیں کہ جب مدینہ کے گھر گھر میں اسلام پہنچ گیا تو ہم نے مشورہ کیا کہ آخر کب تک ہم اللہ کے رسول کو اس حال میں چھوڑے رکھیں کہ آپ مکہ کے پہاڑوں میں پریشان اور ڈرے سہمے پھرتے رہیں (ثم ائتمروا جمیعا فقلنا حتی متی نترک رسول اللہ یطوف ویطرد فی جبال مکۃ ویخاف) رسول اللہ کا بے یارو مددگار ہونا ظاہر بینوں کے لئے اس بات کا ثبوت تھا کہ آپ اللہ کے رسول ہی نہیں۔ اگر اللہ کے رسول ہوتے تو آپ کی یہ حالت کیوں ہوتی۔ مگر اہل مدینہ نے آپ کے معاملہ کو حقیقت کی نظر سے دیکھا۔ انھوں نے یہ راز پالیا کہ آپ کا معاملہ ایک خدائی معاملہ ہے اور آپ کی مدد کر کے وہ خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے مستحق بن سکتے ہیں۔

بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر مدینہ کے ستر سے کچھ اوپر نمائندوں نے مکہ آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بیعت کیسے نازک حالات میں ہوئی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس وفد کے ایک رکن کعب بن مالک انصاری کہتے ہیں کہ ہم مدینہ سے مکہ کے لئے اس طرح روانہ ہوئے کہ ہمارا قبیلہ جو حسب معمول زیارت کعبہ کے لئے جا رہا تھا اس کے ساتھ خاموشی سے حج کے نام پر شریک ہو گئے۔ مکہ کے قریب قبیلہ والوں نے پڑاؤ ڈالا۔ رات کے وقت ہم دوسروں کی طرح ان کے ساتھ سو گئے۔ یہاں تک کہ جب رات کا تہائی

حصہ گزر گیا تو ہم رسول اللہ کی قرارداد کے مطابق اپنے بستروں سے خاموشی کے ساتھ اٹھے، اور مقام موعود کی طرف اس طرح چلے جیسے چڑیا جھاڑیوں میں آہستہ آہستہ چھپتی ہوئی چلتی ہے (نتسلل تسلل القطا مستخفین، سیرۃ ابن ہشام، جزء ثانی، صفحہ ۴۹)

وہ لمحہ بھی کیسا عجیب تھا جب کہ ایک دنیا پیغمبر کو رد کر چکی تھی، اس وقت کچھ لوگ اس کو قبول کرنے کے لئے سبقت کر رہے تھے، یہ وہ وقت تھا کہ پیغمبر سے ان کا وطن چھینا جا چکا تھا۔ طائف سے انھیں پتھر مار کر بھگا دیا گیا تھا۔ تمام قبائل نے آپ کو پناہ میں لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ایسے نازک وقت میں مدینہ کے لوگوں نے آپ کی صداقت کو پہچانا اور آپ کی پکار پر لبیک کہا۔ اس وقت جب کہ انصار مدینہ بیعت کے لئے بڑھے، ایک شخص نے اٹھ کر کہا، کیا تم جانتے ہو کہ تم کس چیز پر بیعت کر رہے ہو۔ یہ اپنے اموال اور اپنی اولاد کو ہلاک کرنے پر بیعت کرنا ہے۔ انھوں نے کہا ہاں۔ ہم علیٰ نھکۃ الاموال والاولاد بیعت کر رہے ہیں پھر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر ہم نے اس عہد بیعت کو آخر تک پورا کر دیا تو ہمارے لئے کیا ہے۔ آپ نے فرمایا جنت۔ انھوں نے کہا، اپنا ہاتھ لایئے، ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں ——— اپنے آپ کو اس طرح ایک متنازعہ صداقت کے حوالے کرنا، اپنا سب کچھ اس طرح ایک غیر قائم شدہ حق کو سونپ دینا اتنا انوکھا واقعہ ہے کہ وہ اجتماعی سطح پر تاریخ میں صرف ایک ہی بار پیش آیا ہے، نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔

غیر متعلق مسائل سے تعرض نہ کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تو عرب میں وہ تمام مسائل پوری طرح موجود تھے جن کو موجودہ زمانہ میں قومی مسائل کہا جاتا ہے اور جن مسائل کے نام پر عام طور پر دنیا میں تحریکیں اٹھتی ہیں۔ یہ مسائل ذہین افراد کو متاثر کرتے ہیں اور وہ ان کا نعرہ لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ تمام مسائل موجود تھے لیکن آپ نے ان سے مطلق تعرض نہیں کیا۔ اگر آپ ان مسائل میں الجھتے تو یہ خدا کے منصوبہ میں اپنے کو شامل کرنا نہ ہوتا۔ وہ سارے مواقع جو ڈھائی ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں پیدا کئے گئے تھے برباد ہو کر رہ جاتے۔

۱۔ حبش نے ۵۲۵ء میں عرب کے سرحدی علاقہ یمن پر قبضہ کر لیا تھا۔ ابرہہ اس زمانہ میں شاہ حبش کی طرف سے یمن کا گورنر تھا۔ ابرہہ کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے سال (۵۷۰ء) میں اس نے ہاتھیوں کی فوج سے مکہ پر حملہ کیا تاکہ کعبہ کو ڈھا دے اور مکہ کی مرکزی حیثیت کو ختم کر دے۔ ۵۰ سالہ قبضہ کے بعد یمن پر حبش کی حکومت ختم ہوئی اور اس پر شاہ فارس کی حکومت

قائم ہوگئی جس کی طرف سے باذان یمن کا گورنر مقرر ہوا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، اور اس کی خبر کسریٰ (شاہ فارس) کو پہنچی تو اس نے باذان کو لکھا کہ اس آدمی کے پاس جاؤ جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور اس سے کہو کہ وہ اس دعوی سے باز آئے۔ اگر وہ باز نہ آئے تو اس کا سر کاٹ کر میرے پاس بھیجو (والا فابعث الیّ برأسه، سیرۃ ابن ہشام)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عرب میں ظاہر ہوئے تو اس وقت عرب کی سرحدوں پر غیر ملکی قبضہ نے کیسے سنگین مسائل پیدا کر رکھے تھے۔ ان حالات میں ایک صورت یہ تھی کہ آپ اپنے ہم قوموں کو غیر ملکی قبضہ کے خلاف اکساتے اور اس کے خلاف جنگ چھیڑ دیتے۔ اگر آپ ایسا کرتے تو یہ خدا کے منصوبے سے انحراف کے ہم معنی ہوتا۔ کیونکہ خدا کا منصوبہ تو یہ تھا کہ لوگوں سے غیر متعلق امور پر ٹکراؤ نہ کیا جائے بلکہ خاموشی سے دعوت الی اللہ کا کام جاری رکھا جائے۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور تاریخ نے دیکھا کہ بالآخر خود باذان نے اسلام قبول کر لیا اور یمن کے عیسائی باشندوں کی اکثریت نے بھی ——— جو مقصد ایک قومی لیڈر ناکام طور پر سیاسی کارروائیوں کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا وہ آپ نے کامیاب طور پر دعوتی کارروائی کے ذریعہ حاصل کر لیا۔

۲۔ ابوطالب کی وفات کے بعد قبائلی رسم کے مطابق بنو ہاشم کا سردار ابولہب مقرر ہوا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی حمایت میں لینے سے انکار کر دیا۔ اب آپ کو کسی دوسرے حمایتی قبیلہ کی ضرورت پیش آئی۔ آپ حمایتی کی تلاش میں مختلف قبائل کے پاس گئے۔ عرب کا ایک سرحدی قبیلہ بنو شیبان بن ثعلبہ تھا۔ آپ اس سے ملے تو قبیلہ کے سردار مثنیٰ بن حارثہ نے کہا کہ ہم کسریٰ (شاہ فارس) کی مملکت کے قریب رہتے ہیں۔ وہاں ہم ایک معاہدہ کے تحت مقیم ہیں جو کسریٰ نے ہم سے لیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم کوئی نئی بات نہ کریں گے اور نہ کسی نئی بات کرنے والے کو پناہ دیں گے۔ اور شاید بادشاہوں کو وہ بات ناپسند ہو جس کی طرف آپ بلاتے ہیں (ان لا نحدث حدثا ولا نؤوی محدثا۔ ولعل هذا الامر الذی تدعوا الیه تکرهه الملوك، سیرۃ ابن کثیر)

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اطراف عرب میں بیرونی سلطنتوں کے نفوذ نے جو مسائل پیدا کیے تھے وہ صرف سیاسی یا ملکی ہی نہ تھے بلکہ دعوت و تبلیغ کے معاملہ تک بھی پہنچ گئے تھے۔ اس کے باوجود آپ نے ایسا نہیں کیا کہ یہ کہہ کر پہلے مرحلہ ہی میں ان سے لڑائی چھیڑ دیں کہ جب تک یہ خارجی رکاوٹیں دور نہ ہوں کوئی دعوتی کام نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ اول مرحلہ میں ان خارجی طاقتوں سے لڑ جاتے تو یہ خدائی منصوبہ کے خلاف ہوتا۔ کیونکہ خدائی منصوبہ تو یہ تھا کہ روم و فارس کو آپس میں بیس سال تک لڑا کر بالکل کمزور کر دیا

جائے اور پھر خود انھیں پر جارحیت کا الزام ڈال کر مسلمانوں کے لئے ان کو فتح کرنا آسان بنا دیا جائے۔ اگر مسلمان ابتدائی مرحلہ میں روم وفارس سے لڑ جاتے تو وہ نتیجہ بالکل برعکس صورت میں نکلتا جو بعد کے تصادم کے ذریعہ حیرت انگیز غیر ملکی فتوحات کی صورت میں برآمد ہوا۔

خدائی منصوبہ سے مطابقت

کسان کا معاملہ قدرت کے کاگ (دندانہ) میں اپنا کاگ دینے کا معاملہ ہے۔ خدا نے ہماری زمین پر فصل اگانے کے بہترین امکانات پیدا کئے ہیں۔ مگر ان امکانات کو اپنے حق میں واقعہ بنانے کے لئے کسان کو ایک حصہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر زمین کی سطح پر زرخیز مٹی (Soil) کی تہ رکھی گئی ہے جو معلوم کائنات میں کسی بھی دوسرے مقام پر نہیں۔ مگر تمام زرخیزی کے باوجود اس مٹی سے فصل اسی وقت اگتی ہے جب کہ اس میں نمی بھی ہو۔ اس نمی کے نہ ہونے کی وجہ سے خشک علاقوں کے صحرا چٹیل بیابان بن کر رہ گئے ہیں، اس حقیقت کو قدرت لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کر کے نہیں بتاتی بلکہ خاموش اشارہ کی زبان میں بتاتی ہے۔ کسان کو اسے خاموش اشارہ کی زبان میں جاننا پڑتا ہے۔ چنانچہ کسان یہ کرتا ہے کہ وہ یا تو بارش سے نم ہونے والی زمین میں اپنی فصل بوتا ہے یا آب پاشی کے ذریعہ پہلے اس میں نمی پہنچاتا ہے، پھر اپنا دانہ اس میں ڈالتا ہے۔ یہی معاملہ داعی کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عرب میں اگرچہ بہترین حالات پیدا کر دئے گئے تھے اس کے باوجود ضروری تھا کہ آپ ربانی حکمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے کام کو آگے بڑھائیں۔ اگر آپ کا منصوبہ خدائی منصوبہ کی رعایت کے بغیر چلتا تو آپ کو کبھی وہ کامیابی حاصل نہ ہوتی جو عملاً آپ کو حاصل ہوئی۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا بنیادی اصول یہ تھا کہ دعوتی عمل میں ساری اہمیت مسئلہ آخرت کو دی جائے۔ مسئلہ دنیا کو کسی بھی حال میں دعوت کا اشو نہ بنایا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی مسئلہ انسان کا ابدی اور حقیقی مسئلہ ہے۔ دوسرے تمام مسائل وقتی اور اضافی مسئلے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آخرت کے بغیر انسان کی کامیابی بھی اتنی ہی بے معنی ہے جتنی کہ اس کی ناکامی بے معنی۔

دوسری بات یہ کہ انسانی زندگی میں ہر قسم کی کامیابی کا تعلق افراد کے کردار سے ہے۔ اور انسان کے اندر حقیقی اور مستقل کردار صرف آخرت پر گہرے یقین ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ عقیدۂ آخرت کا مطلب یہ ہے کہ انسان آزاد اور خود مختار نہیں ہے، بلکہ وہ ہر آن خدا کی پکڑ میں ہے۔ یہ عقیدہ آدمی سے بے راہ روی کا مزاج چھین لیتا ہے اور اس کو پابند اور ذمہ دار انسان بنا دیتا ہے ——— قرآن وحدیث کو اگر خالی الذہن ہو کر پڑھا جائے تو اس میں آخرت کا مسئلہ سب سے زیادہ ابھرا ہوا مسئلہ نظر آئے گا۔ دوسرے مسئلوں کا ذکر بھی اگرچہ آتا ہے مگر وہ ضمناً ہے نہ کہ اصلاً۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ داعی اور مدعو کے درمیان کسی بھی حال میں کوئی مادی جھگڑا نہ کھڑا کیا جائے۔ مدعو کو کسی بھی حال میں فریق نہ بننے دیا جائے، خواہ اس کی جو بھی قیمت دینی پڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس حکمت کی ایک نمایاں مثال حدیبیہ کا معاہدہ ہے۔ قریش نے مسلمانوں کے خلاف جنگ چھیڑ کر یہ صورت حال پیدا کر دی تھی کہ مسلم گروہ اور غیر مسلم گروہ دونوں ایک دوسرے کے جنگی فریق بن گئے تھے۔ تمام وقت جنگ کی باتوں اور جنگ کی تیاریوں میں گزرنے لگا تھا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ہر مطالبہ کو مانتے ہوئے ان سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ کر لیا۔ یہ معاہدہ اس قدر یک طرفہ تھا کہ بہت سے مسلمانوں نے اس کو ذلت کا معاہدہ سمجھا، مگر خدا کے نزدیک وہ فتح مبین (الفتح ۱) کا دروازہ تھا۔ کیونکہ اس کے ذریعہ جنگی مقابلہ آرائی کی فضا ختم ہوتی تھی اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ بحال ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس معاہدہ کے بعد جیسے ہی اہل عرب جنگی فریق کے بجائے مدعو کے مقام پر آئے، ان کے درمیان دعوت حق کی آواز پھیلنے لگی۔ یہاں تک کہ صرف دو سال میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً دس گنا بڑھ گئی۔ جو مکہ جنگ سے فتح ہوتا نظر نہ آتا تھا وہ دعوتی عمل کے ذریعہ مسخر ہو گیا۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق عمل کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ مدعو پر قابو پانے کے باوجود اس کے ساتھ فراخی کا سلوک کیا جائے۔ اس معاملہ کی مثالیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی میں پھیلی ہوئی ہیں۔ فتح مکہ کے بعد قریش کے تمام وہ لوگ پوری طرح آپ کے قابو میں تھے جنھوں نے آپ کے ساتھ اور مسلمانوں کے ساتھ بدترین ظلم کئے تھے۔ مگر آپ نے ماضی کے جرائم کی بنیاد پر کسی کو سزا نہ دی۔ سب کو یک طرفہ طور پر معاف کر دیا۔ قریش کے لوگ جب بندھے ہوئے آپ کے سامنے حاضر کئے گئے تو آپ نے فرمایا: اذھبوا فانتم الطلقاء (جاؤ تم سب آزاد ہو) کچھ لوگوں کے بارے میں آپ نے وقتی طور پر قتل کئے جانے کا حکم دے دیا۔ مگر اس کے بعد ان میں سے بھی ہر اس شخص کو معاف کر دیا گیا جب کہ اس نے یا اس کی طرف سے کسی نے آکر آپ سے جان بخشی کی درخواست کی۔ اس قسم کے سترہ نامزد آدمیوں میں سے صرف پانچ کو قتل کیا گیا جنھوں نے معافی نہیں مانگی تھی۔ احد کی جنگ میں وحشی بن حرب نے حضرت حمزہ کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد ہند بنت عتبہ نے آپ کی لاش کو لے کر اس کا مثلہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو وقتی طور پر آپ کی زبان سے نکل گیا کہ اگر اللہ نے مجھے ان کے اوپر فتح دی تو میں ان کے تین آدمیوں کا مثلہ کروں گا (لئن اظھرنی اللہ علیھم لا مثلن بثلاثین رجلا منھم، تفسیر ابن کثیر، جلد ثانی صفحہ ۳۵۲) فتح مکہ کے بعد آپ نے جن سترہ آدمیوں کے قتل کا حکم دیا تھا ان میں وحشی اور ہند دونوں شامل تھے۔ مگر دونوں نے جب آپ کی خدمت میں آکر معافی مانگی تو دونوں کو معاف کر دیا گیا۔ کیونکہ یہی طریقہ منصوبۂ الٰہی کے مطابق تھا۔

یہ اصول بے حد اہم حکمت پر مبنی ہے۔ انسان پتھر نہیں ہے کہ ایک پتھر کو توڑ دیا جائے تو اس کے دوسرے قریبی پتھر توڑنے والے کے بارے میں کوئی ردعمل ظاہر نہ کریں۔ انسان زندہ معاشرہ کا ایک زندہ جزء ہے۔ جب بھی ایک انسان پر جارحانہ کارروائی کی جاتی ہے تو اس کے قریبی لوگوں میں انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ اس طرح سماج میں تخریبی کارروائیاں جنم لیتی ہیں۔ فتح کے بعد جو وقت نئی تعمیر میں لگتا وہ تخریب کاروں کا مقابلہ کرنے میں صرف ہونے لگتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد پچھلے مخالفین کو عمومی معافی دے کر آئندہ کے لئے ہر قسم کی تخریبی سرگرمیوں کا دروازہ بند کر دیا۔ مزید یہ کہ ان کی اکثریت اسلام قبول کر کے اسلام کی طاقت کا ذریعہ بن گئی، جیسے کہ عکرمہ ابن ابی جہل۔

۴۔ فتح و غلبہ حاصل کرنے کے بعد اجتماعی معاملات کی اصلاح کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جلد بازی کا طریقہ اختیار نہیں فرمایا بلکہ صبر و تدریج کے ذریعہ اصلاحات کا نفاذ کیا۔

مکہ کے قریش دین ابراہیمی کے وارث تھے۔ مگر انھوں نے اصل دین ابراہیمی کو بگاڑ دیا اور اس میں بہت سی بدعتیں جاری کر دیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم نے حج کو قمری مہینوں کی بنیاد پر ذی الحجہ میں قائم کیا تھا۔ قمری سال شمسی سال سے گیارہ دن کم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے قمری مہینوں کی مطابقت موسموں کے ساتھ باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ حج کبھی ایک موسم میں آتا اور کبھی دوسرے موسم میں۔ یہ صورت قریش کے تجارتی مفاد کے خلاف تھی۔ انھوں نے حج کو ہمیشہ گرمی کے موسم میں رکھنے کے لئے نسیٔ (کبیسہ) کا طریقہ اختیار کر لیا۔ وہ قمری مہینوں میں ہر سال گیارہ دن بڑھا دیتے۔ اس طرح نام اگرچہ قمری مہینوں کا ہوتا مگر عملاً اس کا سال شمسی سال کے ساتھ چلتا۔ اس کی وجہ سے تاریخیں ۳۳ سال تک کے لئے بدل جاتیں، ایک بار مہینوں کو اپنی جگہ سے ہٹانے کے بعد دوبارہ ۳۳ سال پر ایسا ہوتا کہ حج ابراہیمی طریقہ کے مطابق اصل ذی الحجہ میں پڑتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر مامور تھے کہ وہ قریش کی بدعتوں کو ختم کر کے حج کو دوبارہ ابراہیمی طریقہ پر قائم کریں۔ فتح مکہ (رمضان ۸ھ) کے بعد آپ عرب کے حکمراں بن گئے۔ آپ ایسا کر سکتے تھے کہ نسیٔ کی بدعت کو فوری طور پر ختم کرنے کا اعلان کر دیں۔ مگر آپ نے صبر سے کام لیا۔ اس وقت نسیٔ کے ۳۳ سالہ دور کو پورا ہونے میں صرف دو سال باقی تھے۔ آپ نے دو سال انتظار فرمایا۔ مکہ کے فاتح ہونے کے باوجود دو سال آپ حج کے لئے نہیں گئے۔ آپ نے صرف تیسرے سال (۱۰ھ) حج کی عبادت میں شرکت کی جو کہ ۳۳ سالہ دور کو پورا کر کے ٹھیک ابراہیمی تاریخ پر ذی الحجہ میں ہو رہا تھا۔ اس وقت مشہور حجۃ الوداع میں آپ نے اعلان فرمایا کہ اس سال حج جس طرح ہو رہا ہے اسی طرح اب ہر سال ہوگا۔ اب نسیٔ کا اصول ہمیشہ کے لئے ختم کیا جاتا ہے۔ یہی بات ہے جو حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپ نے ان الفاظ میں ادا فرمائی:

ایھا الناس ان الزمان قد استدار فھو الیوم کھیئتہ یوم خلق اللہ السمٰوٰت والارض، وان عدۃ الشھور عند اللہ اثنا عشر شھراً (ابن جریر و ابن مردویہ)

اے لوگو زمانہ گھوم گیا۔ پس آج کے دن وہ اپنی اس ہیئت پر ہے جس دن کہ اللہ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا تھا۔ اور مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک ۱۲ مہینے ہیں۔

اس تاخیر میں بہت گہری مصلحت تھی۔ کیونکہ مذہب میں جب کوئی طریقہ عرصہ تک رائج رہے تو وہ مقدس بن جاتا ہے۔ لوگوں کے لئے اس کے خلاف سوچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چونکہ دو سال بعد خود ہی حج ان تاریخوں پر آرہا تھا جو آپ چاہتے تھے۔ اس لئے آپ نے قبل از وقت اقدام کر کے غیر ضروری مسئلہ کھڑا کرنے سے پرہیز کیا۔ جب فطری رفتار سے حج اپنی اصل تاریخ پر آگیا تو آپ نے اعلان فرما دیا کہ یہی حج کی اصل تاریخ ہے اور آئندہ اب انھیں تاریخوں میں حج ہوتا رہے گا۔

یہ چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح اپنی پوری تحریک میں ربانی حکمت کو ملحوظ رکھا۔ آپ نے خدا کے کاگ میں اپنا کاگ ملایا، آپ نے خدائی منصوبہ سے موافقت کرتے ہوئے تمام کارروائیاں کیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی کوششوں کے عظیم الشان نتائج برآمد ہوئے۔

حالات سے بلند ہو کر

قدیم عرب کا تصور کیجئے۔ جنوب میں بحر عرب اور مشرق و مغرب میں خلیج فارس اور بحر احمر کے درمیان بننے والا یہ جزیرہ نما زبردست سیاسی مسائل سے دوچار تھا۔ عرب کے مشرق میں ایران تھا جہاں طاقتور ساسانی سلطنت قائم تھی۔ شمال میں رومی یا بازنطینی سلطنت تھی جو دور قدیم کی سب سے بڑی شہنشاہیت مانی جاتی ہے۔ ان دونوں سلطنتوں نے عرب جغرافیہ کو اپنی سیاست کا اکھاڑہ بنا رکھا تھا۔ عرب کے بہترین زرخیز علاقے براہ راست ان کے قبضے میں تھے۔ عراق پر ایرانیوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ شام اور اردن اور فلسطین اور لبنان رومی سلطنت کا حصہ بنے ہوئے تھے۔ عرب کے مشرق و مغرب میں اگرچہ خلیج فارس اور بحر احمر کی قدرتی آبی دیواریں تھیں مگر یہ حصے بھی پڑوس کی طاقتور شہنشاہیتوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ نہ تھے۔ مشرق سے ایران کے بحری بیڑے خلیج عمان کو عبور کر کے نہایت آسانی سے عرب کے علاقے میں گھس آتے تھے۔ مغرب میں بحر احمر کے اُس پار کے دونوں ممالک ـــ مصر اور حبشہ رومی شہنشاہیت کے ماتحت تھے۔ اور وہ ان کے ذریعے سے ہر وقت عرب کے بظاہر اس محفوظ حصہ میں دخل اندازی کر سکتا تھا۔

عرب کے اندرونی علاقہ میں قبائلی سرداروں کی ریاستیں قائم تھیں۔ مگر رومیوں اور ایرانیوں کے عمومی تسلط کی وجہ سے ان کے لئے بھی زندگی کی صورت یہی تھی کہ ان بیرونی شہنشاہیتوں کی ماتحتی قبول کر کے اپنا سیاسی جزیرہ بنائیں۔ شمال میں شام کی سرحدوں سے ملی ہوئی امارت غساسنہ عربیہ تھی جو رومی سلطنت کے تابع تھی اور بعثت نبوی کے زمانہ میں اس کا امیر حارث بن ابی شمر غسانی تھا۔ اسی طرح امارت بصریٰ تھی۔ وہ بھی رومی شہنشاہیت کے زیر اثر تھی۔ یہاں رومی تمدن چھایا ہوا تھا اور ان کے اثر سے یہاں کے باشندوں کی بڑی تعداد مسیحی ہو گئی تھی۔

عراق کی سرحد پر امارت حیرہ عربیہ تھی جو ایران کے تابع تھی۔ خلیج فارس کے کنارے کنارے متعدد عرب ریاستیں تھیں۔ وہ سب ایران کے زیر اثر تھیں، مثلاً امارت بحرین، جس کا امیر منذر بن ساوی تھا۔ یہاں کے باشندوں کی بڑی تعداد ایرانی تہذیب کے اثر سے مجوسی ہو چکی تھی۔ امارت عمان، جس کے امیر جلندی کے دو لڑکے جیفر اور عبد تھے۔ امارت یمامہ، جس کا امیر ہودہ بن علی الحنفی تھا۔ رومیوں اور ایرانیوں میں سیاسی رقابت کی وجہ سے اکثر جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان میں رومیوں کی ماتحت عرب ریاستیں (مثلاً غساسنہ) روم کا ساتھ

دیتی تھیں اور ایران کی ماتحت عرب ریاستیں (مثلاً حیرہ) ایران کا۔ اس طرح ایران و روم کی باہمی لڑائیوں میں عرب خون بھی خوب بہتا تھا۔

قدیم یمن، موجودہ یمن سے بہت زیادہ وسیع تھا۔ اس میں مختلف قبائل کی حکومتیں قائم تھیں۔ سب سے بڑا یمنی علاقہ وہ تھا جس کا دارالسلطنت صنعا رہا۔ نجران اسی کے اندر واقع تھا۔ یمن میں بیرونی نفوذ کا آغاز غالباً ۳۴۳ء سے ہوتا ہے جب کہ سلطنت روم نے یہاں اپنے عیسائی مبلغین بھیجنے شروع کیے۔ ان عیسائی مبلغین کو نجران میں کامیابی ہوئی اور وہاں کے بیشتر لوگ عیسائی ہو گئے۔

اس مذہبی واقعہ میں روم کے حریف ایران کو سیاست کی بو محسوس ہوئی۔ انھوں نے سمجھا کہ اس طرح رومی شہنشاہ عرب کے جنوبی علاقہ میں نفوذ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایرانیوں نے اس کے توڑ کے لیے یمن کے یہودی قبائل کو ملایا جن کو رومی سلطنت نے ۷۰ء میں شام سے نکال دیا تھا اور وہ وہاں سے جلا وطن ہو کر یمن میں آ بسے تھے۔ عیسائیوں اور رومیوں کی ضد میں یہودی بہت جلد ایرانیوں کے ساتھ ہو گئے۔ یوسف ذو نواس جو ایک عرب تھا اور پھر یہودی ہو گیا تھا ایرانیوں کی مدد سے اس نے صنعا پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہ ایک نیم آزاد عرب حکومت تھی جو ایرانیوں کے ماتحت قائم ہوئی تھی۔ یوسف ذو نواس نے یمن کی بادشاہت حاصل کرنے کے بعد عیسائیوں کو یمن سے ختم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ حتیٰ کہ ۵۲۳ء میں نجران کے بہت سے عیسائیوں کو زندہ جلا دیا۔

اب رومیوں کی باری تھی۔ قیصر روم نے یمن میں عیسائیت کے تحفظ کے نام پر اور حقیقتہً اپنے نفوذ کو بحال کرنے کے لئے ایک تدبیر کی۔ اس نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے استعمال کیا۔ نجاشی مذہباً عیسائی تھا اور رومی حکومت کے ماتحت تھا اس نے نجاشی کو ابھارا کہ یوسف ذو نواس سے بدلہ لے۔ نجاشی نے ایک حبشی سردار اریاط کو فوج دے کر روانہ کیا۔ اس نے مختصر جنگ کے بعد صنعا پر قبضہ کر لیا۔ ذو نواس نے سمندر میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔ کچھ دنوں بعد اریاط کی فوج کے ایک سردار ابرہہ نے بغاوت کر کے اریاط کو قتل کر ڈالا۔ اور نجاشی کو راضی کر کے صنعا کی حکومت کا فرمان حاصل کر لیا۔ یہی ابرہہ ہے جس نے ۵۷۱ء میں کعبہ پر حملہ کیا۔ ابرہہ کے بعد اس کا بیٹا یکسوم اور اس کے بعد دوسرا بیٹا مسروق حکمراں ہوا۔

سابق ملوک یمن کی اولاد میں ایک شخص سیف بن ذی یزن تھا۔ اس کو خیال ہوا کہ اپنے ملک کو غیر عربوں کے نفوذ سے پاک کرے اور اپنی آبائی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرے۔ اس نے یمن میں آزادی کی تحریک (حرکۃ تحریریۃ) چلائی، مگر مقامی تعاون مقصد کے حصول کے لئے ناکافی تھا۔ چنانچہ وہ ایرانی بادشاہ نوشیرواں کے پاس پہنچا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اپنی فوج سے یمن کی تحریک آزادی کی مدد کرے۔ ایرانی شہنشاہ کے لئے یہ سنہرا موقع تھا۔ اس نے ایک ایرانی سپہ سالار دھرز کی سرکردگی میں ایک لشکر یمن بھیجنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اس درمیان میں سیف بن ذی یزن مر گیا تاہم اس کا لڑکا معدی کرب ایرانی فوج کو یمن لانے میں کامیاب

ہوگیا۔ یہ لوگ خلیج عمان کو عبور کر کے حضرموت کے ساحل پر اترے۔ وہاں سے صنعار پہنچے۔ معدی کرب نے ایرانی لشکر کی مدد سے حبشہ کی فوج کو شکست دے دی اور حبشیوں کو یمن سے نکال دیا۔ اب معدی کرب صنعار کا بادشاہ تھا تاہم ایرانی فوج بھی یہاں مقیم رہی۔ معدی کرب کے مرنے کے بعد ایرانی فوج نے صنعار پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح صنعار ایرانی سلطنت کا ایک سمندر پار صوبہ بن گیا۔ جب اسلام یمن میں پہنچا ہے تو صنعار کے ایرانی گورنر باذان تھے جو بعد کو مسلمان ہو گئے۔

مذکورہ تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کی بعثت ہوئی تو عرب کا علاقہ کس طرح ایرانی اور رومی استعمار کی شکار گاہ بنا ہوا تھا۔ ان حالات میں ایک مصلح کے لئے بیک وقت دو راستے کھلے ہوئے تھے۔ ایک یہ کہ وقت کے حالات سے متاثر ہو کر "سامراجی طاقتوں" کے خلاف سیاسی لڑائی شروع کر دے۔ دوسرے یہ کہ خود اپنے اپنے آپ کو اندر اندر اتنا مضبوط بنایا جائے کہ سامراج کی عمارت معمولی کوشش سے گر پڑے۔ آپ نے اپنی مہم کے لئے پہلے طریقہ کے بجائے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۵ (فیل) اور سورہ نمبر ۱۰۶ (قریش) میں ابرہہ (حاکم یمن) کے مکہ کے خلاف جارحانہ منصوبہ کا ذکر ہے۔ مگر اس کے جواب میں جس عمل کی تلقین کی گئی ہے، وہ رب کعبہ کی عبادت (قریش۔۳) ہے۔ گویا اسلامی مزاج یہ ہے کہ سیاسی چیلنج درپیش ہو تو اس کا جواب بھی عبادتی عمل کی سطح پر تلاش کیا جائے۔

پیغمبرانہ طریق کار

اسلام کا آغاز ۶۱۰ء میں ہوا جب کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم (۶۳۲ - ۵۷۰) پر پہلی وحی اتری۔ اس وقت آپ ساری دنیا میں تنہا مومن و مسلم تھے۔ ۶۲۲ء میں آپ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے اور وہاں پہلی اسلامی مملکت قائم کی۔ اس وقت یہ اسلامی مملکت ایک چھوٹے سے شہر کے صرف چند حصوں پر مشتمل تھی۔ کیونکہ مدینہ کا بیشتر حصہ یہودیوں یا اب تک اسلام نہ لائے ہوئے عربوں کے قبضہ میں تھا۔ مگر اس کے گیارہ سال بعد جب پیغمبر اسلام کی وفات ہوئی تو اسلامی مملکت تقریباً دس لاکھ مربع میل (پورے عرب اور جنوبی فلسطین) پر پھیل چکی تھی۔ اس کے بعد سو برس سے بھی کم عرصہ میں اسلام ایک طرف شمالی افریقہ کے راستے سے اسپین اور دوسری طرف ایران کے راستے سے چین کی سرحدوں تک جا پہنچا۔ مشرقی یورپ میں اسلام کی پیش قدمی کی آخری حد بوڈاپسٹ (ہنگری) تھی جہاں آج بھی دریائے ڈانوب کے کنارے "گل بابا" کا ترکی طرز کا مزار نشانی کا کام دے رہا ہے۔ فرانس کے بعض گرجاؤں کے مناروں میں ایسے پتھر لگے ہوئے ہیں جن پر عربی عبارتیں کندہ ہیں۔ یہ آٹھویں صدی عیسوی کی یادگار ہے جب کہ فرانس کا جنوبی علاقہ خلیفہ دمشق کا یورپین صوبہ تھا۔ پیغمبر عربی کی امت نے شتربانی کے مقام سے آغاز کر کے ہجرت کے صرف دو سو برس بعد یہ حیثیت حاصل کر لی تھی کہ وہ دنیا کے امام بن گئے۔ ایران کے اصطخر، مصر کے ریمس اور یورپ کے روم کی جگہ اب دنیا کا فکری و تمدنی مرکز بغداد تھا۔

یہ شاندار کامیابی ایک انتہائی سادہ پروگرام کے ذریعہ حاصل ہوئی جو قرآن کے لفظوں میں حسب ذیل تھا:

یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ۔ قُمْ فَاَنْذِرْ، وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ، وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ	اے کپڑا اوڑھنے والے اٹھ، لوگوں کو ڈرا اور اپنے رب کی بڑائی بول۔ اور اپنے اخلاق کو اچھا بنا۔ اور گندی باتوں کو چھوڑ دے اور ایسا نہ کر کہ احسان کرے اور بدلہ چاہے اور اپنے رب کے لئے صبر کر۔

مدثر ۱-۷

اس پروگرام کا خلاصہ کریں تو اس کے صرف تین نکات قرار پائیں گے۔

۱۔ ذاتی اصلاح، اس طرح کہ خدا کی عبادت کی جائے، اپنے اخلاق کو درست کیا جائے اور ہر قسم کے برے کاموں کو چھوڑ دیا جائے۔

۲۔ انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کیا جائے کہ وہ ایک خدا کا بندہ ہے اور مرنے کے بعد اسے خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔

۳۔ اپنی اصلاح اور دوسروں کو آگاہی دینے کی اس جدوجہد میں جو مشکلات و مصائب پیش آئیں ان پر صبر کرتے ہوئے خدا کے فیصلہ کا انتظار کیا جائے۔

اندرونی طاقت

اسلامی جدوجہد اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک ذاتی جدوجہد ہے۔ ایک بندۂ مومن کو جو چیز متحرک کرتی ہے وہ تمام تر یہ جذبہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کے یہاں نجات حاصل کرسکے۔ اسلام جب کسی کے دل میں حقیقی طور پر جگہ کرتا ہے تو اس کے تمام جذبات اس ایک سوال پر مرکوز ہو جاتے ہیں کہ وہ کس طرح اپنے رب کی رحمت و مغفرت میں حصہ دار بنے۔ وہ اپنے خیالات، عقائد، اخلاق، اعمال اور زندگی کی تمام سرگرمیوں کو ایسے رخ پر ڈالنے کے لئے فکرمند ہو جاتا ہے جو اس کو آخرت میں خدا کی پکڑ سے بچا سکیں۔ وہ دوسروں کو اسلام کی طرف بلانے سے پہلے خود اول المسلمین بنتا ہے:

قُلْ اِنِّیٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ — کہو مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلا اسلام لانے والا بنوں۔ انعام - ۱۴

اول المسلمین بننا، باعتبار محرک، ایک انتہائی انفرادی واقعہ ہے۔ مگر باعتبار نتائج وہ وسیع ترین اجتماعی واقعہ بن جاتا ہے۔ یہ گویا اپنے اندر آتش فشاں کی تعمیر کرنا ہے جو بظاہر نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے مگر جب پھٹتا ہے تو سارے ماحول بلکہ سارے عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ قرآن کے نزول کی یہ ترتیب کہ ابتداءً عرصہ تک وہ سورتیں اترتی رہیں جن میں اندرونی اصلاح پر زور دیا گیا تھا، بیرونی اصلاح سے متعلق احکام بعد کو اترے، اس کی توجیہ کرتے ہوئے محمد مارماڈیوک پکتھال (۱۹۳۶ - ۱۸۷۵) نے اپنے ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس کے اندر ایک گہری معنویت ہے اور وہ یہ کہ پیغمبر کا الہام اندرونی چیزوں سے شروع ہو کر بیرونی چیزوں کی طرف آتا ہے:

The inspiration of the Prophet progressed
from inmost things to outward things

اکثر لوگ عمل کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ خارجی دنیا کے خلاف یورش شروع کردی جائے۔ مگر زیادہ گہرا عمل یہ ہے کہ خود اپنے اندرون کو اتنا طاقت ور بنایا جائے کہ جب وہ پھٹے تو کوئی چیز اس کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اندرون کو طاقت ور بنانے سے مراد کوئی روحانی ورزش یا "عملیات" نہیں ہیں بلکہ وہی چیز ہے جس کو قرآن میں ایمان اور عمل صالح اور صبر کہا گیا ہے۔ اپنی روح اور اپنے قلب و دماغ کی گہرائیوں میں خدائی حقیقتوں کو اتارنا، اپنے آپ کو حیاتی طور پر زیادہ سے زیادہ عالم بالا سے جوڑنا، اپنے کو مکمل طور پر اس قالب میں ڈھال لینا کہ "میرا کسی کے اوپر کوئی حق نہیں، میری اس دنیا میں صرف ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں ہیں"، راہ خدا میں جو کچھ پیش آئے، اس کو خاموشی سے اپنے اوپر لیتے رہنا، بجائے اس کے کہ اس کو دوسروں کے اوپر لوٹانے کی کوشش کی جائے۔ بس یہی وہ چیزیں ہیں جن کا نام اپنے اندرون کو طاقت ور بنانا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ

وسلم ان چیزوں کا انتہائی مکمل نمونہ بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی شخصیت اتنی بے پناہ ہوگئی کہ جو آپ کی زد میں آیا مسخر ہو کر رہ گیا۔ آپ کا یہ اندرونی طوفان جب پھٹا تو وہ اتنا بے پناہ ثابت ہوا کہ تقریباً ساری آباد دنیا نے اس کے اثرات محسوس کئے۔

ہندی کے ادیب سردار پورن سنگھ (۱۹۳۱ - ۱۸۸۲ء) کے ایک مقالہ کا عنوان ہے "بیرتا"۔ اس میں انھوں نے پیغمبر اسلام کو تاریخ کا سب سے بڑا بیر (بہادر) بتایا ہے جو "عرب کے ریگستان میں بارود کی طرح آگ لگا گئے، سکل پرتھوی بھے سے کانپ اٹھی"، جو لوگ ان کے سامنے آئے وے ان کے داس بن گئے"۔ وہ بیرتا کیا ہے جو کسی کو اتنا بل والا بنا دیتی ہے، انھیں کے الفاظ میں پڑھئے:

"اپنے آپ کو ہر گھڑی ہر پل مہان سے بھی مہان بنانے کا نام بیرتا ہے، کایر پرش کہتے ہیں "آگے بڑھے چلو" بیر کہتے ہیں "پیچھے ہٹ چلو" کایر کہتے ہیں "اٹھاؤ تلوار" بیر کہتے ہیں "سر آگے کرو"۔ بیروں کی پالیسی بل کو ہر طرح اکھٹا کرنے اور بڑھانے کی ہوتی ہے۔ بیر تو اپنے اندر ہی اندر مارچ کرتے ہیں۔ کیونکہ ہردے آکاش کے کیندر میں کھڑے ہو کر وے کل سنسار کو ہلا سکتے ہیں۔ بیر وہ بیر کیا جو ٹن کے برتن کی طرح جھٹ گرم اور جھٹ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ صدیوں نیچے آگ جلتی رہے تو بھی شاید ہی بیر گرم ہو، اور ہزاروں ورش برف اس پر جمتی رہے تو بھی کیا مجال جو اس کی بانی تک ٹھنڈی ہو۔ لوگ کہتے ہیں "کام کرو کام کرو"، پر ہمیں تو یہ باتیں نرر تھک معلوم ہوتی ہیں۔ پہلے کام کرنے کا بل پیدا کرو، اپنے اندر ہی اندر برکچھ کی طرح بڑھو۔ دنیا کسی کوڑے کے ڈھیر پر نہیں کھڑی کہ جس مرغ نے بانگ دی وہی سدھ ہو گیا۔ دنیا دھرم اور اٹل آدھیاتمک نیموں پر کھڑی ہے، جو اپنے آپ کو ان نیموں کے ساتھ ابھید کر کے کھڑا ہوا وہ دجئی ہو گیا"۔ (نبندھ چینیکا، مرتبہ مہندر چترویدی)

اس "بیرتا" یا اندرونی طاقت کا راز پراسرار عملیات یا روحانی ورزشیں نہیں ہیں جو کونوں یا گوشوں میں بیٹھ کر کی جاتی ہیں۔ "عملیات" کے ذریعہ جو طاقت حاصل ہوتی ہے وہ جمادات و حیوانات کی دنیا میں کچھ چمتکار دکھا سکتی ہے۔ مگر زندگی کے مقابلوں میں وہ ایک دن بھی انسان کے کام نہیں آتی۔ جب کہ حقیقی طاقت وہی ہے جو زندگی کے مقابلوں میں آدمی کو فاتح بنائے۔

اندرونی طاقت دراصل اس بات کا نام ہے کہ آدمی اپنے آپ کو نفسانی عواطف سے آزاد کر کے اس بلند تر ذہنی سطح پر پہنچا دے جہاں اس کے فیصلوں میں دوسرے اعتبارات (Considerations) کی کارفرمائی ختم ہو جائے اور حدیث کے الفاظ میں وہ "ارنا الاشیاء کما ھی" کا مقام حاصل کرلے۔ ضد، غصہ، طمع، نفرت، جاہ طلبی، خویش پروری، ذاتی مفاد اور اس قسم کے دوسرے میلانات کا ہالہ اس کے گرد اس کی رایوں اور اقدامات کو متاثر کرنے کے لئے باقی نہ رہے۔ ایسا شخص بے پناہ قوت تسخیر کا حامل ہو جاتا ہے۔ وہ ہر جانچ میں پورا اترتا ہے اس کے اقدامات ہر مقابلے میں لوہے کا ہتھوڑا ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے فیصلوں میں مسئلہ کے تمام متوقع اور غیر متوقع پہلوؤں کی رعایت شامل ہوتی ہے۔ مخالفتیں اس کی صداقت اور صلاحیت کو اور زیادہ نکھارنے والی بن جاتی ہیں۔

یہاں ہم فتح مکہ کے فوراً بعد پیش آنے والی ایک صورت حال کا ذکر کریں گے جس نے بیک وقت کئی مسئلے پیدا کئے مگر پیغمبر اسلام کی سیرت بتاتی ہے کہ آپ کی اندرونی طاقت ہر ایک کو حل کرتی چلی گئی۔ اس اندرونی طاقت کا اظہار کہیں عفو کی صورت میں ہوا، کہیں عالی حوصلگی اور اعتماد علی اللہ کی صورت میں۔ کہیں آپ اس لئے کامیاب رہے کہ آپ کو وہ نگاہ حاصل ہوگئی تھی جو ہمیشہ مستقبل کو دیکھتی تھی۔ کہیں آپ کے رویہ نے یہ ثابت کیا کہ جو اپنے کو بے غرض بنالے وہ اتنا بے پناہ ہو جاتا ہے کہ پھر اسے کوئی زیر نہیں کر سکتا۔

ہجرت کے آٹھویں سال جب آپ نے مکہ پر قبضہ کیا تو قریش کے کچھ لوگ بھاگ کر ہوازن و ثقیف کے قبائل میں پہنچے اور ان کو اکسا کر ایک نئی لڑائی کے لئے آمادہ کر دیا۔ وہ لوگ اپنی تمام قبائلی شاخوں کو اکٹھا کر کے ۲۰ ہزار کی تعداد میں جمع ہو گئے۔ حنین میں مقابلہ ہوا۔ جنگ کے آغاز ہی میں ہوازن کے تیر اندازوں نے جو گھاٹی میں چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے، اسلامی لشکر پر اتنی شدید تیر اندازی کی کہ مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور ۱۲ ہزار لشکر میں گیارہ ہزار سے بھی زیادہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ تاہم تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ابتدائی شکست کے بعد بالآخر مسلمانوں کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کامیابی کا راز پیغمبر کا وہی اندرون تھا جو اس نازک موقع پر سکینت قلب (توبہ ۔ ۲۶) اور اعتماد علی اللہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور اس نے دفعتاً بازی لوٹا دی۔ آپ نے دشمنوں کے عین نرغہ میں کھڑے ہو کر یہ رجز پڑھا:

انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب

آپ نے پکار کر کہا: اِلَیَّ عِبادَ اللّٰہ (خدا کے بندو میری طرف آؤ) حضرت عباس کی آواز بہت بلند تھی، آپ کے حکم سے انھوں نے چلا کر کہا "اے شجرۃ الرضوان کے سایہ میں بیٹھ کر موت کی بیعت کرنے والو، کہاں ہو" جب لوگوں نے دیکھا کہ ان کا سردار اپنی جگہ قائم ہے اور دشمنوں کی یلغار آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکی تو انھیں یقین ہو گیا کہ خدا کی مدد آپ کے ساتھ ہے۔ وہ نئے عزم کے ساتھ میدان جنگ کی طرف لوٹ پڑے۔ حتیٰ کہ جس کے اونٹ نے مڑنے میں دیر کی، وہ اپنی سواری سے کود کر پیدل آپ کی طرف دوڑ پڑا۔ اب جنگ کا نقشہ دوسرا تھا۔ فریق مخالف کی صفوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ مسلمانوں کو فتح ہوئی اور کثیر مقدار میں مال غنیمت ہاتھ آیا، جس میں ۲۴ ہزار اونٹ، ۴۰ ہزار بکریاں، ۴ ہزار اوقیہ چاندی اور ۶ ہزار قیدی تھے۔

اس فتح کے باوجود مسئلہ نے دوبارہ نئی شدید تر شکل اختیار کر لی۔ قبیلہ ثقیف، جو قریش کے بعد عرب کا دوسرا سب سے زیادہ زور آور قبیلہ تھا اور عرب کے واحد محصور شہر کا مالک تھا، طائف میں قلعہ بند ہو گیا۔ تین ہفتہ کے محاصرہ میں انھوں نے مسلمانوں کو اس سے زیادہ جانی نقصان پہنچایا جو حنین کی جنگ میں انھیں پہنچا تھا۔ ان کی سرکشی کا یہ عالم تھا کہ اس دوران طائف کا ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام لایا۔ یہ عروہ بن مسعود ثقفی تھے جو اپنے قبیلہ میں "کنواری لڑکیوں کی طرح محبوب" تھے۔ مگر جب وہ اسلام قبول کر کے طائف گئے تو طائف والوں نے انھیں تیر مار مار کر ہلاک کر دیا۔

یہاں آپ کی اندرونی طاقت ایک اور شکل میں ظاہر ہوئی۔ جب محاصرہ شدید ہو گیا۔ تو حضرت عمر نے نبی صلی اللہ

علیہ وسلم سے کہا کہ آپ طائف والوں کے لئے ہلاکت کی دعا فرمائیں۔ مگر آپ نے ان کے لئے ہدایت کی دعا فرمائی۔ آپ نے غصہ اور انتقام کے جذبہ کے تحت ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ تین ہفتہ کے بعد فوج کو حکم دیا کہ واپس چلو۔ اب آپ مقام جعرانہ پہنچے جہاں غزوہ حنین کا مال غنیمت جمع تھا۔ یہاں آپ کے لئے موقع تھا کہ ثقیف کی سرکشی کا بدلہ ان کے حلیف ہوازن سے لیں۔ مگر اس کے برعکس آپ نے یہ کیا کہ قبیلہ ہوازن کے بعض لوگوں کی ایک درخواست پر ان کے تمام کے تمام چھ ہزار قیدی چھوڑ دیئے اور انھیں کپڑے اور زادراہ کے ساتھ ان کے گھروں کو رخصت کیا۔ فیاضی اور وسعت ظرف کا یہ معاملہ اپنے اثرات پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ہوازن کے لوگ سب کے سب مسلمان ہو گئے۔

اس واقعہ کا اہل طائف پر گہرا اثر پڑا۔ ہوازن اور ثقیف ایک ہی بڑے قبیلہ کی شاخیں تھیں۔ ثقیف کو جب ہوازن کے اسلام کی خبر پہنچی تو ان کے لئے یہ واقعہ محاصرہ سے بھی زیادہ سنگین ثابت ہوا۔ انھیں محسوس ہوا کہ ان کا دایاں بازو ٹوٹ چکا ہے اور اب وہ مقابلہ آرائی میں کامیاب نہیں ہو سکتے:

ثم انهم ائتمروا بينهم، ورأوا انه لا طاقة لهم بحرب من حولهم من العرب وقد بايعوا واسلموا	پھر قبیلہ ثقیف نے آپس میں مشورہ کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ اردگرد کے عربوں سے لڑنے کی ان میں طاقت نہیں۔ اور وہ بیعت ہو چکے اور اسلام قبول کر چکے۔

تہذیب سیرۃ ابن ہشام، جلد ۲، صفحہ ۱۰۷

ہجرت کے نویں سال (۶۳۰) اہل طائف کا وفد مدینہ حاضر ہوا۔ انھوں نے اسلام قبول کرنے کی پیش کش کی۔ مگر اسی کے ساتھ اپنے لئے عجیب عجیب شرطیں تجویز کیں۔ "ان کی سرزمین کو فوجی گزرگاہ نہ بنایا جائے گا، وہ عشر نہ دیں گے۔ جہاد میں شرکت نہ کریں گے، نماز نہ پڑھیں گے، ان کے اوپر ان کے علاوہ کسی کو حاکم نہ بنایا جائے گا" آپ نے فرمایا تمھاری سب شرطیں منظور ہیں۔ مگر اس دین میں کوئی بھلائی نہیں جس میں رکوع نہ ہو (لا خیر فی دین لا رکوع فیہ) آپ کے اصحاب کو ان تحفظات کے ساتھ کسی کو مسلمان کرنا عجیب معلوم ہوا، مگر آپ کی نظریں دور تر مستقبل کو دیکھ رہی تھیں۔ آپ نے یہ کہہ کر انھیں مطمئن کر دیا:

بعد ذلك سيتصدقون ويجاهدون اذا اسلموا (اخرجه ابوداؤد عن وہب)	جب یہ لوگ اسلام میں داخل ہو جائیں گے تو اس کے بعد صدقہ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔

امام احمد نے حضرت انس سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب بھی قبول اسلام کے لئے کسی چیز کا سوال کیا گیا، آپ نے ضرور اسے وہ چیز دی۔ آپ کے پاس ایک آدمی آیا۔ آپ نے اس کے لئے اتنی کثیر بکریوں کے دینے کا حکم فرمایا جو دو پہاڑیوں کے درمیان حد نظر تک پھیلی ہوئی تھیں، وہ آدمی اپنی قوم کی طرف واپس گیا اور کہا: اے میری قوم تم لوگ اسلام قبول کر لو، کیونکہ محمدؐ اتنا زیادہ دیتے ہیں کہ انھیں محتاجی کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ راوی کہتے ہیں:

فان كان الرجل ليجيئ الى رسول الله صلى الله	آدمی آپ کے پاس آتا تھا اور اس کا مقصود صرف

علیہ وسلم ما یرید الا الدنیا فما یمسی حتیٰ یکون دینہ احب الیہ واعز علیہ من الدنیا ومافیہا (البدایہ والنہایہ)

دنیا ہوتی تھی۔ مگر اس پر شام نہیں گزرتی تھی کہ دین اس کے لئے دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے، اس سے زیادہ محبوب ہو جاتا تھا۔

ہوازن وثقیف کا مسئلہ حل ہوا تھا کہ اسی درمیان ایک اور شدید تر مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہوازن کی فتح کے بعد آپ کو جو کثیر اموال غنیمت حاصل ہوئے تھے، ان کو آپ نے نہایت فیاضی کے ساتھ مکہ کے تازہ نومسلموں میں تقسیم کیا۔ یہ چیز انصار کے بہت سے لوگوں پر شاق گزری۔ انھوں نے سمجھا کہ مکہ پہنچ کر پیغمبر کے اوپر "قرشیت" غالب آگئی اور انھوں نے اپنے بھائی بندوں کو خوش کرنے کے لئے سارا مال انھیں دے دیا۔ یہ ایک انتہائی نازک مسئلہ تھا۔ مگر آپ نے جو کچھ کیا تھا، سطحی عواطف سے بلند ہو کر کیا تھا۔ اس لئے آپ کے پاس اس کے جواب میں کہنے کے لئے نہایت مؤثر چیز موجود تھی۔

آپ نے انصار کے تمام لوگوں کو ایک احاطہ میں جمع کیا اور تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔ آپ نے فرمایا: "اے انصار یہ کیا باتیں ہیں جو میرے کانوں تک پہنچ رہی ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ تم گمراہ تھے، میرے ذریعہ سے اللہ نے تمھیں ہدایت دی۔ تم محتاج تھے، میرے ذریعہ اللہ نے تم کو غنی بنایا۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اللہ نے میرے ذریعہ تم کو متحد کیا۔" لوگوں نے کہا "ہاں"۔ آپ نے دوبارہ فرمایا:

واللہ لوشئتم لقلتم فصدقتم وصدقتم جئتنا طریدا فآویناك وعائلا فآسیناك وخائفا فآمناك ومخذولا فنصرناك ..... اوجدتم فی نفوسکم یا معشر الانصار فی لعاعة من الدنیا تالفت بہا قوما اسلموا ووکلتکم الی ما قسم اللہ لکم من الاسلام افلا ترضون یا معشر الانصار ان یذھب الناس الی رحالھم بالشاء والبعیر وتذھبون برسول اللہ الی رحالکم (رواہ احمد من حدیث ابن اسحاق)

خدا کی قسم تم چاہو تو کہہ سکتے ہو اور تم کہو گے تو سچ کہو گے کہ آپ ہمارے پاس نکالے ہوئے آئے تھے، ہم نے آپ کو پناہ دی۔ آپ محتاج آئے تھے، ہم نے آپ کی غم خواری کی۔ آپ خوف زدہ آئے تھے ہم نے آپ کو امن دیا۔ آپ بے یار و مددگار آئے تھے ہم نے آپ کی مدد کی۔ .... اے گروہ انصار! کیا تم دنیا کی معمولی چیز کے لئے بددل ہو گئے جس سے میں نے نومسلموں کی تالیف قلب کی ہے اور تم کو اس چیز کا وکیل بنایا ہے جس کو اللہ نے تمھیں عطا کیا ہے یعنی اسلام۔ اے گروہ انصار! کیا تم اس پر راضی نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکری لے کر اپنی منزلوں کی طرف جائیں اور تم اللہ کے رسول کو لے کر اپنی منزل کی طرف جاؤ۔

یہ تقریر سن کر سارے لوگ رو پڑے۔ انھوں نے چیخ کر کہا: ہم اللہ کے رسول کے ساتھ راضی ہیں۔" اس طرح آپ

کی اندرونی طاقت ایک ایسی شاہ کلید بن گئی کہ جو بند دروازہ بھی اس کے سامنے آیا، اس کا قفل اس نے کھول دیا۔ آپ کی شخصیت کے سیلاب کے آگے کوئی چیز ٹھہر نہ سکی۔

خارجی نشانہ: دعوت

پیغمبر اسلام نے مکہ میں جو عملی جدوجہد شروع کی اس کی اہم بات یہ تھی کہ وہ خارجی دنیا کے خلاف ردعمل کے طور پر وجود میں نہیں آئی، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ بلکہ خود اپنے مثبت فکر کے تحت وضع کی گئی تھی۔ آپ کی بعثت ہوئی تو آپ کے گرد و پیش وہ تمام حالات پوری شدت کے ساتھ موجود تھے جو عام طور پر سیاسی، معاشی اور سماجی تحریکوں کی بنیاد ہوا کرتے ہیں۔ مگر آپ نے ان میں سے کسی کو بھی دعوت کا عنوان نہیں بنایا۔ بلکہ انتہائی یکسوئی کے ساتھ مندرجہ بالا پروگرام کی طرف پُرامن جدوجہد شروع کر دی۔

پیغمبر اسلام کی بعثت جس زمانہ میں ہوئی، آپ کا وطن وقت کی "سامراجی طاقتوں" کی شکار گاہ بنا ہوا تھا۔ خاص طور پر عرب کا وہ حصہ جو نسبتاً زیادہ زرخیز اور مالدار حیثیت رکھتا تھا، تمام تر اغیار کے ہاتھوں میں تھا۔ جزیرۂ عرب کے شمال میں شام کا علاقہ پورا کا پورا رومی سلطنت کے زیر اقتدار تھا۔ اس کے اوپر روم کے ماتحت امرائے عرب کی حکومت قائم تھی۔ اسی طرح جنوب میں یمن کا علاقہ ایران کے زیر اقتدار تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہاں جو ایرانی گورنر مقیم تھا، اس کا نام باذان ہے۔ عربوں کے ہاتھ میں صرف حجاز، تہامہ اور نجد کے علاقے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ چٹیل اور بے آب و گیاہ بیابان تھے، جن میں کہیں کہیں کچھ زرخیز ٹکڑے نظر آتے تھے۔ کسریٰ (شہنشاہ فارس) نے جب آپ کے مکتوب کو پھاڑ دیا اور کہا یکتب الی بھذا وھو عبدی (میرا غلام ہو کر مجھ کو اس طرح لکھتا ہے) تو اس کا محرک یہی سیاسی پس منظر تھا۔

پیغمبر اسلام کی پیدائش کے سال (۵۷۰) مکہ پر ابرہہ کا حملہ بھی اسی استحصال کا ایک جزو تھا، جو عرب کے جنوبی حصہ پر قابض تھا۔ اسلام سے قبل خانہ کعبہ عرب کا ایک بہت بڑا بت خانہ تھا۔ اس میں تمام قوموں اور قبیلوں کے بت رکھے ہوئے تھے۔ اس طرح وہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے لئے مقدس مقام بن گیا تھا۔ تمام سال لوگ مکہ آتے رہتے تاکہ اپنے بتوں کی زیارت کریں اور نذریں چڑھائیں۔ اس سے مکہ کی تجارت قائم تھی۔ ابرہہ نے چاہا کہ اس تجارتی مرکزیت کو اپنی طرف منتقل کر لے۔ وہ جنوبی عرب (یمن) میں حبشی فوجوں کا سردار تھا اور حاکم حبشہ کے ماتحت تھا۔ اس نے حبشی حاکم کو قتل کر دیا اور خود حاکم بن گیا۔ حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے مجبوراً اسے حاکم تسلیم کر لیا۔ ابرہہ مذہباً عیسائی تھا۔ اس نے صنعاء میں ایک بہت بڑا گرجا تعمیر کیا۔ اس گرجا کے چند کاریگروں کے نام بھی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ اب اس نے گرجا کے بارے میں پروپگنڈا شروع کیا تاکہ لوگ اس کی زیارت کے لئے آنے لگیں اور مکہ کی تجارتی اہمیت صنعاء کی طرف منتقل ہو جائے۔ مگر جب ساری کوشش کے باوجود وہ زائرین کو اپنی تعمیر کردہ عبادت گاہ کی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو اس نے ارادہ کیا کہ مکہ کے کعبہ کو ڈھا کر ختم کر دے تاکہ لوگ مکہ کے بجائے صنعاء آنے پر مجبور ہو جائیں۔ چونکہ وہ ہاتھیوں کی فوج کے ساتھ حملہ آور

ہوا تھا، وہ "ہاتھی والے" کے نام سے مشہور ہوا۔ عرب کی تاریخ میں یہ اتنا اہم واقعہ تھا کہ وہ جس راستہ سے گزرا عربوں نے اس کا نام صراط الفیل رکھا۔ جس چشمہ پر قیام کیا اس کو عین الفیل اور جہاں سے شہر میں داخل ہوا اس کو باب الفیل کہا گیا۔ جس سال اس نے حملہ کیا تھا اس کا نام عام الفیل پڑ گیا۔

ان حالات میں قیادت کے معروف تصور کا تقاضا تھا کہ آپ پڑوسی حکومتوں کی استعماری سیاست کے خلاف ایک جوابی سیاسی تحریک اٹھائیں اور وطن کو بیرونی اثرات سے پاک کرنے کے لئے لوگوں کے قومی جذبات کو بیدار کریں۔ مگر آپ نے اس قسم کی کوئی تحریک اٹھانے سے مکمل پرہیز کیا۔

اسی طرح اس وقت کی عرب دنیا "غیر ذی زرع" ہونے کی وجہ سے معاشیات کی کسی ذاتی بنیاد سے یکسر محروم تھی۔ یہ اس ریگستانی علاقہ کے ایک ایک شخص کا مسئلہ تھا اور نہایت آسانی سے ایک "انقلابی تحریک" کا عنوان بن سکتا تھا۔ مگر آپ نے اس قسم کے کسی بھی اقتصادی نعرہ سے مکمل طور پر پرہیز کیا۔ ایک بار مکہ کے شرفا کی ایک جماعت غروب آفتاب کے بعد کعبہ کے سامنے جمع ہوئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بات چیت کے لئے بلایا۔ آپ نے جب اپنی دعوت پیش کی تو انھوں نے کہا:

یا محمد قد علمت ان لیس من الناس احد اضیق منا بلداً، ولا اقل ماءً، ولا اشد عیشا منا، فسل لنا ربک الذی بعثک بما بعثک بہ فلیسیر عنا ھذہ الجبال التی قد ضیقت علینا ولیبسط لنا بلادنا، ولیفجر لنا فیھا انھارا کانھار الشام والعراق

تہذیب سیرۃ ابن ہشام، جلد اول، صفحہ ۶۷

اے محمد، آپ کو خوب معلوم ہے کہ ہمارا ملک سب سے زیادہ تنگ حال ہے۔ دنیا میں ہم سے زیادہ بے آب کوئی نہیں۔ ہمارے لئے زندگی نہایت مشکل ہے۔ بس اپنے رب سے کہئے کہ وہ ان خشک پہاڑوں کو ہم سے ہٹا دے جنھوں نے ہمیں تنگی میں ڈال رکھا ہے اور ہمارے لئے ہمارے ملک کو کشادہ کرے اور اس میں شام اور عراق جیسی ندیاں جاری کر دے۔

مکہ کے سرداروں کی یہ تقریر اس پس منظر میں تھی کہ نجد و حجاز کے پہاڑوں نے اس علاقہ کو سمندری ہواؤں سے روک رکھا ہے جس کے نتیجہ میں یہاں شام و عراق کی طرح بارشیں نہیں ہوتیں اور سارا علاقہ خشک پڑا رہتا ہے۔ اس طرح یہ اقتصادی ابتلاء آپ کو زبردست موقع دے رہا تھا کہ آپ اقتصادی مشن لے کر اٹھیں اور آناً فاناً لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیں۔ مگر آپ نے اس قسم کے مسائل کی طرف کوئی براہ راست توجہ نہ دی بلکہ اپنے آپ کو تمام تر کلمۂ توحید کی تبلیغ کے لئے وقف کر دیا۔ اگرچہ بعد کی تاریخ نے ثابت کیا کہ دعوتی مہم میں ہر قسم کے سیاسی اور اقتصادی امکانات بھی چھپے ہوئے ہیں۔ مگر وہ بالواسطہ نتیجہ کے طور پر آتے ہیں نہ کہ براہ راست جدوجہد کے طور پر۔

پیغمبر اسلام کی پوری زندگی ثابت کرتی ہے کہ آپ کے نزدیک اصل اہمیت دعوت کی تھی۔ نبوت ملی تو آپ نے دوسری تمام باتوں کو چھوڑ کر ساری توجہ دعوت پر مرکوز کر دی۔ آپ نے اپنے اہل خاندان سے کہا کہ مجھے خدا نے اپنی پیغام رسانی کے کام پر مقرر کیا ہے، تم لوگ میرا ساتھ دو۔ آپ نے اپنے خاندان کے لوگوں کو کھانے پر مدعو کیا۔ یہ تقریباً چالیس مرد تھے جن میں سے تیس افراد جمع ہوئے۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہو چکے تو آپ نے تقریر کی مگر کوئی آپ کا ساتھ دینے کے لئے نہ اٹھا:

يابني عبد المطلب! اني بعثت اليكم خاصة و الى الناس عامة فمن يضمن عني ذيني ومواعيدي ويكون معي في الجنة ويكون خليفتي في اهلي ـــ فاعاد رسول الله صلى الله عليه وسلم المنطق فقال عليؓ : انا يا رسول الله، فقال انت يا علي، انت يا علي (رواه البزار)

اے بنو عبد المطلب! میں تم لوگوں کی طرف خاص طور پر اور تمام لوگوں کی طرف عام طور پر بھیجا گیا ہوں، پس تم میں سے کون میرے قرضوں اور میرے وعدوں کی ذمہ داری میری طرف سے لیتا ہے اور میرے اہل میں میرا قائم مقام بنتا ہے اور وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بار اسی بات کو دہرایا تو حضرت علیؓ (جو اس وقت نوجوان تھے) نے کہا "میں یا رسول اللہ"۔ آپ نے فرمایا: تم اے علی! تم اے علی!

ایک بار ابوجہل نے آپ کو پتھر کھینچ کر مارا جس سے خون بہنے لگا۔ یہ خبر آپ کے چچا عباس کو پہنچی، وہ اگرچہ اس وقت اسلام نہیں لائے تھے۔ مگر خاندانی عصبیت جوش میں آئی، ابوجہل کے یہاں جا کر اس کو مارا اور پھر آپ کے پاس آکر بولے "بھتیجے! میں نے تمہارا بدلہ لے لیا"، آپ نے فرمایا "چچا! مجھے اس میں زیادہ خوشی ہوتی کہ آپ اسلام قبول کر لیتے" قریش کے لوگ ابوطالب کے پاس آئے اور کہا:

یا اباطالب! ان ابن اخيك يأتينا في افنيتنا وفي نادينا فيسمعنا ما يوذينا به فان رأيت ان تكفه عنا فافعل

اے ابوطالب! تمہارا بھتیجا ہمارے میدانوں میں اور ہماری مجلسوں میں آتا ہے اور ہم کو وہ باتیں سناتا ہے جس سے ہم کو تکلیف ہوتی ہے۔ اگر تم سے ہو سکے تو اس کو ہمارے پاس آنے سے روک دو۔

ابوطالب نے اپنے لڑکے عقیل کے ذریعہ آپ کو بلایا اور ان سے قریش کی بات کہی:

فحلق ببصره الى السماء فقال: والله ما انا باقدر ان ادع ما بعثت به من ان يشعل احدكم من هذه الشمس شعلة من نار (البداية والنهاية)

آپ نے اپنی نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی اور کہا کہ خدا کی قسم میں اس پر قادر نہیں کہ جو پیغام دے کر مجھے بھیجا گیا ہے اس کو چھوڑ دوں، جیسے تم میں سے کوئی شخص اس پر قادر نہیں کہ سورج سے آگ کا ایک شعلہ جلائے۔

یہ کہہ کر آپ رو پڑے (ثم استعبر رسول الله صلى الله عليه وسلم فبكى)

آپ کے خاندان بنو ہاشم کو چونکہ مکہ میں ہر قسم کی سیادت حاصل تھی، ابتداءً لوگوں کو شبہ ہوا کہ یہ "باحوصلہ نوجوان" شاید بادشاہ بننے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ مگر آپ کے مسلسل عمل نے ثابت کر دیا کہ آپ کے سامنے آخرت کی پیغام رسانی کے سوا اور کچھ نہیں ـــ ایک مرتبہ آپ نے ابوجہل کو دعوت دی تو اس نے کہا:

يا محمد هل انت منته عن سب آلهتنا هل تريد الا ان نشهد انك قد بلغت فنحن نشهد انك قد بلغت (البداية والنهاية)

اے محمدؐ! کیا تم ہمارے معبودوں کو برا کہنے سے رک جاؤ گے۔ تم یہی تو چاہتے ہو کہ ہم گواہی دیں کہ تم نے پہنچا دیا تو ہم گواہی دیتے ہیں کہ تم نے پہنچا دیا۔

شعب ابی طالب کی پناہ گزینی کے زمانہ میں حرام مہینوں میں پابندی ختم ہو جاتی تھی، آپ کے خاندان کے لوگ اس موقع کو خرید و فروخت میں استعمال کرتے تھے۔ وہ قربانی کے جانوروں کے گوشت جمع کرتے تاکہ ان کو سکھا کر رکھ لیں اور سال کے بقیہ مہینوں میں کھاتے رہیں۔ مگر آپ اس فرصت کے موقع پر قبائل کی قیام گاہوں کی طرف نکل جاتے اور ان کو اسلام کی دعوت پہنچاتے۔ ہجرت کا سفر انتہائی نازک سفر تھا۔ مگر اس سفر میں بھی آپ نے دعوت و تبلیغ جاری رکھی۔ سیرت کی کتابوں میں اس سلسلے میں متعدد واقعات کا ذکر ہے۔ مثلاً مقام غمیم پر بریدہ بن حصیب کو دعوت دینا جس کے نتیجہ میں وہ اور ان کے ۸۰ گھروں کا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ اسی طرح رکوبہ گھاٹی پر آپ کی ملاقات دو آدمیوں سے ہوئی۔ آپ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا اور وہ ایمان لائے۔ آپ نے ان کا نام پوچھا۔ انھوں نے کہا ہم قبیلہ اسلم کے لوگ ہیں۔ ہمارا پیشہ ڈاکہ زنی تھا۔ اس لئے ہم کو مُہانان (دو ذلیل آدمی) کہا جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا:

بل انتما المکرمان (مسند احمد عن ابن سعد) نہیں تم دو باعزت آدمی ہو۔

آپ نے صحابہ کا مزاج یہ بنایا کہ ملکوں کو فتح کرنا اور مال غنیمت حاصل کرنا بڑی چیز نہیں۔ بڑی چیز یہ ہے کہ تمھارے ذریعہ اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو ایمان کی دولت عطا فرمائے۔ غزوہ خیبر میں جب آپ نے حضرت علی کو جھنڈا عطا کیا تو ان سے فرمایا:

انفذ علی رسلک حتیٰ تنزل بساحتهم ثم ادعهم الی الاسلام واخبرهم بما یجب علیهم من حق اللہ تعالیٰ فیه، فواللہ لان یهدی اللہ بک رجلا واحدا خیر لک من ان یکون لک حمر النعم (متفق علیہ)	نرمی کے ساتھ جاؤ۔ جب ان کے میدان میں پہنچ جاؤ تو ان کو اسلام کی دعوت دو، اور ان کو بتاؤ کہ ان پر اللہ کے کیا حقوق ہیں۔ خدا کی قسم، اگر تمھارے ذریعہ سے اللہ ایک شخص کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمھارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔

آپ کی زندگی میں یہ پہلو اس قدر نمایاں ہے کہ اس کا کوئی ایک عنوان دینا ہو تو وہ "دعوت" کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ آپ نے عام رواج کے مطابق سیاسی، معاشی، تمدنی مسائل کو نشانہ نہیں بنایا، بلکہ ساری توجہ دعوت الی اللہ پر مرکوز کر دی۔ ابتدا میں بظاہر یہ ایک کام نظر آتا تھا، مگر جب آخری نتیجہ سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ یہ وہ سرا ہے کہ اگر وہ ہاتھ آجائے تو بقیہ چیزیں خود بخود ہاتھ آتی چلی جاتی ہیں۔

صبر و استقامت

اب صبر کو لیجئے۔ صبر کا لفظ عربی زبان میں ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب کہ کسی چیز میں اثر پذیری کے بجائے جماؤ کی کیفیت بتانا مقصود ہو۔ مثلاً صبارۃ سخت بنجر زمین کو کہتے ہیں جو بیج کو قبول نہ کرے۔ اسی طرح بہادر کو صبور کہتے ہیں، کیونکہ وہ خارجی دباؤ کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی شخصیت کو قائم رکھتا ہے۔

یہ صبر اس انسان کی اعلیٰ ترین صفت ہے جس کے اندر اسلام ایک مقصد بن کر شامل ہو گیا ہو۔ اسلام اس کے اندر ایسی حرارت پیدا کر دیتا ہے جس کے بعد وہ سست نہیں پڑتا۔ وہ کمزوری نہیں دکھاتا۔ وہ عاجزی ظاہر نہیں کرتا (آل عمران ۱۴۶)

ایمان و اسلام کا مطلب خدا پر اعتماد کرنا ہے، اور جو شخص خدا پر اعتماد کرے وہ انتہاہ طاقت کا مالک ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے کسی مرحلہ پر بے صبری کا کوئی سوال نہیں رہتا۔

۱۔ ایک شخص جب اسلام کا علم بردار بن کر کھڑا ہوتا ہے تو اس کو فوراً محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود تو خدا کی مقرر کی ہوئی حدود و قیود میں بندھا ہوا ہے، جب کہ دوسرا فریق آزاد ہے کہ جو طریقہ چاہے اپنی کامیابی کے لئے اختیار کرے۔ اس کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنی ساری قوت دعوت و تبلیغ کی مہم پر صرف کرے، جب کہ دوسرے لوگ سیاسی کارروائیوں اور اقتصادی تدبیروں سے اپنی پوزیشن کو مستحکم بنا رہے ہیں۔ اس کو ہر حال میں اخلاقی حدود میں رہنے کا پابند کیا گیا ہے، جب کہ دوسرے لوگ اس قسم کی تمام بندشوں سے آزاد ہیں۔ اس طرح کی باتیں داعیٔ اسلام کو اس حد تک متاثر کر سکتی ہیں کہ وہ اسلامی طریق کار کو ہلکا سمجھنے لگے اور اس کے دل میں یہ خیال پرورش پانے لگے کہ اسے بھی وہی طریقے اختیار کرنے چاہئیں جو دوسرے لوگ اختیار کر رہے ہیں۔ یہاں "صبر" اس کے لئے رکاوٹ بنتا ہے۔ صبر اس کو اس بات سے روکتا ہے کہ وہ اپنے طریق عمل کو ہلکا اور بے اثر سمجھنے لگے:

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِينَ لَا يُوقِنُونَ — روم — ۶۰ — اے نبی صبر کر، بے شک اللہ کا وعدہ سچ ہے اور نہ سبک کریں تجھ کو وہ لوگ جو یقین نہیں رکھتے۔

۲۔ اسلام کی راہ میں صبر کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ فریق ثانی کی طرف سے جو مصیبتیں ڈالی جائیں، ان کو مکمل طور پر برداشت کیا جائے:

وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَىٰ مَا آذَيْتُمُونَا — ابراہیم — ۱۲ — (نبیوں نے کہا) ہم صبر کریں گے اس پر جو ایذا تم ہم کو دیتے ہو۔

یہ صبر بذات خود دعوت حق کا ایک جزء ہے۔ کیونکہ داعی اگر مدعو کی جوابی کارروائیوں سے گھبرا اٹھے یا جزع فزع کرنے لگے تو یہ بات مشتبہ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی دعوت میں سنجیدہ ہے اور واقعتہً اللہ کی رضا جوئی کے لئے لوگوں کو حق کا پیغام دینے اٹھا ہے۔ یہ مصائب تو درحقیقت اس کی سنجیدگی کا امتحان ہیں اور کسی کے لئے اس کی دعوت اسی وقت قابل قبول ہو سکتی ہے جب کہ وہ اس کے سامنے اپنے آپ کو مکمل طور پر سنجیدہ ثابت کر دے۔

۳۔ مخالف کی طرف سے جب کوئی چیز ڈالی جائے تو آدمی عام طور پر یہ کوشش کرتا ہے کہ اُس کو خود مخالف کے اوپر لوٹا دے۔ اس کے مقابلہ میں صبر یہ ہے کہ خاموشی کے ساتھ اس کو اپنے اوپر لے لیا جائے۔ مثال کے طور پر اگر کسی جگہ اہل اسلام کو مدعو قوم کی طرف سے اس اقتصادی تعصب کا سامنا پیش آئے کہ یکساں لیاقت رکھتے ہوئے ان کی جگہ دوسرے کا انتخاب کیا جانے لگے تو یہ مطالبہ لے کر اٹھنا صبر کے خلاف ہوگا کہ "ہمارے ساتھ مساویانہ سلوک کرو" اس کے برعکس انھیں یہ کرنا چاہئے کہ اس وار کو اپنے اوپر لے لیں۔ یعنی اگر ماحول مساوی لیاقت کی بنیاد پر انھیں ان کا حق دینے کے لئے تیار نہیں ہے تو امتیازی لیاقت پیدا کر کے اسے حاصل کریں۔ مکی دور میں ہجرت حبشہ ایک اعتبار سے اسی قسم کا ایک عمل تھا۔ مکہ کے لوگوں نے جب مسلمانوں کے لئے مکہ میں تجارت کے دروازے بند کر دیئے تو انھوں نے پڑوسی ملک میں محنت مزدوری کر کے اپنی معاش حاصل کرنا شروع کر دیا۔ وہاں انھوں نے ایمان داری اور محنت کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ شاہ حبش (نجاشی) نے منادی کے ذریعہ

اعلان کرایا کہ جو شخص کسی مسلمان کو ستائے، وہ اس کے بدلے اس مسلمان کو ۸ درہم تاوان دے۔

صبر بظاہر ایک سلبی چیز معلوم ہوتی ہے۔ مگر اپنے نتائج کے اعتبار سے وہ ایک اعلیٰ ترین ایجابی عمل ہے جس میں آدمی اپنے حریف کے مقابلہ میں فوری جوابی کارروائی کرنے کے بجائے دور تر عوامل پر اعتماد کرتا ہے۔ جب آپ کسی ظلم یا اشتعال انگیزی کے جواب میں فوری اقدام کرتے ہیں تو اس وقت آپ کی کارروائی ایک متاثر ذہن سے نکلی ہوئی کارروائی ہوتی ہے۔ اس کا نقشہ آدمی کے ابلتے ہوئے جذبات کے زور پر بنتا ہے۔ بجائے اس کے کہ خارجی حقائق و امکانات کا بے لاگ جائزہ لے کر اس کے مطابق گہری منصوبہ بندی کی جائے، جس کا دوسرا نام صبر ہے۔

صبر کا مطلب یہ ہے کہ فریق ثانی کو فوری طور پر خود جواب دینے کے بجائے خدا کے ابدی قوانین کو اس کے خلاف کارفرما ہونے کا موقع دیا جائے۔

جب آدمی بے صبری کے ساتھ حریف کے مقابلہ میں دوڑ پڑتا ہے تو اس وقت اس کے رہنما سفلی جذبات اور سطحی محرکات ہوتے ہیں۔ وہ لازماً ایسی غلطیاں کرتا ہے جس سے اس کا مقدمہ کمزور ہو جائے۔ اس کے برعکس جب آدمی صبر سے کام لیتا ہے تو اس وقت اس کے اندر کی وہ ربانی قوت اپنا عمل کرنے کے لئے بیدار ہو جاتی ہے جس کو عقل کہتے ہیں۔ انسان کی عقل ایک حیرت انگیز قوت ہے۔ وہ دیوار کے اُس پار دیکھتی ہے اور مستقبل میں جھانک کر اس میں چھپے ہوئے حقائق کو معلوم کر لیتی ہے۔ عقل کو منفی جذبات سے الگ کر کے سوچنے کا موقع دیا جائے تو وہ حقیقت کی گہرائیوں میں جا کر ان سروں کو دریافت کر لیتی ہے جن کے ہاتھ آ جانے کے بعد حریف کے تمام اطراف و جوانب اس طرح قابو میں آ جاتے ہیں جیسے کوئی شکار کسی مضبوط جال میں پھنس جائے اور اس کے بعد اس کی ہر حرکت اس کے اوپر شکاری کی گرفت کو مضبوط کرنے والی ثابت ہو۔

ہجرت کا واقعہ اسی قسم کی ایک مثال ہے۔ جب قریش نے فیصلہ کر لیا کہ آپ کو قتل کر دیں تو ایک صورت یہ تھی کہ آپ ان کی تلوار کے سامنے کھڑے ہو جاتے۔ اس کے برعکس آپ نے ٹھنڈے دماغ سے سوچ کر یہ فیصلہ کیا کہ مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے جائیں۔ دوسرے لفظوں میں اپنا مقام عمل تبدیل کر دیں۔ حضرت عائشہ بتاتی ہیں کہ ہجرت سے پہلے آپ روزانہ میرے والد (ابوبکرؓ) کے مکان پر آتے اور آئندہ اقدام کے بارے میں مشورہ کرتے۔ چھ مہینے تک نہایت رازداری کے ساتھ ساری تیاریاں مکمل کی گئیں۔ اس کے بعد ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت آپ ایک معتمد رہنما کو لے کر مدینہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ ایک پرجوش قائد جو حریف سے لڑ کر شہادت کی یادگار قائم کرنے کو سب سے بڑا کمال سمجھتا ہے، اس کے نقطۂ نظر سے دیکھئے تو ہجرت ایک قسم کا فرار معلوم ہوگی۔ مگر نتائج کے اعتبار سے دیکھئے تو یہ واحد عظیم واقعہ ہے جس نے اسلامی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔

اسی طرح صبر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے اقدام سے رک کر فطرت کو کام کرنے کا موقع دے۔ انسانی فطرت ایک دائمی حقیقت ہے اور اگر خارجی پردے ہٹا دیئے جائیں تو وہ انسانی زندگی میں انتہائی فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ فطرت کے اندر ہمیشہ اس آدمی کے لئے نرم گوشہ ہوتا ہے جو گالی کے جواب میں چپ رہ گیا ہو۔ فطرت اپنی اندرونی آواز کے تحت مجبور ہے کہ ظالم کے بجائے مظلوم کو حق پر سمجھے۔ فطرت کی دنیا میں محرومیوں سے استحقاق پیدا ہوتا ہے اور ضبط و استقامت سے اس کا برسرِ حق ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال پیغمبر اسلام اور آپ کے خاندان کا مقاطعہ ہے جو نبوت کے ساتویں سال پیش آیا اور

مہم کے نتیجہ میں ابولہب کو چھوڑ کر سارے بنو ہاشم کو ایک پہاڑی درّہ (شعب ابی طالب) میں محصور ہونا پڑا۔ ایک مقصد کی خاطر نہایت خاموشی کے ساتھ بدترین ظلم کو سہتے رہنا فطرت انسانی میں اپنی بازگشت پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ تین سال گزرے تھے کہ خود دشمنوں کے اندر ابوالبختری، ہشام بن عمرو، زہیر بن امیہ، زمعہ بن الاسود اور مطعم بن عدی جیسے متعدد لوگ پیدا ہوگئے۔ انھوں نے قریش کے لیڈروں سے لڑ کر معاہدہ کو چاک کر ڈالا اور بنو ہاشم کو اس ظالمانہ مقاطعہ سے نجات مل گئی۔

صبر کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اس سے نصرت الٰہی کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔ جب ایک شخص صحیح مقصد کی خاطر صبر کرتا ہے تو وہ اپنے مسائل کے لئے مالک کائنات کے اوپر بھروسہ کرتا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص ایک صحیح مقصد کے لئے مالک کائنات پر بھروسہ کرے اور وہ اس کے بھروسہ کو پورا نہ کرے۔

اس نصرت کے بے شمار طریقے ہیں۔ کوئی شخص نہ ان کو جان سکتا اور نہ ان کا احاطہ کرسکتا۔ تاہم اسلام اور غیر اسلام کے مقابلہ میں آنے والی ایک خاص نصرت یہ ہے کہ مادی حالات میں موافق کمی بیشی پیدا کردی جائے۔ اور اہل ایمان کے دل میں اعتماد کی کیفیت ڈال دی جائے اور مخالفین کے دل میں رعب:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا

اے ایمان والو، اللہ کا انعام اپنے اوپر یاد کرو جب تم پر فوجیں چڑھ آئیں تو ہم نے ان پر بھیجی آندھی اور ایسا لشکر جس کو تم نے نہیں دیکھا۔ احزاب - ۹

یہ آیت غزوۂ احزاب (۶۲۷ء) سے متعلق ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی مدد پر دو چیزیں بھیجی تھیں۔ ہوا، اور فرشتوں کی فوج۔ ہوا کوئی انوکھی چیز نہیں۔ وہ ایک دبیز غلاف کی شکل میں ہر وقت کرۂ ارض کے چاروں طرف لپٹی ہوئی موجود ہے۔ مگر ایک خاص وقت میں ایک خاص مقام پر اس کے اندر تیزی پیدا کردی گئی۔ جس کے نتیجہ میں وہ اہل ایمان کے لئے نصرت بن گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی گروہ کی مدد کرنا چاہتا ہے تو مادی واقعات میں شدت پیدا کردیتا ہے جس کا نتیجہ اس کے حق میں کامیابی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

فرشتوں کی فوج کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر تلوار چلاتے تھے۔ یہ درحقیقت ایک قسم کی نفسیاتی مدد تھی نہ کہ عام معنوں میں حربی مدد۔ وہ اس لئے آتے تھے کہ ایک طرف مسلمانوں کے دلوں میں ثبات اور دوسری طرف مخالفین اسلام کے دلوں میں رعب پیدا کریں (انفال ـ ۱۲) وہ مسلمانوں کی نظر میں مخالفین اسلام کی فوج کو کم کرکے دکھاتے تھے اور مخالفین اسلام کی نظر میں مسلمانوں کی فوج کو بہت زیادہ کردیتے تھے (انفال ـ ۴۴)

عہد فاروقی میں سعد بن ابی وقاص اسلامی لشکر کو لے کر قادسیہ میں اترے جو عربوں کے نزدیک ایران کا دروازہ تھا۔ یہاں زیادہ دنوں تک قیام کرنا پڑا اور کھانے پینے کی چیزیں ختم ہوگئیں۔ حضرت سعد نے کچھ لوگوں کو روانہ کیا کہ کہیں سے بکریاں اور گائیں تلاش کرکے لائیں۔ انھیں ایک ایرانی ملا جس سے انھوں نے بکریوں اور گایوں کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے کہا مجھے کچھ علم نہیں۔ حالاں کہ وہ خود ایک چرواہا تھا اور اس نے اسلامی لشکر کی خبر سن کر اپنے مویشیوں کو

قریب کے گھنے جنگل میں چھپا دیا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ تاریخ کے الفاظ میں یہ ہے:

فصاح ثور منھا کذب الراعی، ھا نحن فی ھٰذہ الاجمۃ	ایک بیل چلایا، چرواہا جھوٹا ہے۔ ہم یہاں اس جھاڑی میں موجود ہیں۔

آواز سن کر وہ لوگ جنگل میں گھس گئے اور کچھ مویشیوں کو ہانکتے ہوئے حضرت سعد کے پاس لے گئے۔ اسلامی لشکر کو جب یہ قصہ معلوم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے اور اس کو خدا کی ایک کھلی ہوئی امداد سمجھا۔ مگر، جیسا کہ مورخ ابن الطقطقی نے لکھا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ بیل نے یہ عربی جملہ کہا کہ "ہم یہاں ہیں" بلکہ یہ اس کی عام آواز میں ایک ڈکار تھی۔ اور اس ڈکار سے مسلمانوں نے سمجھا کہ یہاں مویشی موجود ہیں۔ (الفخری، صفحہ ۷۹)

اللہ پر بھروسہ

"اگر دشمن صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اس کی طرف جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ بلاشبہ وہ خوب سنتا اور جانتا ہے، اگر وہ تم کو دھوکا دینا چاہیں تو اللہ تمھارے لئے کافی ہے (انفال ۶۲-۶۱) قرآن کا یہ حکم اسلامی طریق کار کا خلاصہ ہے۔ اسلام کا طریقہ اصلاً غیر حربی طریقہ ہے۔ حتیٰ کہ فریق مخالف کی طرف سے دھوکے کا اندیشہ ہو تب بھی اہل اسلام کو خدا کے بھروسہ پر مصالحت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

اس حکم کا مدعا یہ ہے کہ غیر حربی میدان، بالفاظ دیگر وہ میدان جہاں دوسروں سے ٹکراؤ پیدا کئے بغیر تم اپنے لئے مواقع کار پا رہے ہو، وہاں اپنی قوتوں کو لگا دو۔ اور اس کے علاوہ عمل کے جو دوسرے دائرے ہیں، وہاں قدرت کی طاقتوں کو بروئے کار آنے کا موقع دو۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی دو فریق متصادم ہوں تو وہاں تیسرا زیادہ طاقت ور فریق موجود ہوتا ہے اور وہ رب العالمین کی ذات ہے۔ اگر ہم اپنی قوتوں کو اپنے ممکن دائرہ میں محدود رکھیں تو بقیہ دائرہ میں خدا ہمارے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ اپنے حاصل شدہ دائرۂ عمل کو چھوڑ کر دوسروں کے دائرۂ عمل میں چھلانگ لگانا گویا خدا کے دائرہ سے اپنے کام کا آغاز کرنا ہے۔ ایسا آغاز صرف غضب الٰہی کو بھڑکاتا ہے۔ وہ کسی کے لئے خدا کی رحمت و نصرت کو کھینچنے والا نہیں بن سکتا۔

پیغمبر مکہ میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ زندگی کے دو بڑے دور ہیں۔ ایک کو مکی دور کہا جاتا ہے، دوسرے کو مدنی دور۔ مکہ اور مدینہ دو شہروں کے نام ہیں۔ ان الفاظ کو آپ لغت میں دیکھیں تو ان کے یہی معنی آپ کو وہاں لکھے ہوئے ملیں گے۔ مگر کچھ معانی وہ ہیں جو تاریخ کسی لفظ میں شامل کرتی ہے۔ مکہ اور مدینہ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ ابتدائی معنی کے اعتبار سے یہ دونوں الفاظ دو شہروں کے نام ہیں۔ مگر تاریخ کے اعتبار سے وہ اسلامی عمل کے دو پہلوؤں کی علامت بن گئے ہیں۔ مکہ دعوت کی علامت ہے اور مدینہ انقلاب کی علامت۔ مکی دور اسلام کو دعوتی قوت کی حیثیت سے اٹھانے کا نام ہے اور مدنی دور اس کو ماحول میں غالب اور سربلند کرنے کا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود، ذلک مثلھم فی التوراۃ، ومثلھم فی الانجیل کزرع اخرج شطأہ فآزرہ فاستغلظ فاستوی علی سوقہ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار، وعد اللہ الذین آمنوا وعملوا الصالحات منھم مغفرۃ واجرا عظیما (الفتح)

محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ منکرین پر سخت ہیں اور آپس میں نرم دل ہیں۔ تم ان کو دیکھتے ہو رکوع اور سجدہ میں۔ وہ اللہ کا فضل تلاش کرتے ہیں۔ ان کے چہروں پر نشان ہے سجدہ کے اثر سے، یہ مثال ان کی تورات میں ہے۔ اور ان کی مثال انجیل میں یہ ہے جیسے کھیتی نے اپنا انکھوا نکالا پھر اس کو مضبوط کیا۔ پھر وہ موٹا ہوا۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا اپنے تنہ پر۔ وہ اچھا لگتا ہے کھیتی والوں کو تاکہ منکروں کا دل جلائے۔ اللہ نے وعدہ کیا ہے معافی اور اجر عظیم کا ان سے جو ایمان لائے اور نیک کام کیا۔

مذکورہ آیت میں تورات کے حوالہ سے پیغمبر اسلام کے ساتھیوں کے انفرادی اوصاف کا ذکر

ہے اور اس کے بعد انجیل کے حوالہ سے ان کے اجتماعی ارتقار کا۔ پہلے جزر کی تربیت مکہ میں ہوئی اور دوسرے جزر کی تکمیل مدینہ میں۔

پیغمبر اسلام کی جو سیرتیں لکھی گئی ہیں، ان کا انداز عام طور پر یہ ہوتا ہے گویا آمنہ کے پیٹ سے ایک پُر عجوبہ شخصیت نکلی اور اس نے پُر اسرار طریقوں سے پورے عرب کو مسخر کر ڈالا۔ سیرت کی کتابیں انسانی تاریخ سے زیادہ کرامات و معجزات کی ایک طلسماتی داستان نظر آتی ہیں۔ یہ ذوق اتنا بڑھا کہ جن واقعات میں کوئی معجزاتی پہلو نہ تھا وہاں بھی لوگوں نے اپنے قوت تخیل سے کوئی نہ کوئی چیز ڈھونڈ نکالی۔ مثال کے طور پر صہیب بن سنان رض کی ہجرت کے بارے میں آتا ہے کہ جب وہ مکہ سے روانہ ہوئے تو قریش کے کچھ نوجوانوں نے انھیں آگے بڑھ کر روکا۔ صہیب نے کہا، اگر میں تمھیں اپنا مال دے دوں تو کیا تم مجھے جانے دوگے۔ انھوں نے کہا ہاں۔ چنانچہ چند اوقیہ سونا جو صہیب کے پاس تھا، وہ سب انھوں نے ان کو دے دیا اور مدینہ پہنچ گئے۔ بیہقی کی ایک روایت میں ان کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے:

فلما رآنی قال: یا ابا یحییٰ ربح البیع فقلت یا رسول اللہ ما سبقنی الیك احد وما اخبرك الا جبرائیل علیہ السلام	حضرت صہیب کہتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مدینہ میں دیکھا تو فرمایا: اے ابو یحییٰ تمھاری یہ تجارت بڑی نفع بخش رہی۔ میں نے کہا یا رسول اللہ مجھ سے پہلے آپ تک مکہ سے کوئی نہیں آیا یہ خبر یقیناً آپ کو جبریل فرشتہ نے دی ہے۔

مگر یہی واقعہ ابن مردویہ اور ابن سعد نے نقل کیا ہے تو اس کے الفاظ یہ ہیں:

فخرجتُ حتی قدمت المدینۃ، فبلغ ذلك النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال ربح صہیب، ربح صہیب	میں قریش کے لوگوں کو اپنا مال دے کر مکہ سے روانہ ہوا۔ یہاں تک کہ مدینہ پہنچ گیا۔ اس کی اطلاع نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے فرمایا: صہیب کی تجارت نفع بخش رہی، صہیب کی تجارت نفع بخش رہی۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کی پوری زندگی ایک سادہ انسانی واقعہ ہے اور اسی لئے وہ ہمارے لئے نمونہ ہے۔ آپ کو راستہ چلتے ہوئے اسی طرح ٹھوکر لگی جس طرح عام انسان کو لگتی ہے (بخاری) آپ کے مخاطبین اولین کو آپ کا صاحب الہام ہونا اس لئے ناقابل فہم نظر آیا کہ آپ انھیں بظاہر اپنے ہی جیسے ایک انسان نظر آتے تھے:

فانك تقوم بالاسواق وتلتمس المعاش کما نلتمسہ (البدایہ والنہایہ)	آپ بازار میں خرید و فروخت کرتے ہیں اور اسی طرح تلاش معاش کرتے ہیں جس طرح ہم کرتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر خدا کی زندگی کی عظمت اس کے انسانی واقعہ ہونے میں ہے نہ کہ پُر اسرار معجزاتی داستان ہونے میں۔ آپ کی کامیابی نصرت الٰہی کے تحت ہوئی، اس لحاظ سے بلاشبہ وہ معجزہ تھی۔ مگر اس معجزۂ الٰہی کا ظہور "بشر رسول" کی سطح پر ہوا نہ کہ کراماتی شخصیت کی سطح پر۔

قرآن میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی جو تصویر دی گئی ہے، اس کو سامنے رکھا جائے تو آپ کی یہی تصویر اس کے مطابق نظر آئے گی۔

آغاز دعوت

اپنی زندگی کے چالیسویں سال جب آپ کو غار حرا میں پہلی وحی ملتی ہے تو آپ پر ٹھیک وہی ردعمل ہوتا ہے جو ایک "انسان" پر ہونا چاہئے۔ آپ خوف زدہ حالت میں گھر واپس آتے ہیں۔ یہاں آپ کی بیوی خدیجہ ہیں۔ وہ خود واقعۂ وحی سے الگ ہونے کی وجہ سے اس پوزیشن میں تھیں کہ اس کے بارے میں غیر متاثر رائے قائم کرسکیں۔ چنانچہ وہ آپ سے کہتی ہیں:

کلا واللہ ما یخزیک اللہ ابدا، انک لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدم وتقری الضیف وتعین علیٰ نوائب الحق
(صحیحین عن عائشہ)

ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم، اللہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپ رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ بے روزگاروں کو کمانے کے قابل بناتے ہیں مہمان نوازی کرتے ہیں اور مصیبت کے وقت لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

دعوت کی جدوجہد کے سلسلہ میں آپ کے یہاں وہی فطری ترتیب نظر آتی ہے جو کسی نئے ماحول میں ایک داعی کو پیش آتی ہے۔ حالات کا تقاضا تھا کہ اولاً پوشیدہ طور پر کام کیا جائے:

ذکر ابن اسحاق ان علی بن ابی طالب جاء وھما یصلیان۔ فقال علی: یا محمد ماھذا، قال: دین اللہ الذی اصطفیٰ لنفسہ وبعث بہ رسلہ فادعوک الی اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ والیٰ عبادتہ وان تکفر باللات والعزیٰ، فقال علی: ھذا امر لم اسمع بہ قبل الیوم فلست بقاض امرا حتیٰ احدث بہ ابا طالب فکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یفشی علیہ سرہ قبل ان یستعلن امرہ، فقال لہٗ: یا علی، اذ لم تسلم فاکتم، فمکث علی تلک اللیلۃ ثم ان اللہ اوقع فی قلب علی الاسلام فاصبح غادیا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتیٰ جاءہ فقال: ما عرضتَ علیّ یا محمدؐ فقال لہٗ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: تشہد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ وتکفر باللات والعزیٰ وتبرأ من الانداد، ففعل علی واسلم۔ ومکث یاتیہ علیٰ خوف من ابی طالب

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ علی بن ابی طالب آپ کے گھر میں آئے، اس وقت آپ اور حضرت خدیجہ نماز پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے پوچھا اے محمد! یہ کیا ہے۔ آپ نے جواب دیا: اللہ کا دین جس کو اس نے اپنے لئے منتخب کیا اور اس کی تبلیغ کے لئے اپنے رسول بھیجے۔ میں تم کو ایک اللہ کی طرف بلاتا ہوں، اس کا کوئی شریک نہیں اور اس کی عبادت کی تلقین کرتا ہوں۔ اور یہ کہ تم لات وعزیٰ کو ماننا چھوڑ دو۔ علی بن ابی طالب نے کہا، یہ ایسی بات ہے جس کو آج سے پہلے میں نے نہیں سنا۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا جب تک اپنے باپ ابوطالب سے اس کی بابت بات نہ کرلوں۔ آپ کو یہ پسند نہیں آیا کہ اعلان سے پہلے یہ راز کھل جائے۔ آپ نے کہا اے علی، اگر تم اسلام نہیں لاتے تو اس معاملہ کو پوشیدہ رکھو۔ علی بن ابی طالب اس رات رکے رہے پھر اللہ نے ان کے دل میں اسلام ڈال دیا۔ اگلے روز صبح وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا، اے محمد! کل آپ نے مجھ سے کیا کہا تھا۔ آپ نے فرمایا، گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔

وکتم علی اسلامہ ولم یظھرہ

(البدایہ والنہایہ ج ۳ ۔ ص ۲۴)

اور لات وعزیٰ کو نہ مانو، اور جن کو خدا کا شریک وسہیم بنایا جاتا ہے، ان سے اظہار بیزاری کرو۔ علی نے اس پر عمل کیا اور اسلام لے آئے۔ اس کے بعد ابو طالب کے ڈر سے آپ کے پاس چھپ چھپ کر آتے رہے اور علی نے اپنے اسلام کو چھپائے رکھا اس کو ظاہر نہ کیا۔

اوس وخزرج کے ابتدائی مسلمان جب یثرب واپس ہوئے تو آغاز میں ان کا طریقہ بھی یہی تھا کہ خفیہ طور پر دعوتی کام کرتے (فرجعوا الی قومھم یدعوھم سرا، طبرانی)

آپ نے اپنی پوری زندگی میں شدت سے اس کا اہتمام رکھا کہ کوئی اقدام اس وقت سے پہلے نہ کیا جائے جب کہ اس کی طاقت پیدا ہو چکی ہو۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ۳۸ صحابہ جمع ہو گئے تو حضرت ابو بکر نے آپ سے "ظہور" کے لئے اصرار کیا۔ یعنی اب ہم لوگ سامنے آجائیں اور کھلم کھلا تبلیغ کریں۔ مگر آپ کا جواب تھا: یا ابا بکر! انا قلیل (اے ابو بکر ابھی ہم تھوڑے ہیں) اسی طرح نبوت کے چھٹے سال جب حضرت عمر اسلام لائے تو انھوں نے آپ سے کہا "اے خدا کے رسول! ہم کیوں اپنے دین کو چھپائیں جب کہ ہم حق پر ہیں۔ اس کے برعکس دوسروں کا دین نمایاں رہے، حالاں کہ وہ باطل پر ہیں"، آپ نے انھیں بھی یہی جواب دیا: یا عمر! انا قلیل۔ آپ کا یہی انداز مسلسل جاری رہا۔ یہاں تک کہ ہجرت کے بعد جب اسلامی طاقت ایک جگہ منظم اور مرتکز ہو گئی اور قریش فوج لے کر اس کے استیصال کے لئے آگئے، اس وقت مقابلہ کی اجازت دی گئی۔ بدر کے میدان میں جب آپ کے اصحاب نے اسلام دشمنوں سے مقابلہ شروع کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ھذا الیوم لہ ما بعدہ۔ گویا اہل اسلام کے لئے عملی اقدام کا وقت وہ ہوتا ہے جب کہ وہ اس پوزیشن میں ہو جائیں کہ اپنے اقدام سے اسلام کے لئے نیا مستقبل پیدا کر سکتے ہوں۔ اس سے پہلے عملی اقدام جائز نہیں۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ کو دعوت عام کی ذمہ داری سونپی گئی تو آپ کو احساس ہوا کہ یہ بہت بڑا کام ہے جس کے لئے ہمہ تن مصروف ہونا ضروری ہے۔ آپ نے چاہا کہ آپ کے خاندان کے لوگ آپ کی اقتصادی ذمہ داریوں میں آپ کے کفیل ہو جائیں تاکہ آپ اس کام کو بخوبی طور پر انجام دے سکیں۔ آپ نے اپنے مکان پر خاندان عبد المطلب کو جمع کیا جو اس وقت تقریباً ۴۰ افراد پر مشتمل تھے۔ ایک روایت کے مطابق ۳۰ آدمی جمع ہوئے۔ آپ نے ان کو بتایا کہ خدا نے مجھے نبوت عطا کی ہے تم لوگ میرے ساتھ تعاون کرو تاکہ میں اس ذمہ داری کو ادا کر سکوں:

یا بنی عبد المطلب! انی بعثت الیکم خاصۃ والی الناس عامۃ فایکم یبایعنی علی ان یکون اخی وصاحبی۔ من یقض عنی دینی ومواعیدی ویکون معی فی الجنۃ ویکون خلیفتی فی اھلی فقال رجل: یا محمد، انت

اے خاندان عبد المطلب! میں تمھاری طرف خاص طور پر اور تمام لوگوں کی طرف عام طور پر بھیجا گیا ہوں پھر تم میں سے کون مجھ سے اس پر بیعت کرتا ہے کہ وہ میرا بھائی اور ساتھی ہو گا۔ تم میں سے کون میرے قرضوں اور میرے وعدوں کا ضامن

کنت بحرا من یقدم بهذا	بنتا ہے اور میرے پیچھے میرے گھر والوں کا ذمہ دار بنتا ہے اور وہ
(اخرجہ احمد عن عائشہ)	جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ ایک شخص بولا، اے محمد، آپ تو ایک سمندر ہیں۔ کون اس ذمہ داری کے لئے کھڑا ہو سکتا ہے۔

آپ کا خاندان آپ کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ عباس بن عبدالمطلب آپ کے چچا تھے۔ وہ اقتصادی حیثیت سے اس پوزیشن میں تھے کہ آپ کی ذمہ داری لے سکیں۔ مگر وہ بھی خاموش رہے (فسکت العباس خشیۃ ان یحیط ذلک بمالہ) مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کی نصرت فرمائی۔ اولاً آپ کی اہلیہ خدیجہ بنت خویلد اور اس کے بعد ابوبکر صدیقؓ کا مال مکی زندگی میں آپ کا اقتصادی سہارا بنا رہا۔

لوگوں کو دعوت حق پہنچانے کے لئے آپ بچوں کی طرح حریص تھے۔ ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباس سے نقل کیا ہے کہ مکہ کے ممتاز لوگ ایک روز غروب آفتاب کے بعد کعبہ کے پاس جمع ہوئے اور آپ کو بات چیت کے لئے بلایا (بعثوا الیہ ان اشراف قومک قد اجتمعوا لک لیکلموک) اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں:

فجاءھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سریعا وھو یظن انہ قد بدا لھم فی امرہ بدء و کان علیھم حریصاً یحب رشدھم ویعز علیہ عنتھم (ابن جریر عن ابن عباس)	پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم تیزی سے آئے۔ آپ کو خیال ہوا کہ شاید انھیں قبول حق کی طرف کچھ میلان ہو گیا ہے اور آپ قریش کی ہدایت کے لئے بے حد حریص تھے اور ان کی ہلاکت آپ پر بہت گراں گزرتی تھی۔

مگر بلانے والوں نے آپ کو محض بحث مباحثہ کے لئے بلایا تھا نہ کہ بات ماننے کے لئے۔ چنانچہ طویل گفتگو کے بعد آپ غمگین واپس لوٹے:

ثم انصرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی اھلہ حزیناً آسفا لما فاتہ مما کان یطمع بہ من قومہ حین دعوہ ولما رائ من مباعدتھم ایاہ (تہذیب سیرۃ ابن ہشام جلد ۱، صفحہ ۶۸)	نبی صلی اللہ علیہ وسلم حزن اور افسوس کے ساتھ اپنے گھر واپس آئے کیونکہ قوم سے جس چیز کی امید لگا کر گئے اس کو نہ پایا۔ وہ لوگ اس سے بہت دور تھے۔

اسی طرح ابوطالب کے مرض الموت میں جب لوگ ان کے پاس جمع ہوئے تو انھوں نے کہا کہ ہمارے اور اپنے بھتیجے کے درمیان اپنی موت سے پہلے کچھ طے کر دیجئے (فخذ لنا منہ وخذ لہ منا لیکفّ عنا ولنکف عنہ) ابوطالب نے آپ کو بلایا اور پوچھا کہ قوم سے آپ کیا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تقولون لا الٰہ الا اللہ وتخلعون ما تعبدون من دونہ۔ مگر قوم اس کو ماننے پر تیار نہ ہوئی۔ اس کے بعد جب لوگ چلے گئے تو ابن اسحاق کی روایت کے مطابق ابوطالب نے کہا، بھتیجے! خدا کی قسم میرا خیال ہے کہ تم نے قوم سے کسی مشکل چیز کا مطالبہ نہیں کیا۔ (واللہ یا ابن اخی! ما رأیتک سألتھم شططا، ۹۷) ابوطالب کی زبان سے یہ جملہ سن کر آپ کی جو کیفیت ہوئی وہ یہ تھی:

قال، فطمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیہ	راوی کہتے ہیں، یہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوطالب

فجعل یقول لہ، ای عم انت فقلها استحل لک بہا الشفاعۃ یوم القیامۃ (البدایہ والنہایہ)

کے بارے میں امید پیدا ہوگئی اور آپ ان سے کہنے لگے، اے چچا پھر آپ ہی اس کلمہ کو کہہ دیجئے تاکہ قیامت کے دن میرے لئے آپ کی سفارش کرنا حلال ہو جائے۔

آپ مدعو کی طرف سے ہر قسم کے اشتعال کو آخری حد تک برداشت کرتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد ہند بنت عتبہ بن ربیعہ آپ کی خدمت میں بیعت کے لئے حاضر ہوئی۔ آپ نے بیعت کے الفاظ ادا کرتے ہوئے حسب معمول جب یہ فرمایا: تم اپنی اولاد کو قتل نہیں کروگی، تو ہند فوراً بولی:

وھل ترکت لنا اولادا نقتلھم (ابن کثیر)

(جنگ کے بعد) کیا آپ نے ہمارے لئے کوئی اولاد چھوڑی ہے جس کو ہم قتل کریں۔

مگر آپ نے اس کے طنزیہ جملہ کا کوئی اثر نہیں لیا اور اس کو خوشی کے ساتھ بیعت کر لیا۔

اس مشن کی راہ میں آپ نے نہ صرف اپنے وقت اور اپنے جسم و دماغ کی ساری طاقت لگا دی۔ بلکہ اپنا سارا اثاثہ بھی اس کی راہ میں قربان کر دیا۔ نبوت سے پہلے مکہ کی ایک دولت مند خاتون سے نکاح کی وجہ سے آپ کافی مال دار ہو گئے تھے۔ مکہ کے ابتدائی دور میں ایک بار سرداران قریش نے عتبہ بن ربیعہ کو اپنا نمائندہ بنا کر آپ کے پاس گفتگو کے لئے بھیجا۔ وہ آپ کے پاس پہنچ کر خود ہی مرعوب ہو گیا:

ولم یخرج الی اھلہ واحتبس عنھم فقال ابوجھل: واللہ یا معشر قریش ما نریٰ عتبۃ الا صبا الیٰ محمد واعجبہ طعامہ وما ذاک الا من حاجۃ اصابتہ، انطلقوا بنا الیہ فاتوہ، فقال ابوجھل: واللہ یا عتبۃ ما جئنا الا ان صبوت الیٰ محمد واعجبک امرہ فان کان بک حاجۃ جمعنا لک من اموالنا ما یغنیک عن طعام محمد، فغضب واقسم باللہ لا یکلم محمدا ابدا

(البدایہ والنہایہ جلد ۳)

اور عتبہ اس کے بعد گھر بیٹھ رہا اور لوگوں کے پاس نہ گیا۔ ابوجہل نے کہا اے برادران قریش، خدا کی قسم، میرا خیال ہے کہ عتبہ محمد کی طرف مائل ہو گیا اور اسے محمد کا کھانا پسند آ گیا اور یقیناً اسے کسی حاجت کی بنا پر ایسا کرنا پڑا۔ آؤ ہم عتبہ کے پاس چلیں۔ چنانچہ وہ گئے۔ ابوجہل نے کہا اے عتبہ: خدا کی قسم ہم کو اس لئے آنا پڑا کہ تم محمد کی طرف مائل ہو گئے اور ان کا معاملہ تم کو پسند آ گیا۔ اگر تمھیں ضرورت ہو تو ہم تمھارے لئے اتنا مال جمع کر دیں جو تمھیں محمد کے کھانے سے بے نیاز کر دے، عتبہ یہ سن کر بگڑ گیا اور قسم کھا کر کہا کہ میں محمد سے کبھی بات نہ کروں گا۔

اسی طرح عبداللہ بن عباس سے منقول ہے کہ ولید بن مغیرہ آپ کے پاس آیا۔ آپ نے اس کو قرآن سنایا۔ قرآن کے ادب نے اس کو شدید طور پر متاثر کیا۔ ابوجہل کو معلوم ہوا تو وہ ولید بن مغیرہ کے یہاں پہنچا اور اس سے کہا، لوگوں کا ارادہ ہے کہ تمھارے لئے مال جمع کریں۔ کیوں کہ تم کو محمد کے مال کی خواہش ہو گئی ہے۔

اس قسم کی مالی حیثیت سے آپ نے نبوت کا آغاز کیا۔ مگر تیرھویں سال جب آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی

تو آپ کے پاس کچھ باقی نہ رہا تھا حتیٰ کہ آپ نے حضرت ابوبکرؓ سے قرض لے کر سامان سفر درست کیا۔

دعوت کی زبان

دعوت اسلامی کے بنیادی نکات، منطقی طور پر، اگرچہ اتنے متعین ہیں کہ وہ انتہائی یکسانیت کے ساتھ شمار کئے جا سکتے ہیں۔ مگر دعوت کے کلمات جب داعی کی زبان سے نکلتے ہیں تو اس میں ایک اور چیز شامل ہو جاتی ہے، اور وہ داعی کی اپنی ذات ہے۔ یہ اضافہ دعوت کو ایک متعین مضمون کی ریکارڈنگ کے بجائے اس کو ایک ایسا زندہ عمل بنا دیتا ہے۔ جو با عتبار حقیقت ایک ہونے کے باوجود اتنی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے جس کی کوئی لگی بندھی فہرست نہیں بنائی جا سکتی۔ داعی کے سینے میں خوف خدا سے لرزتا ہوا دل، مدعو کے ایمان کے لئے بچوں کی سی معصوم اور بے قرار تمنا، یہ جذبہ کہ اگر میں خدا کے بندوں کو خدا کے قریب کر سکوں تو خدا مجھ سے خوش ہو جائے گا، یہ چیزیں نہ صرف کلمات دعوت میں کیفیت کا اضافہ کرتی ہیں بلکہ اس کو با عتبار ظاہر انتہائی متنوع بھی بنا دیتی ہیں۔ کیوں کہ مدعو کو متاثر کرنے کا پُرشوق جذبہ اس کو مجبور کرتا رہتا ہے کہ ہر ایک کے ذہن کی مکمل رعایت کرتے ہوئے اس کے سامنے اپنی بات رکھے۔

پیغمبر اسلام کی زندگی میں یہ چیز کامل درجہ میں نظر آتی ہے۔ آپ شب و روز دعوت پہنچانے میں مشغول رہتے تھے۔ مگر آپ کا طریقہ یہ نہ تھا کہ کچھ مقرر الفاظ کو ہر ایک کے سامنے دہرا دیا کریں، بلکہ مخاطب کی رعایت کرتے ہوئے اس کے سامنے اپنی بات رکھتے تھے۔

مکہ کے ابتدائی زمانہ میں ایک بار آپ نے ابوسفیان اور ان کی بیوی ہند کو دعوت دی۔ ابن عساکر کی روایت کے مطابق آپ نے حسب ذیل الفاظ کہے:

یا اباسفیان بن حرب و یا هند بنت عتبة! والله لتموتن ثم لتبعثن ثم ليدخلن المحسن الجنة والمسيئ النار وانا اقول لكم بحق	اے ابوسفیان اور اے ہند! خدا کی قسم تم کو ضرور مرنا ہے۔ اس کے بعد تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔ پھر جو بھلا ہو گا جنت میں داخل ہو گا اور جو برا ہو گا جہنم میں جائے گا اور میں جو کچھ کہہ رہا ہوں حق کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔

ابن خزیمہ نے نقل کیا ہے کہ مکہ کے ایک بزرگ حصین سے آپ کی گفتگو اس طرح ہوئی:

قال یا حصین! کم تعبد من اله، قال سبعا في الارض وواحدا في السماء قال فاذا اصابك الضر من تدعو، قال الذي في السماء، قال فاذا هلك المال من تدعو، قال الذي في السماء قال: فيستجيب لك وحده وتشركه معهم (الاصابہ، جلد ۱)	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے حصین! کتنے معبودوں کی پرستش کرتے ہو۔ حصین نے کہا سات کی زمین میں اور ایک جو آسمان پر ہے۔ آپ نے فرمایا۔ جب مصیبت آئے تو کس کو پکارتے ہو۔ حصین نے کہا آسمان والے کو۔ آپ نے فرمایا جب مال پر تباہی آئے تو کس کو پکارتے ہو۔ حصین نے کہا آسمان والے کو۔ آپ نے فرمایا وہ اللہ تو

تنہا تمھاری فریاد رسی کرتا ہے اور تم اس کے ساتھ شریک کرتے ہو۔

امام احمد نے ابو امامہ سے نقل کیا ہے کہ ایک قبیلہ کا آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور دریافت کیا کہ خدا نے آپ کو کیا چیز دے کر بھیجا ہے (بماذا ارسلک) آپ نے فرمایا:

بان توصل الارحام وتحقن الدماء وتؤمن السبیل وتکسر الاوثان ویعبد اللہ وحدہٗ لا یشرک بہ شیٔ	یہ کہ صلہ رحمی کی جائے۔ قتل ناحق سے بچا جائے۔ راستوں میں امن رکھا جائے۔ بتوں کو توڑا جائے۔ صرف ایک خدا کی عبادت کی جائے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔

مدینہ پہنچنے کے بعد اہل نجران کو آپ نے دعوتی مکتوب روانہ کیا تو اس کے الفاظ یہ تھے:

انی ادعوکم الی عبادۃ اللہ من عبادۃ العباد وادعوکم الی ولایۃ اللہ من ولایۃ العباد	میں تم کو بندوں کی عبادت سے خدا کی عبادت کی طرف بلاتا ہوں۔ بندوں کی ولایت سے خدا کی ولایت کی طرف بلاتا ہوں

ایک مستقل اور اہم ترین ذریعہ تبلیغ کا خود قرآن تھا۔ آپ کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی شخص ملتا تو اس کو قرآن کا کوئی حصہ پڑھ کر سناتے۔ روایتوں میں اکثر اس قسم کے الفاظ آتے ہیں: ثم ذکر الاسلام وتلا علیھم القرآن، فعرض علیھم الاسلام وقرأ علیھم القرآن۔ قرآن کی کشش عربوں کے لئے اتنی حیرت انگیز تھی کہ اسلام کے بعض کٹر مخالفین بھی راتوں کو چھپ کر آپ کے مکان کے پاس آتے اور آپ قرآن پڑھ رہے ہوتے تو دیوار سے لگ کر اسے سنتے۔ قرآن کا آسمانی ادب عربوں کو بے پناہ طور پر متاثر کرتا تھا۔ ولید بن مغیرہ جب قریش کا نمائندہ بن کر آپ کے پاس آیا تو آپ نے اس کو قرآن کے حصے پڑھ کر سنائے۔ اس سے وہ اتنا مرعوب ہوا کہ واپس جا کر قریش سے کہا یہ تو اتنا بلند کلام ہے کہ دوسرے تمام کلام اس کے آگے پست ہو جاتے ہیں (وانہ لیعلو ولا یعلی وانہ لیحطم ما تحتہ) تبلیغ اسلام کے لئے قرآن سنانا اس زمانہ میں ایک عام طریقہ بن گیا تھا۔ مصعب بن زبیر جب مبلّغ کی حیثیت سے مدینہ بھیجے گئے تو ان کا طریقہ یہ تھا کہ لوگوں سے باتیں کرتے اور قرآن سناتے (یحدثھم ویقص علیھم القرآن) قرآن سنانے کی وجہ سے ان کا نام مقری پڑ گیا تھا۔ (وکان یدعی المقری، حلیۃ الاولیاء جلد اول)

مکہ میں آپ کی دعوت انتہائی سنجیدہ اور علمی انداز میں قرآن کے اعلیٰ ادب کے زیر سایہ چل رہی تھی۔ دوسری طرف مخالفین کے پاس سب وشتم کے سوا اور کچھ نہ تھا، یہاں تک کہ مکہ کے سنجیدہ حلقوں میں کہا جانے لگا کہ محمد کے مخالفین کے پاس محمد کے جواب میں کوئی ٹھوس بات نہیں ہے۔ مکہ کے اعیان واشراف نے ایک خصوصی اجتماع میں آپ کو بلا کر آپ سے بات کرنے کا منصوبہ بنایا تو اس کی وجہ ابن جریر کی روایت کے مطابق یہ تھی کہ وہ اپنی قوم کے سامنے بری الذمہ ہو جائیں (ابعثوا الی محمد فکلموہ وخاصموہ حتی تعذروا فیہ، ابن جریر)

عربوں کی صلاحیت

جہاں تک دعوت کی قبولیت کا تعلق ہے، اس کا معاملہ صرف دعوت کی سچائی یا داعی کی جدوجہد پر منحصر نہیں ہوتا۔

اس سے زیادہ وہ مدعو کے اپنے حالات پر موقوف ہوتا ہے۔ عرب کے جغرافیہ میں جو انسانی عنصر جمع تھا، وہ اس لحاظ سے انتہائی قیمتی تھا، اس کی ظاہری جہالت اور اکھڑپن کے پیچھے فطرت کی سادگی پوری طرح محفوظ تھی۔

۳۰ لاکھ کیلومیٹر رقبہ والا مسطح اور گرم ملک اعلیٰ ترین انسانی اقدار اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔ ایک عرب اپنے اونٹ کو جو اس کی معاش کا واحد ذریعہ تھا، ذبح کرکے اس کا گوشت مہمانوں کو کھلا دیتا تھا تاکہ وہ بھوکے نہ رہیں، جس وقت ایک مظلوم شخص جنگل میں ایک عربی کے خیمہ میں پناہ لیتا تو وہ ہاتھ میں تلوار لےکر اس کی حمایت کرتا تھا۔ مخالفین جب تک خیمہ والے کو قتل نہ کرلیتے وہ مظلوم کو خیمہ سے نہیں لے جاسکتے تھے، حتیٰ کہ لوٹنے والے اگر یہ چاہتے کہ وہ قبیلہ کی عورتوں کے قیمتی لباس اور زیورات پر قبضہ کریں تو وہ ان کو ننگا نہیں کرسکتے تھے اور نہ انھیں چھو سکتے تھے، وہ اپنے لئے لازم سمجھتے تھے کہ عورتوں سے کہیں کہ اپنے زیورات اور لباس اتار دیں۔ جس وقت عورتیں لباس اتار رہی ہوتیں، حملہ کرنے والے اپنا منھ پھیر لیتے تاکہ ان کی نگاہ عورتوں کی برہنگی پر نہ پڑے۔

یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ عرب بادیہ بالکل سیدھے سادے "کم فہم" لوگ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ نہایت باشعور تھے اور بہت جلد باتوں کی تہ تک پہنچ جاتے تھے۔

ایک قبیلہ کے سات نومسلم آپ کے پاس آئے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ ہم نے جاہلیت سے پانچ چیزیں سیکھی ہیں۔ ہم ان پر اس وقت تک قائم رہیں گے جب تک آپ ہمیں ان سے منع نہ کردیں:

قال وما الخصال التی تخلقتم بھا فی الجاھلیۃ، قلنا: الشکر عند الرخاء والصبر عند البلاء والصدق فی مواطن اللقاء والرضا بمر القضاء وترک الشماتۃ بالمصیبۃ اذا حلت بالاعداء۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقھاء ادباء کادوا ان یکونوا انبیاء من خصال ما اشرفھا۔

کنز العمال ج ۱، صفحہ ۶۹

آپ نے فرمایا وہ خصلتیں کیا ہیں جو تم نے زمانہ جاہلیت سے پائی ہیں۔ آنے والوں نے جواب دیا: خوش حالی میں شکر کرنا، مصیبت میں صبر کرنا، مڈبھیڑ کے وقت سچا ثابت ہونا، تقدیر پر راضی رہنا۔ کسی کی مصیبت پر خوش نہ ہونا، خواہ وہ دشمن پر کیوں نہ ہو۔ یہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ لوگ اہل علم اور اہل ادب ہیں۔ ان کے اندر انبیاء کی شان ہے۔ کتنی اعلیٰ ہیں ان کی باتیں۔

ضماد، قبیلہ ازدشنوہ کے ایک شخص تھے، وہ بھوت پریت اتارنے کا منتر کیا کرتے تھے۔ ایک بار مکہ آئے تو لوگوں نے آپ کے بارے میں بتایا اور کہا کہ ان پر جن کا اثر ہوگیا ہے۔ ضماد اس خیال سے آپ سے ملے کہ اپنے فن کے ذریعہ آپ کا علاج کریں۔ مگر جب آپ کی باتیں سنیں تو کہا: "خدا کی قسم میں نے کاہنوں اور ساحروں کی باتیں سنی ہیں اور شعراء کے کلام دیکھے ہیں۔ مگر ایسے کلمات میں نے کبھی نہیں سنے۔ اپنا ہاتھ بڑھائیے کہ میں بیعت کرلوں"۔ حسب عادت پیغمبر اسلام نے اس موقع پر کوئی لمبی تقریر نہیں کی تھی، بلکہ مسلم کی روایت کے مطابق صرف اتنا کہا تھا:

ان الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضلل فلا ھادی لہ اشھد

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ میں اسی کی تعریف کرتا ہوں اور اسی سے مدد چاہتا ہوں جس کو اللہ ہدایت دے،

ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ

اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جس کو وہ ہدایت نہ دے کوئی اسے ہدایت نہیں دے سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے کوئی اس کا شریک نہیں۔

مگر انھیں مختصر کلمات میں انھوں نے معانی کا خزانہ پالیا:

فقال لہ ضماد، اعد علیّ کلماتک ھٰولاء فلقد بلغن قاموس البحر

(البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۳۶)

ضماد نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، اپنے ان کلمات کو دوبارہ کہئے۔ یہ کلمات تو سمندر کی گہرائی میں اترے ہوئے ہیں۔

ایک عرب کے لئے کہنے اور کرنے میں فرق کا کوئی سوال نہ تھا۔ وہ خود بھی قول وفعل میں سچے تھے اور دوسروں کو بھی سچا سمجھتے تھے۔ جیسے ہی اس کی سمجھ میں بات آجاتی، وہ فوراً اسے مان لیتا۔ ابن اسحاق نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے کہ قبیلہ بنی سعد نے ضمام بن ثعلبہ کو اپنا نمائندہ بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا۔ وہ مدینہ آئے، اپنی اونٹنی مسجد کے دروازے پر بٹھائی اور اس کو باندھا۔ اس کے بعد مسجد کے اندر داخل ہوئے۔ آپ اس وقت اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ضمام ایک بہادر اور سمجھ دار آدمی تھے۔ انھوں نے آپ کی مجلس کے سامنے کھڑے ہو کر کہا: تم میں سے کون ابن عبد المطلب ہے (ایکم ابن عبد المطلب) آپ نے فرمایا، میں ابن عبد المطلب ہوں۔ ضمام نے کہا، اے محمد! آپ نے فرمایا ہاں۔ انھوں نے کہا اے ابن عبد المطلب میں آپ سے کچھ پوچھوں گا اور پوچھنے میں کچھ سختی کروں گا، آپ اس کو محسوس نہ کریں۔ آپ نے فرمایا میں کچھ محسوس نہیں کروں گا۔ جو تمھارے جی میں آئے پوچھو۔ ضمام نے کہا، میں آپ کو قسم دیتا ہوں آپ کے معبود کی اور ان لوگوں کے معبود کی جو آپ سے پہلے تھے اور ان لوگوں کے معبود کی جو آپ کے بعد آئیں گے، کیا اللہ نے آپ کو رسول بنا کر ہماری طرف بھیجا ہے (اللہ بعثک الینا رسولا) آپ نے فرمایا خدایا ہاں۔ ضمام نے کہا میں آپ کو قسم دیتا ہوں آپ کے معبود کی اور ان لوگوں کے معبود کی جو آپ سے پہلے تھے اور ان لوگوں کے معبود کی جو آپ کے بعد آئیں گے، کیا اللہ نے آپ سے کہا ہے کہ ہم کو حکم دیں کہ ہم تنہا اسی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھیرائیں اور ان بتوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ داد اکرتے تھے۔ آپ نے فرمایا خدایا! ہاں۔ ضمام نے کہا میں آپ کو قسم دیتا ہوں، آپ کے معبود کی اور ان لوگوں کے معبود کی جو آپ سے پہلے تھے اور ان لوگوں کے معبود کی جو آپ کے بعد آئیں گے، کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ ہم یہ پانچ وقتوں کی نماز پڑھیں۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ راوی کہتے ہیں کہ اسی طرح انھوں نے زکوٰۃ، روزہ، حج اور تمام احکام اسلام کا ذکر کیا۔ ہر فریضہ کو مندرجہ بالا طریقہ پر قسم دے کر پوچھتے، یہاں تک کہ جب فارغ ہو گئے تو کہا:

فانی اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمدا رسول اللہ وساودی ھذہ الفرائض واجتنب

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اور

مانہیتنی عنہ ثم لا ازید ولا انقص

البدایہ والنہایہ جلد ۵)

اب میں ان فرائض کو ادا کروں گا اور ان چیزوں سے بچوں گا جن سے آپ نے منع کیا ہے۔ اس میں نہ کوئی کمی کروں گا اور نہ کوئی زیادتی۔

پھر اپنی اونٹنی پر بیٹھ کر واپس روانہ ہو گئے اور اپنی قوم میں پہنچ کر انھیں پوری بات بتائی۔ ایک روایت کے مطابق صبح کی شام نہیں ہونے پائی تھی کہ ان کی مجلس کے تمام مرد و عورت مسلمان ہو گئے۔

ان کے اندر نفاق نہ تھا۔ اقرار اور انکار کے درمیان وہ کسی تیسری چیز کو نہ جانتے تھے۔ جب وہ کسی کو ایک قول دے دیتے تو اس کو ہر حال میں پورا کرتے، خواہ اس کی خاطر جان و مال کی کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ عرب کردار کی یہ جھلک یثرب کے قبائل (اوس و خزرج) کی ان تقریروں میں ملتی ہے جو بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر ان کے نمائندوں نے کی تھی:

ان القوم لما اجتمعوا البیعۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال العباس بن عبادۃ بن نضلۃ اخو بنی سالم بن عوف: یا معشر الخزرج! ھل تدرون علام تبایعون ھذا الرجل، قالوا نعم، قال انکم تبایعونہ علی حرب الاحمر و الاسود من الناس، فان کنتم ترون انکم اذا انھکت اموالکم مصیبۃ واشراف کم قتلا اسلمتموہ فمن الآن فھو واللہ ان فعلتم خزی الدنیا و الآخرۃ وان کنتم ترون انکم وافون بما دعوتموہ الیہ علی نھکۃ الاموال وقتل الاشراف فخذوہ فھو واللہ خیر الدنیا والآخرۃ قالوا فانا ناخذہ علی مصیبۃ الاموال وقتل الاشراف، فمالنا بذالک یا رسول اللہ ان نحن وفینا، قال الجنۃ۔ قالوا: ابسط یدک، فبسط یدہ فبایعوہ

البدایہ والنہایہ، جلد ۳۔ صفحہ ۱۶۲

یثرب کے لوگ جب آپ سے بیعت کے لئے جمع ہوئے تو عباس بن عبادہ نے کہا: اے گروہ خزرج! کیا تم جانتے ہو کہ تم کس چیز پر ان کے ہاتھ بیعت کر رہے ہو۔ انھوں نے کہا ہاں۔ عباس بن عبادہ نے کہا، تم سرخ و سفید سے جنگ پر بیعت کر رہے ہو۔ اگر تمھارا یہ خیال ہو کہ جب تمھارا مال ضائع ہوا اور تمھارے اشراف قتل کئے جائیں تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کی قوم کے حوالے کر دوگے تو ابھی ایسا کر لو۔ کیونکہ بعد کو تم نے ایسا کیا تو خدا کی قسم وہ دنیا و آخرت کی رسوائی ہوگی، اور اگر تمھارا یہ خیال ہو کہ تم نے جو کچھ وعدہ کیا ہے اس کو تم پورا کروگے، خواہ تمھارے مال ضائع ہوں اور تمھارے اشراف قتل کئے جائیں، تو ان کو اپنے ساتھ لے جاؤ، کیونکہ خدا کی قسم یہ دنیا و آخرت کی بھلائی ہے۔

انھوں نے کہا، ہم آپ کو لیتے ہیں خواہ ہمارے مال تباہ ہوں یا ہمارے اشراف قتل کئے جائیں۔ اے اللہ کے رسول اس کے بدلے میں ہمارے لئے کیا ہے۔ اگر ہم اس قول کو پورا کر دیں۔ آپ نے فرمایا جنت۔

انھوں نے کہا پھر اپنا ہاتھ بڑھایئے، آپ نے ہاتھ
بڑھایا اور انھوں نے بیعت کرلی۔

واقعات ثابت کرتے ہیں کہ یہ محض تقریر نہ تھی بلکہ انھوں نے لفظ بلفظ اپنے اس عہد کو پورا کیا۔ حتیٰ کہ جب اسلام غالب ہوگیا تو اس کے بعد بھی وہ اپنی قربانیوں کے لئے کسی سیاسی معاوضہ کے طالب نہ ہوئے بلکہ خلافت کو مہاجرین کے حوالے کرکے اس پر راضی ہو گئے اور اسی حال میں ایک ایک کرکے اس دنیا سے چلے گئے۔

دعوت کی ہمہ گیری

ابن اسحاق نے عبد اللہ بن عباس سے روایت کیا ہے کہ ایک بار قریش کے اشراف ابوطالب کے یہاں جمع ہوئے۔ ان میں عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ۔ ابوجہل بن ہشام، امیہ بن خلف اور ابوسفیان بن حرب جیسے لیڈر شامل تھے۔ ابوطالب کی معرفت ان لوگوں نے پوچھا کہ آخر آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں، آپ نے کہا:

کلمۃ واحدۃ تعطونیہا تملکون بہا العرب وتدین لکم بہا العجم	میں صرف ایک بات کا مطالبہ کرتا ہوں۔ اگر تم اسے مان لو تو تم سارے عرب کے مالک بن جاؤ گے اور عجم تمھارا مطیع فرمان ہوگا۔
البدایہ والنہایہ جلد ۲، صفحہ ۱۲۳	

توحید کا کلمہ بظاہر صرف ایک اعتقادی کلمہ ہے۔ مگر اس کے اندر ہر قسم کی انسانی فتوحات کا راز چھپا ہوا ہے۔ یہ انسانی فطرت کی آواز ہے، اس لئے وہ انسانی نفسیات کی انتہائی گہرائیوں میں شامل ہوجاتا ہے اور اکثر خود مخالفین کے اندر اپنے حامی پیدا کرلیتا ہے۔ خالد بن ولید فتح مکہ سے کچھ پہلے اسلام لائے۔ مگر اسلام کی سچائی بہت پہلے سے ان کے قلب میں ان کا پیچھا کئے ہوئے تھی۔ اسلام کے بعد انھوں نے اپنے بارے میں بتایا کہ میرے دل میں بہت پہلے یہ بات پڑ چکی تھی کہ حق قریش کی طرف نہیں بلکہ محمدؐ کی طرف ہے، اور مجھے آپ کے ساتھ مل جانا چاہئے:

قد شہدت ہذہ المواطن کلہا علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم فلیس فی موطن اشہدہ الا انصرفت وانا اری فی نفسی انی موضع فی غیر شئ	میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تمام جنگوں میں شریک رہا مگر کوئی جنگ ایسی نہیں جس میں میں شریک ہوا ہوں اور یہ خیال لے کر واپس نہ آیا ہوں کہ میں صحیح جگہ نہیں کھڑا ہوں۔
(البدایہ والنہایہ، جلد ۴)	

اسی طرح بہت سے لوگوں کے بارے میں روایتیں ملتی ہیں کہ ان کے دل میں بہت پہلے سے اسلام کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ وہ اس کا خواب دیکھنے لگے تھے۔ مثلاً خالد بن سعید بن العاص نے اسلام سے پہلے خواب دیکھا کہ وہ آگ کے بہت بڑے گڑھے کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں۔ کوئی انھیں دھکا دے کر اس میں گرانا چاہتا ہے۔ اتنے میں پیغمبر اسلام آئے اور انھوں نے آپ کو آگ میں گرنے سے بچا لیا۔

دعوتی عمل بظاہر اقتصادیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ مگر بالواسطہ طور پر وہ زبردست اقتصادی عمل ہے۔ کیونکہ دعوت کے نتیجہ میں جب ایک شخص اسلام کو اختیار کرتا ہے تو اس کے تمام ذرائع بھی خود بخود اسلام کو حاصل ہو جاتے ہیں۔ مکہ کے ابتدائی زمانہ میں خدیجہؓ کی دولت اسلام کے کام آتی رہی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر ایمان لائے جنھوں نے تجارت سے چالیس ہزار درہم کمائے تھے ان کا سرمایہ اسلامی تحریک کا اقتصادی سہارا بنا۔ ہجرت کے موقع پر وہ چھ ہزار درہم لے کر گھر سے روانہ ہوئے تھے جس سے سفر کے تمام اخراجات پورے کئے گئے۔ غزوۂ تبوک میں حضرت عثمانؓ نے دس ہزار دینار دیئے جس سے لشکر کی ضروریات کا تہائی حصہ ادا کیا گیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے صرف ایک موقع پر پانچ سو گھوڑے جہاد کے لئے دیئے۔ اسی طرح جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے ان کی جان کے ساتھ ان کا مال بھی اسلام کے خزانہ کا ایک جزء بن جاتا تھا۔

توحید کا نظریہ واحد نظریہ ہے جس میں سماجی تقسیم اور طبقاتی امتیاز کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے جب اس نظریہ کی بنیاد پر کوئی تحریک اٹھتی ہے تو وہ عوام کو حیرت انگیز طور پر متاثر کرتی ہے۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ توحید کے زیر سایہ وہ مساوات اور انسانی عظمت کا حقیقی مقام پا سکتے ہیں۔ مغیرہ بن شعبہ فارس کے سپہ سالار رستم کے دربار میں گئے تو درباریوں پر ان کی تقریر کا ردعمل ابن جریر کی روایت کے مطابق یہ تھا:

فقالت السفلة، صدق واللّٰہ العربی وقالت الدھاقین، واللّٰہ لقد رمی بکلام لایزال عبیدنا ینزعون الیہ، قاتل اللّٰہ اولینا ماکان احمقھم حین کانوا یصغرون امر ھٰذہ الامة	نیچے کے لوگوں نے کہا، خدا کی قسم، اس عربی نے سچ بات کہی۔ سرداروں نے کہا، خدا کی قسم اس نے ایسی بات پھینکی ہے کہ ہمارے سب غلام اس کی طرف چلے جائیں گے خدا ہمارے پہلوں کو غارت کرے، وہ کس قدر احمق تھے کہ انھوں نے اس قوم کے معاملہ کو ہلکا سمجھا۔
(تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۳۶)	

نبوت کے تیرھویں سال پیغمبر اسلام حضرت ابوبکر کے ساتھ مدینہ پہنچے تو یہاں کی آبادی کے تقریباً ۵۰۰ آدمی آپ کے استقبال کے لئے جمع ہوئے اور انھوں نے کہا:

انطلقا آمنین مطاعین (البدایہ والنہایہ جلد ۳)	آیئے، آپ یہاں محفوظ ہیں اور ہمارے سردار ہیں۔

مدینہ کی یہ سرداری آپ کو کس طرح حاصل ہوئی، جواب یہ ہے کہ دعوت کے ذریعہ۔ مدینہ (یثرب) کا پہلا شخص جس کو آپ نے اسلام کی دعوت دی، غالباً سوید بن صامت خزرجی ہے۔ اس سے آپ نے اسلام کا ذکر کیا تو اس نے کہا "شاید آپ کے پاس وہی ہے جو میرے پاس ہے"، آپ نے پوچھا تمھارے پاس کیا ہے۔ وہ بولا "حکمت لقمان"۔ آپ نے فرمایا: بیان کرو، اس نے کچھ اشعار سنائے۔ آپ نے فرمایا، میرے پاس قرآن ہے جو اس سے بھی افضل ہے۔ اس کے بعد آپ نے اس کو قرآن سنایا وہ فوراً مسلمان ہو گیا۔ یثرب واپس ہو کر جب اس نے اپنے قبیلہ کے سامنے اسلام کا پیغام رکھا تو انھوں نے اس کو قتل کر دیا۔ (تاریخ طبری، صـ۲۳۲)

اس کے بعد یثرب کے ایک سردار ابوالحیسم انس بن رافع مکہ آئے، ان کے ساتھ بنی عبدالاشہل کے جوانوں کی

ایک جماعت بھی تھی۔ یہ لوگ اس لئے مکہ آئے تھے کہ قبیلہ خزرج کی حمایت کے لئے قریش سے معاہدہ کریں۔ آپ کو ان کی آمد کی اطلاع ملی تو آپ ان کے پاس گئے اور کہا: "تم لوگ جس کام کے لئے آئے ہو کیا اس سے زیادہ بھلی بات میں تم کو نہ بتاؤں"۔ اس کے بعد آپ نے توحید کی دعوت ان کے سامنے پیش کی۔ ان کے ایک نوجوان ایاس بن معاذ بولے: "اے قوم! خدا کی قسم یہ بات اس سے بہتر ہے جس کے لئے تم آئے ہو"۔ مگر وفد کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ انھوں نے کہا: دعنا منك قد جئنا لغير هذا۔ (چھوڑو، ہم دوسرے کام کے لئے آئے ہیں) وہ یثرب واپس گئے اور اس کے جلد ہی بعد اوس اور خزرج کے درمیان وہ جنگ چھڑ گئی جو بعاث کے نام سے مشہور ہے۔

خبیب بن عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ یثرب کے دو شخص سعد بن زرارہ اور ذکوان بن قیس مکہ آئے اور عتبہ بن ربیعہ کے یہاں ٹھہرے۔ پیغمبر اسلام کا تذکرہ سنا تو آپ سے ملنے کے لئے آئے۔ آپ نے ان دونوں کو اسلام کی دعوت دی اور قرآن پڑھ کر سنایا۔ دونوں نے اسلام قبول کر لیا۔ پھر وہ اپنے میزبان عتبہ بن ربیعہ کے پاس نہیں گئے، بلکہ آپ کے یہاں سے سیدھے یثرب واپس چلے گئے۔ یہ ان پہلے لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اہل یثرب تک اولاً اسلام پہنچایا۔ یہ نبوت کے دسویں سال کا واقعہ ہے۔

نبوت کے گیارھویں سال حج کے موقع پر یثرب سے قبیلہ خزرج کے چھ آدمی آئے۔ انھوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور واپس جا کر اپنی بستی میں اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ اگلے سال (۱۲ نبوی) بارہ آدمیوں نے آکر بیعت کی جو اسلام کی تاریخ میں عقبہ اولی (۶۲۱) کے نام سے مشہور ہے۔ نبوت کے تیرھویں سال اس تعداد میں مزید اضافہ ہوا اور یثرب کے ۷۵ لوگ مکہ حاضر ہوئے اور بیعت عقبہ ثانیہ کا واقعہ وجود میں آیا۔

مکہ کے برعکس یثرب میں ایک خاص بات یہ ہوئی کہ پہلے ہی مرحلہ میں وہاں کے ممتاز لوگوں نے اسلام قبول کر لیا (اسلم اشرافهم) چوں کہ یہ قبائلی دور تھا اور قبائل میں یہ رواج تھا کہ سردار قبیلہ کا جو مذہب ہوتا تھا وہی پورے قبیلہ کا مذہب ہوتا تھا۔ اس لئے یثرب میں بہت تیزی سے اسلام پھیلنے لگا۔ حتی کہ کوئی گھر نہ بچا جس میں اسلام داخل نہ ہو گیا ہو (حتی لم تبق دار من دور الانصار الا وفيها رهط من المسلمين) اس طرح جب یثرب کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گئی تو فطری طور پر وہی بستی میں سب سے زیادہ با اثر ہو گئے۔

فكان المسلمون اعز اهلها وصلح امرهم — پس مسلمان مدینہ کے سب سے زیادہ با اثر گروہ بن گئے اور ان کا معاملہ درست ہو گیا۔

(اخرجه الطبرانی عن عروہ)

دعوت کے مصالح

ہر دور میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو زمانہ کے اثرات سے محفوظ رہتے ہیں اور اپنی فطرت کی آواز پر کان لگائے ہوئے ہوتے ہیں۔ عرب معاشرہ میں بھی فطری سادگی اور ملت ابراہیمی کے بقایا کے نتیجہ میں ایسے متعدد لوگ تھے جو سچائی کی تلاش میں تھے اور بت پرستی کو ناپسند کرتے تھے۔ عرف عام میں ان کو حنیف کہا جاتا تھا۔ مثلاً

قس بن ساعدہ، ورقہ بن نوفل وغیرہ۔ ایسے ہی ایک حنیف جندب بن عمرو الدوسی تھے۔ وہ زمانہ جاہلیت میں کہا کرتے تھے:

ان للخلق خالقا لکنی ما ادری من ھو (ابن عبد البر فی الاستیعاب، ج ۲)

یقیناً خلق کا کوئی خالق ہے۔ مگر میں نہیں جانتا وہ کون ہے۔

جب انھیں آپ کی بعثت کی خبر ملی تو وہ اپنی قوم کے ۷۵ آدمیوں کو ساتھ لے کر آئے اور سب نے اسلام قبول کر لیا۔ ابوذر غفاری بھی اسی قسم کے متلاشیوں میں سے تھے۔ انھیں آپ کے بارے میں علم ہوا تو اپنے بھائی کو مکہ بھیجا کہ آپ کی خبر لے کر آئے۔ بھائی نے واپس جا کر آپ کے بارے میں جو رپورٹ دی اس کا ایک فقرہ یہ بھی تھا:

رأیت رجلا یسمیہ الناس الصابی ھو اشبہ الناس بك (اخرجہ مسلم من طریق عبد اللہ بن الصامت)

میں نے ایک آدمی کو دیکھا جس کو لوگ بددین کہتے تھے، وہ تم سے بہت زیادہ مشابہ تھا۔

ایسے لوگوں کو آپ کی دعوت سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئی۔

جب کسی معاشرہ میں دعوت کا آغاز ہوتا ہے تو اس کا بیج ایسے ایسے مقامات پر پڑتا ہے جس کا اندازہ خود داعی کو بھی نہیں ہوتا۔

عرب میں جو لوگ "دیر" سے اسلام لائے۔ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ ان پر بالکل اچانک اسلام منکشف ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ اخلاقی زندگی، آپ کا شب و روز دعوت و تبلیغ میں مشغول رہنا، مخالفتوں کی وجہ سے آپ کا اور آپ کے پیغام کا مستقل چرچا جس کی وجہ سے ہر ایک کے لئے آپ کا وجود ایک سوالیہ نشان بن گیا تھا۔ ان چیزوں نے بے شمار عربوں کے ذہن میں اسلام کے بیج ڈال دیئے تھے۔ قبائلی عصبیت اور اسلاف پرستی کی وجہ سے ایک شخص بظاہر ضد اور عناد میں مبتلا ہوتا۔ مگر اندر اندر اسلام کی خاموش پرورش کو بھی وہ روک نہ سکتا تھا۔ حضرت عمر کے اسلام کے بارے میں عام شہرت یہ ہے کہ اچانک ایک واقعہ آپ کے اسلام کا سبب بن گیا۔ آخری مرحلہ میں آپ کے اسلام کا محرک بلاشبہ یہی واقعہ تھا۔ مگر اس کے ابتدائی بیج آپ کے دل میں بہت پہلے پڑ چکے تھے:

اخرج ابن اسحاق عن عبد العزیز بن عبد اللہ بن عامر بن ربیعہ عن امہ ام عبد اللہ بنت ابی حثمۃ رضی اللہ عنہا قالت: واللہ انا لنترحل الی ارض الحبشۃ وقد ذھب عامر فی بعض حاجتنا، اذ اقبل عمر، فوقف علی وھو علی شرکہ، فقالت وکنا نلقی منہ اذی لنا وشدۃ علینا، قالت فقال: انہ الانطلاق یا ام عبد اللہ قلت نعم، واللہ لنخرجن فی ارض من ارض اللہ اذا آذیتمونا وقھرتمونا حتی یجعل اللہ لنا مخرجا،

ام عبد اللہ بنت ابی حثمہ کہتی ہیں، خدا کی قسم ہم لوگ ملک حبش کی طرف کوچ کر رہے تھے اور میرے شوہر عامر اپنی بعض ضروریات کے لئے گئے ہوئے تھے۔ اتنے میں عمر بن الخطاب آگئے اور میرے پاس آکر کھڑے ہوگئے، وہ ابھی تک اسلام نہ لائے تھے۔ ہم لوگوں کو ان سے بڑی تکلیفیں اور سختیاں پہنچی تھیں۔ انھوں نے کہا، اے ام عبد اللہ! کوچ ہو رہا ہے۔ میں نے کہا ہاں، خدا کی قسم ہم لوگ اللہ کی زمین میں سے کسی زمین میں چلے جائیں گے۔ اس لئے کہ تم لوگ ہمیں ستاتے ہو

قالت فقال: صحبکم اللہ، ورأیت لہ رقۃ لم اکن اراھا ثم انصرف وقد احزنہ فیما اری خروجنا

(البدایہ والنہایہ جلد ۳ صفحہ ۷۹)

اور ہمارے اوپر زیادتیاں کرتے ہو۔ یہاں تک کہ اللہ ہمارے لئے کوئی نکاسی کی جگہ پیدا کر دے۔ ام عبداللہ کہتی ہیں۔ عمر نے کہا خدا تمھارا ساتھی ہو۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں رقت پیدا ہوگئی جو میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے بعد وہ چلے گئے اور ان کو ہمارے مکہ سے جانے کا بہت ملال تھا۔

ہر زمانہ میں کچھ ایسے خیالات ہوتے ہیں جو عوامی ذہنوں میں جڑ پکڑ جاتے ہیں۔ جب تک خیالات کی یہ دیوار نہ ٹوٹے کوئی آواز محض اپنی فلسفیانہ صداقت کی بنیاد پر ان کے اندر قبولیت حاصل نہیں کر سکتی۔ ابتدائی زمانہ میں اہل عرب کی طرف سے جس اختلاف کا مظاہرہ ہوا، وہ محض ہٹ دھرمی یا مصلحت پرستی کی بنا پر نہ تھا، بلکہ اس لئے تھا کہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کعبہ کے متولیوں کے سوا بھی کسی کا دین صحیح اور برحق ہو سکتا ہے۔ جو عرب قبائل یہود کے پڑوس میں بسے ہوئے تھے وہ نسبتاً اس قسم کی اعتقادی پیچیدگی سے محفوظ تھے، کیوں کہ یہود سے وہ سنتے رہتے تھے کہ ہماری کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ عرب میں ایک نبی کا ظہور ہوگا:

فلما سمعوا قولہ، انصتوا واطمأنت انفسھم الی دعوتہ وعرفوا ما کانوا یسمعون من اھل الکتاب من ذکرھم ایاہ بصفتہ وما یدعوھم الیہ فصدقوہ وآمنوا بہ

(طبرانی)

انصار کے لوگوں نے جب آپ کا کلام سنا تو وہ چپ ہو گئے، ان کا دل آپ کی دعوت پر مطمئن ہوگیا۔ انھوں نے اہل کتاب سے آپ کے جو اوصاف سنے تھے اور جس چیز کی طرف آپ نے ان کو بلایا تھا، ان کو پہچانا۔ انھوں نے آپ کی تصدیق کی اور آپ پر ایمان لائے۔

عکاظ کے میلے میں جب آپ بنو کندہ کے خیموں میں گئے اور ان کے سامنے اپنی بات پیش کی تو ایک نوجوان بول اٹھا:

یا قوم! اسبقوا الی ھذا الرجل قبل ان تسبقوا الیہ فواللہ ان اھل الکتاب لیحدثون ان نبیا یخرج من الحرم قد اظل زمانہ

(ابونعیم فی الدلائل)

اے قوم، اس آدمی کا ساتھ دینے میں جلدی کرو قبل اس کے کہ اور لوگ اس کی طرف سبقت کریں۔ خدا کی قسم، اہل کتاب کہہ رہے ہیں کہ حرم سے ایک نبی ظاہر ہوگا جس کا زمانہ قریب آ گیا ہے۔

مدینہ کے عرب قبائل، اوس اور خزرج کے ایمان لانے میں پیش قدمی کرنے کی وجہ ان کا یہی ذہنی پس منظر تھا۔ تاہم مکہ کے لوگوں اور بیشتر عرب قبائل کے لئے صداقت کا معیار کعبہ کا اقتدار تھا۔ قدیم عرب میں کعبہ کی حیثیت وہی تھی جو بادشاہی نظام میں ”تاج“ کی ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ تاج کے ساتھ صرف سیاسی اقتدار کا تصور وابستہ ہوتا ہے، جب کہ کعبہ کے ساتھ اقتدار کے علاوہ تقدس کی روایات بھی کامل درجہ میں شامل تھیں۔ عام عرب اپنے سادہ ذہن کے تحت یہ سمجھتے تھے کہ جو کعبہ پر قابض ہو جائے وہی صداقت کا حامل ہے۔ بنو عامر کے ذوالجوشن الضبابی بتاتے ہیں:

قال یا ذا الجوشن! الا تسلم فتکون من اول
هذا الامر، فقلت لا، قال لم؟ قال قلت، رأیت
قومك قد ولعوا بك قال: کیف بلغك عن مصارعهم
ببدر قلت قد بلغنی، قال فانا نهدی لك
قلت ان تغلب علی الکعبة وتقطنها قال لعلك
ان عشت تری ذلك۔۔۔ قال فوالله انی باهلی
بالغور اذا اقبل راکب فقلت ما فعل الناس؟
قال: والله قد غلب محمد علی الکعبة و
قطنها، قلت هبلتنی امی ولو اسلمت یومئذ
ثم اسأله الحیرة لاقطعنیها

(طبرانی)

آپؐ نے فرمایا اے ذو الجوشن تم اسلام کیوں نہیں لاتے کہ تمھارا شمار اولین لوگوں میں ہو جائے۔ میں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا کیوں۔ میں نے کہا میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی قوم آپ کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ آپ نے فرمایا بدر میں ان کی شکست کے بارے میں تم نے کیا سنا۔ میں نے کہا ہاں مجھے معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا ہم کو تو تمھیں ہدایت کی بات بتانی ہے۔ میں نے کہا، ہاں، بشرطیکہ آپ کعبہ کو فتح کرکے اس پر قابض ہو جائیں، آپ نے فرمایا اگر تم زندہ رہے تو دیکھ لوگے اس کے بعد ایک روز میں اپنے وطن غور میں تھا کہ ایک سوار آیا۔ میں نے پوچھا لوگوں کا کیا ہوا۔ اس نے کہا خدا کی قسم محمدؐ نے کعبہ کو فتح کر لیا اور اس پر قابض ہو گئے۔ میں نے کہا میری ماں مجھے گم کرے، اگر میں نے اسی دن اسلام قبول کر لیا ہوتا اور پھر محمدؐ سے حیرہ مانگتا تو وہ ضرور دے دیتے

یہی وجہ ہے کہ جب مکہ فتح ہو گیا تو لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو گئے (نصر۔ ۲)

دعوت کا ردعمل

آپ نے اپنی دعوتی مہم کا آغاز کیا، تو وہ سارے واقعات پیش آنے شروع ہوئے جو کسی معاشرہ میں نئی آواز بلند ہونے کی صورت میں پیش آتے ہیں۔ کچھ لوگ حیران تھے کہ یہ کیا چیز ہے۔ عبد بن حمید نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے کہ قریش کے سرداروں نے ایک بار عتبہ بن ربیعہ کو اپنا نمائندہ بنا کر آپ کے پاس بھیجا۔ اس نے آپ کی تردید میں ایک لمبی تقریر کی، جب وہ کہہ چکا تو آپ نے کہا فَرَغْتَ، اس نے کہا ہاں۔ آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا اور حم سجدہ کی ابتدائی ۱۳ آیتیں پڑھ کر اسے سنائیں۔ عتبہ نے سن کر کہا بس، اس کے سوا اور کچھ تمھارے پاس نہیں (حسبك! ما عندك غیر هذا) آپ نے فرمایا نہیں۔ اس کے بعد روایت کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

فرجع الی قریش فقالوا ما وراءك قال ما ترکت
شیئا اری انکم تکلمونه الا کلمته۔ قالوا فهل
اجابك۔ فقال نعم ثم قال لا والذی نصبها بینة
ما فهمت شیئا مما قال غیر انه انذرکم صاعقة

پھر عتبہ قریش کے پاس آیا۔ انھوں نے پوچھا کیا ہوا عتبہ نے جواب دیا، تم لوگ جو کچھ کہتے وہ سب میں نے کہہ ڈالا۔ انھوں نے پوچھا پھر کیا کوئی جواب دیا۔ عتبہ نے کہا ہاں۔ پھر بولا خدا کی قسم اس نے جو دلیل دی، اس سے میں کچھ

مثل صاعقة عاد وثمود، قالوا، ویلك یکلمك الرجل بالعربیة لا تدری ماقال۔ قال لا واللہ مافہمت شیئاً مما قال غیر ذکر الصاعقة (بیہقی)

نہیں سمجھا، سوا اس کے کہ تم کو عاد و ثمود جیسے کڑکے سے ڈرایا ہے۔ قریش نے کہا تمھارا برا ہو ایک شخص تم سے عربی میں بات کر رہا ہے اور تم نہیں سمجھتے کہ اس نے کیا کہا۔ عتبہ نے کہا خدا کی قسم اس نے جو کچھ کہا اس سے میں کڑکے کے سوا کچھ نہیں سمجھا۔

کچھ لوگ جو مذہب کے ایک خاص روایتی ڈھانچے سے مانوس ہو چکے تھے، انھیں آپ کی دعوت میں اسلاف کی تحقیر کی بو نظر آئی۔ ابونعیم نے دلائل النبوۃ میں نیز نسائی اور بغوی وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ حضرت ضماد مکہ آئے تاکہ عمرہ کریں۔ ایک روز وہ ایک مجلس میں بیٹھ گئے جس میں ابوجہل، عتبہ بن ربیعہ اور امیہ بن خلف تھے۔ ابوجہل نے کہا:

ھذا الرجل الذی فرق جماعتنا وسفہ احلامنا واضل من مات منا وعاب آلھتنا، فقال امیة الرجل مجنون غیر شك

(الاصابہ جلد ۲ صفحہ ۲۱۰)

اس شخص نے ہماری جماعت میں اختلاف ڈال دیا۔ ہم سب کو بیوقوف بتایا۔ ہمارے اسلاف کو گمراہ قرار دیا۔ ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہا۔ امیہ بولا اس آدمی کے پاگل ہونے میں کوئی شک نہیں۔

عمرو بن مرہ جہنی نے اپنے قبیلہ جہینہ کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تو ایک شخص نے کہا:

یا عمرو بن مرة امر اللہ عیشك اتامرنا برفض آلھتنا وان نفرق جمعنا وان نخالف دین آبائنا الشیم العلی الی مایدعونا الیه ھذ القرشی من اھل تھامة، لا حبا ولا کرامة

(البدایہ والنہایہ جلد ۲)

اے عمرو بن مرہ! خدا تیری زندگی تلخ کر دے کیا تو ہم کو ہمارے معبودوں کو چھوڑنے کا حکم دیتا ہے اور یہ کہ ہم اپنی جمعیت کو منتشر کر دیں، اور اپنے باپ دادا کے دین کی مخالفت کریں جو اخلاق عالیہ کے مالک تھے۔ یہ تہامہ کا رہنے والا قریشی ہمیں کس چیز کی طرف بلاتا ہے اس میں نہ کوئی شرافت ہے نہ کرامت۔

اس کے بعد اس نے تین شعر پڑھے۔ آخری شعر یہ تھا:

لیسفه الاشیاخ ممن قد مضی   من رام ذلك لا اصاب فلاحا

وہ ہمارے گزرے ہوئے اسلاف کو احمق ثابت کرنا چاہتا ہے اور جس کا ایسا ارادہ ہو وہ کبھی فلاح نہیں پا سکتا۔

کچھ لوگوں کے لئے حسد مانع ہو گیا۔ کیوں کہ آپ اپنی پیغمبری کا اعلان کر رہے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ میرے پاس حقیقت کا علم ہے اور انسان کے لئے ہمیشہ یہ مشکل ترین امر رہا ہے کہ وہ کسی کے بارے میں یہ اعتراف کرے کہ خدا نے اس کو حقیقت کا وہ علم دیا ہے جو خود اسے نہ مل سکا۔ بیہقی نے مغیرہ بن شعبہ سے نقل کیا ہے کہ ابوجہل بن ہشام نے ایک روز ان سے علیحدگی میں کہا:

واللہ انی لاعلم ان مایقول حق ولکن یمنعنی

خدا کی قسم میں خوب جانتا ہوں کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں، حق ہے

شیئ ۔ ان بنی قصیّ قالوا : فینا الحجابة فقلنا نعم، ثم قالوا فینا السقایة فقلنا نعم، ثم قالوا فینا الندوة فقلنا نعم، ثم قالوا فینا اللواء فقلنا نعم
حتیٰ قالوا منا نبی، واللہ لا افعل

(البدایہ والنہایہ جلد ۳)

مگر مجھے ایمان لانے میں ایک چیز مانع ہے۔ بنی قصی نے کہا کہ کعبہ کی دربانی ہماری ہے۔ ہم نے کہا ہاں، پھر بنی قصی نے کہا حاجیوں کو پانی پلانے کا کام ہمارا ہے۔ ہم نے کہا ہاں۔ پھر بنی قصی نے کہا کہ دارالندوہ میں ہمارا حق ہے، ہم نے کہا ہاں۔ پھر انھوں نے کہا جنگ میں جھنڈا اٹھانا ہماری ذمہ داری ہے۔ ہم نے کہا ہاں۔ اب وہ کہتے ہیں کہ نبوت ہمارے اندر ہے۔ پس خدا کی قسم میں ہرگز اس کو نہیں مانوں گا۔

کچھ لوگ آپ کے اس لئے مخالف ہو گئے کہ آپ کی دعوت کو مان لینے میں انھیں اپنا اقتصادی خطرہ نظر آتا تھا۔ اسلام سے قبل خانہ کعبہ ایک بہت بڑا بت خانہ تھا جس میں تمام مذاہب کے بت رکھے ہوئے تھے حتیٰ کہ اس میں مسیح اور مریم کی بھی تصویریں تھیں۔ اس طرح کعبہ تمام مذاہب کے لوگوں کی زیارت گاہ بن گیا تھا۔ چار حرام مہینوں کی غرض بھی یہی تھی۔ کیوں کہ اس زمانے میں تمام مذاہب کے لوگ مکہ آتے رہتے تھے۔ اگر بتوں کو خانہ کعبہ سے ہٹا دیا جاتا تو کوئی شخص کعبہ کی زیارت کے لئے نہ آتا اور مکہ کا بازار جو چار مہینوں تک لگا رہتا تھا بند ہو جاتا۔ اس لئے مکہ کے باشندے آپ کی دعوت کو اپنے لئے خطرہ محسوس کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر توحید کا دین فروغ پا گیا تو یہ غیر ذی زرع علاقہ بالکل تباہ ہو جائے گا۔ نیز کعبہ کی تولیت نے قریش کو مختلف قبائل میں سرداری کا مقام دے رکھا تھا۔ ایک مورخ لکھتے ہیں :

کانت اموالها وتجاراتها تسافر فی الشرق والغرب فی ظلال معاهدات تجاریة بینها وبین امم وثنیة مثلها کفارس وامم مسیحیة کالحبشة وکمثل بیزنطة وکانت قریش تتصور ان تاییدها لرسالة محمد انما یعنی شیئاً واحداً هو ان تتحلل الامم المجاورة لها بل وقبائل العرب نفسها المقیمة علی الوثنیة من تعهدا تها بحمایة تجارة قریش وقوافلها واذا حدث ذلك فهذا یعنی موت قریش تجاریا واقتصادیا وانتهاء عصر سیادتها علی العرب

قریش کے اموال اوران کی تجارتیں مشرق ومغرب میں سفر کرتی تھیں۔ یہ سفر تجارتی معاہدوں کے تحت ہوتا تھا جو انھوں نے دوسری قوموں سے کر رکھا تھا۔ مثلاً فارس، حبشہ اور بیزنطینی سلطنت۔ قریش کا خیال تھا کہ اگر انھوں نے رسالت محمدی کی تائید کی تو اس کا مطلب صرف ایک ہوگا، وہ یہ کہ پڑوسی قومیں اور عرب کے بت پرست قبائل معاہدات ختم کردیں گے جو انھوں نے قریش کے تجارتی قافلوں کے بارے میں کر رکھے ہیں اور جب ایسا ہوگا تو یہ قریش کی تجارتی موت کے ہم معنی ہوگا اور عرب پر ان کی قیادت ختم ہو جائے گی۔

چنانچہ سورہ واقعہ کی آیت (وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنَّكُمْ تُكَذِّبُونَ) کی ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ تم تکذیب کو اپنی غذا بنا رہے ہو۔ یعنی یہ سمجھ رہے ہو کہ پیغمبر اسلام کی دعوت توحید کا انکار کر کے تم اپنی اقتصادیات اور اموال کو محفوظ رکھ سکو گے۔

آپ کی دعوت کے نتیجہ میں آپ کا وجود ایک سوالیہ نشان بن گیا تھا۔ دیکھنے والا دوسرے شخص سے پوچھتا کیا یہی وہ ہیں (اھو ھو، ابویعلی):

ویمضی بین رحالھم وھم یشیرون الیہ بالاصابع (احمد بروایت جابر)

آپ قافلوں کے درمیان چلتے تو لوگ انگلیوں سے آپ کی طرف اشارہ کرتے۔

اب کوئی مکہ آتا تو واپس جا کر اپنے ساتھی کو دوسری باتوں کے ساتھ یہ خبر بھی دیتا کہ محمد بن عبد اللہ تنبأ وقد تبعہ ابن ابی قحافۃ (محمد بن عبداللہ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور ابن ابی قحافہ ان کا ساتھ دے رہے ہیں) قریش نے آپ کا نام محمد کے بجائے مذمم رکھ دیا۔ وہ آپ پر تحمیق اسلاف اور تسفیہ آبار کا الزام لگاتے۔ آپ کے راستہ میں رات کے وقت گندی چیزیں ڈال دیتے۔ ایک بار آپ نے ان کو دیکھ کر فرمایا: یا بنی عبد مناف، ای جوار ھذا، تہذیب سیرۃ ابن ہشام، ۸۶ (اے گروہ قریش یہ کیسا پڑوس ہے)

ابوطالب کی زندگی تک وہ آپ کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔ کیونکہ قبائلی نظام کے تحت آپ سے جنگ کرنا پورے قبیلہ بنی ہاشم سے جنگ کرنے کے ہم معنی تھا۔ عمر بن الخطاب جب اسلام سے پہلے ایک بار تلوار لے کر آپ کے قتل کے ارادے سے نکلے تو ایک شخص کا یہ جملہ آپ کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے کافی تھا: کیف تامن من بنی ھاشم اذا قتلت محمدا۔ جب بھی کوئی شخص آپ کے خلاف جارحانہ ارادہ کرتا تو فوراً یہ سوال اس کے سامنے آجاتا۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ میں جو جارحانہ مظالم ہوئے وہ زیادہ تر غلاموں اور لونڈیوں کے خلاف ہوئے۔ امام احمد اور ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ ابن مسعود سے نقل کیا ہے کہ ابتدائی دور میں سات افراد نے مکہ میں اسلام کا اعلان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر، عمار، سمیہ، صہیب، بلال اور مقداد:

فاما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فمنعہ اللہ بعمہ واما ابوبکر منعہ اللہ بقومہ واما سائرھم فاخذھم المشرکون فالبسوھم ادرع الحدید وصھروھم فی الشمس (احمد بروایت ابن مسعود)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے ان کے چچا کے ذریعہ محفوظ رکھا۔ حضرت ابوبکر کی حفاظت ان کی قوم کے ذریعہ کرائی۔ بقیہ مسلمانوں کو مشرکین نے پکڑا۔ ان کو لوہے کی زرہیں پہنائیں اور سخت دھوپ میں انھیں تپایا۔

امام بیہقی نے حضرت عبداللہ بن جعفر سے روایت کیا ہے کہ جب بنی ہاشم کے سردار ابوطالب کی وفات ہوگئی تو قریش کے کسی بدتمیز شخص نے آپ کے اوپر مٹی ڈال دی۔ آپ گھر واپس آئے تو آپ کی ایک لڑکی نے مٹی جھاڑی۔ اس وقت آپ نے فرمایا: مجھے قریش سے اب تک کسی مکروہ چیز کا سابقہ نہیں پڑا تھا۔ ابوطالب کی وفات ہوگئی تو انھوں

نے اس قسم کی حرکتیں شروع کر دیں۔ حضرت ابوہریرہ کی ایک روایت میں ہے :

لما مات ابو طالب تجهموا بالنبي صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا عم ما اسرع ما وجدت فقدك (ابونعیم فی الحلیہ، ج ۸)

ابوطالب کی وفات ہوگئی تو قریش مکہ نے آپ کے ساتھ نہایت سختی کا برتاؤ کیا، آپ نے فرمایا: چچا، آپ کے نہ ہونے کا احساس مجھے کتنی جلد ہوگیا۔

ابوطالب کی وفات کے بعد قریش میں آپ کے قتل کے مشورے شروع ہوگئے۔ ابوجہل کا آپ کے سر میں اوجھ ڈالنا اور عقبہ بن معیط کا آپ کی گردن میں چادر ڈال کر کھینچنا اسی دور کے واقعات ہیں جب کہ گلا گھونٹ کر آپ کو مار ڈالنے کی کوشش کی گئی جو کامیاب نہ ہوسکی۔ ابوطالب کی وفات کے بعد بظاہر آپ کے خلاف جارحانہ کارروائی کے لئے راستہ صاف ہوگیا تھا تاہم ایک قسم کی جھجک اس لئے باقی تھی کہ یہ عرب کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔ اس کے علاوہ خود مشرکین میں اب بھی کچھ ایسے لوگ موجود تھے جو ضمیر کی آواز کے تحت آپ کی حمایت کرتے تھے۔ مثلاً ابوجہل نے جب پہلی بار آپ کے سر اور گردن میں اوجھ ڈال کر آپ کا گلا گھونٹنا چاہا تو ابوالبختری کو خبر ہوئی، وہ کوڑا لے کر خانہ کعبہ میں آیا، جہاں ابوجہل فاتحانہ انداز سے اپنے ساتھیوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ تحقیق کے بعد جب واقعہ صحیح نکلا تو اس نے اسی وقت ابوجہل کے سر پہ اتنے زور سے کوڑا مارا کہ وہ چلا اٹھا۔

مذاہب کی تاریخ بتاتی ہے کہ شرک، اپنے خلاف تنقید سننے کے لئے، ہمیشہ بے حد حساس رہا ہے۔ پھر قدیم زمانہ میں چونکہ اجتماعی نظام کی بنیاد بھی شرک ہی پر قائم ہوتی تھی اس لئے اس شدت کے حق میں سیاسی اسباب بھی جمع ہوجاتے تھے۔ چنانچہ مکہ کے ماحول میں توحید کی دعوت آپ کے لئے انتہائی صبر آزما ثابت ہوئی۔ ابتدائی تین سال تک چند آدمیوں کے سوا کوئی آپ پر ایمان نہ لاسکا۔ دو مربع کیلومیٹر میں آباد مکہ میں جس طرح درخت کا کوئی سایہ نہ تھا، اسی طرح وہ آپ کے ساتھیوں اور طرف داروں سے بھی خالی تھا۔ بستی میں صرف چار آدمی تھے جو آپ کے قریب ہوسکے تھے: خدیجہ، علی، زید اور ابوبکر۔ اگر حضرت ابوبکر کی بچی عائشہ کو بھی شامل کرلیا جائے، جو گویا پہلی پیدائشی مسلمان تھیں، تو آپ کے حامیوں کی تعداد پانچ ہوجاتی ہے۔

تین سال تک یہی سلسلہ جاری رہا، اس وقت یہ حال تھا کہ آپ گھر سے باہر نکلتے تو دیوانوں کی طرح آپ کا استقبال کیا جاتا۔ ایک روز ابوجہل کی تحریک سے ایک جماعت آپ کو گالیاں دے رہی تھی اور آپ کو برا بھلا کہہ رہی تھی کہ ایک شخص ادھر سے گزرا۔ مکہ کے ایک معزز شخص کے خلاف یہ سلوک اس کو ناقابل برداشت معلوم ہوا۔ وہ آپ کے چچا حمزہ کے یہاں گیا "آپ کی غیرت کو کیا ہوا"، اس نے کہا "لوگ آپ کے بھتیجے کو ذلیل کر رہے ہیں اور آپ ان کی مدد نہیں کرتے"۔ حمزہ بن عبد المطلب کی عرب غیرت جوش میں آئی، اسی وقت ابوجہل کے یہاں پہنچے اور اپنی لوہے کی کمان اس کے سر پہ دے ماری اور کہا کہ "آج سے میں بھی محمد کا دین قبول کرتا ہوں، تم کو جو کرنا ہو کرو"۔ (دینی دین محمد، فامنعونی ذلك ان کنتم صادقین، طبرانی)

حمزہ عرب کے مشہور پہلوان تھے۔ اب کچھ لوگوں کو حوصلہ ہوا اور مسلمانوں کی تعداد ۴۰ تک پہنچ گئی۔ اس وقت مکہ میں دو انتہائی با اثر افراد تھے۔ ایک عمر بن الخطاب، دوسرے ابوجہل بن ہشام۔ آپ نے دعا فرمائی کہ خدایا، ان میں سے کسی ایک کے ذریعہ اسلام کو طاقت پہنچا (اللھم اعز الاسلام بعمر بن الخطاب او بابی جھل بن ھشام) آپ کی یہ پکار اول الذکر کے حق میں قبول ہوئی۔ نبوت کے چھٹے سال حضرت عمر کا اسلام بہت سے دوسرے لوگوں کو اسلام کی طرف لانے کا سبب بنا اور اب مسلمانوں کی تعداد چالیس ہوگئی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ مسلمان ابن ارقم کے مکان میں اپنا پوشیدہ مرکز بنائے ہوئے تھے۔ البدایہ والنہایہ میں دار ارقم میں جمع ہونے والے مسلمانوں کی تعداد ۳۹ بتائی گئی ہے۔

مگر جو لوگ مروجہ نظام کے زیر سایہ عمل کر رہے ہوں، ان کی طاقت ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک عارضی وقفہ کے بعد مظالم کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا۔ آپ کو ہر قسم کی تکلیف دینے کے باوجود وہ آپ کو قتل نہ کرسکتے تھے۔ کیونکہ قبائلی رواج کے مطابق کسی قبیلہ کے ایک فرد کو قتل کرنا پورے قبیلہ سے جنگ کرنے کے ہم معنی تھا۔ یہی مسئلہ تھا جس کی بنا پر حضرت شعیب کی قوم نے ان سے کہا کہ اگر تمہارے قبیلہ کا خوف نہ ہوتا تو ہم تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دیتے (ہود۔ ۹۱) قریش نے بنی ہاشم کے سردار اور آپ کے چچا ابو طالب بن عبد المطلب سے مطالبہ کیا کہ وہ آپ کو قبیلہ سے خارج کر دیں تاکہ قریش کے لئے آپ کو قتل کرنا ممکن ہو جائے۔ مگر ابو طالب کی غیرت اس کے لئے تیار نہ ہوئی۔ ایک بار قریش کی شکایت پر جب ابو طالب نے آپ سے کہا کہ تم ان کے بتوں پر تنقید کرنا چھوڑ دو تو آپ کو اندیشہ ہوا کہ وہ آپ کو قریش کے حوالے کر دیں گے (فظن انہ قد بدا لعمہ فیہ وانہ مسلمہ) مگر ابو طالب نے فوراً یہ کہہ کر آپ کو مطمئن کر دیا: واللہ لا اسلمک لشیٔ ابدا (تہذیب سیرۃ ابن ہشام، جلد اول، صفحہ ۶۰)۔ اب قریش نے ایک اجتماعی معاہدہ کرکے بنی ہاشم کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ یہ نبوت کا ساتواں سال تھا، اس کے بعد ابو طالب آپ کو اور آپ کے خاندان کو لے کر مکہ کے باہر نکل گئے اور ایک گھاٹی میں مقیم ہوئے جس کو شعب ابی طالب کہا جاتا ہے۔ یہ ایک خشک پہاڑی درہ تھا جس میں بعض جنگلی درختوں کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ آپ تین سال تک اس حال میں رہے کہ درخت کی پتیاں اور جڑیں کھا کر گزارہ کرتے، اس سے مستثنیٰ صرف وہ چار حرام مہینے تھے جب کہ آپ کے خاندان کے لوگ مکہ جاتے اور قربانی کے جانوروں کا گوشت لے آتے اور اس کو سکھا کر رکھ لیتے جو عرصہ تک غذا کا کام دیتا تھا۔

تین سال بعد نبوت کے دسویں برس معاہدہ ختم ہوگیا مگر اس کی شدت ابو طالب کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی۔ ابو طالب کے انتقال (۶۲۰) کے بعد قبیلہ کے سب سے بزرگ فرد کی حیثیت سے عبد العزیٰ (ابولہب) بنی ہاشم کا سردار بن گیا۔ اب دشمن خود جج کی کرسی پر تھا۔ اس نے آپ کو قبیلہ سے خارج کیے جانے کا اعلان کر دیا۔

قبیلہ سے اخراج

عرب کی صحرائی زندگی میں کسی شخص کا قبیلہ سے خارج کر دیا جانا ایسا ہی تھا جیسے کسی کو سمندر میں دھکیل

دیا جائے۔ کیوں کہ قبائلی نظام میں، جب کہ کوئی ذمہ دار ملکی حکومت نہیں ہوتی تھی، کوئی شخص کسی قبیلہ کی حمایت ہی میں زندگی گزار سکتا تھا۔ منیٰ کی قیام گاہوں میں ایک بار آپ نے ایک قبیلہ کے سامنے اپنی دعوت پیش کی۔ قبیلہ نے ماننے سے انکار کیا۔ تاہم ان میں سے ایک شخص میسرہ بن مسروق عبسی کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ انھوں نے آپ کی دعوت کا اثر قبول کیا ہے:

فطمع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی میسرۃ فکلمہ، نقال میسرۃ: ما احسن کلامك وانورہ ولکن قومی یخالفوننی وانما الرجل بقومہ (البدایہ والنہایہ، جلد ۳)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میسرہ سے امید ہوئی۔ آپ نے ان سے بات کی، میسرہ نے جواب دیا، آپ کی بات کتنی اچھی اور نورانیت سے بھری ہوئی ہے۔ مگر میری قوم مخالف ہے اور آدمی اپنی قوم ہی کے ساتھ رہ سکتا ہے۔

ان حالات میں قبیلہ سے اخراج آپ کے لئے انتہائی سنگین واقعہ تھا۔ اب اپنے وطن میں آپ کے لئے کوئی سایہ نہ تھا۔ آپ کے لئے واحد صورت یہ تھی کہ اپنے لئے کوئی دوسرا حمایتی قبیلہ تلاش کریں۔ مکہ سے نکل کر طائف جانا اس سلسلے میں آپ کی پہلی کوشش تھی۔ حضرت عائشہ سے اس سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے ایک بار آپ نے کہا: اذ عرضت نفسی علی ابن عبد یالیل بن عبد کلال (جب میں نے اپنے آپ کو ابن عبد یالیل کے سامنے پیش کیا) عروہ بن زبیر بیان کرتے ہیں:

ومات ابوطالب وازداد من البلاء علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم شدۃ فعمد الی ثقیف یرجوان یؤووہ وینصروہ (ابونعیم فی دلائل النبوۃ)	ابو طالب کی وفات کے بعد آپ کو بہت زیادہ تکلیفیں پہنچائی جانے لگیں۔ اس وقت آپ نے قبیلہ ثقیف (طائف) کا رخ کیا، اس امید میں کہ وہ آپ کو پناہ دیں گے اور آپ کی مدد کریں گے۔

مگر وہاں کے لوگوں نے آپ کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا، اس کی ایک جھلک اس دعار میں نظر آتی ہے جو طائف سے واپسی کے وقت آپ کے لہولہان چہرہ سے نکلی تھی:

اللّٰھم الیك اشکوا ضعف قوتی وقلۃ حیلتی وھوانی علی الناس یا ارحم الراحمین (البدایہ والنہایہ، جلد ۳)	خدایا میں تجھی سے شکایت کرتا ہوں اپنی قوت کی کمی کی اور اپنے وسائل کی قلت کی اور لوگوں کی نظر میں حقیر ہونے کی۔ اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے۔

طائف سے لوٹتے ہوئے آپ نے ان سے کہا: تم نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کی خبر مکہ تک نہ پہنچے، ورنہ انھیں مزید جسارت ہو جائے گی۔ (تہذیب سیرۃ ابن ہشام، ۹۸)

طائف سے واپس ہو کر دوبارہ آپ مکہ کے باہر مقیم ہوئے اور شہر کے مختلف لوگوں کے پاس پیغام بھیجا کہ کوئی آپ کو اپنی شخصی حمایت میں لے لے تو مکہ میں آکر رہ سکیں۔ بالآخر مطعم بن عدی نے آپ کی حمایت قبول کی اور اس کے لڑکوں کی تلوار کے سایہ میں آپ دوبارہ مکہ میں داخل ہوئے۔

اب آپ نے یہ منصوبہ بنایا کہ مختلف میلوں اور بازاروں میں اطراف کے جو قبائل مکہ آتے ہیں، ان میں جائیں اور ان کو آمادہ کریں کہ وہ آپ کو اپنی حمایت میں لے لیں۔ آپ نے اپنے چچا عباس سے کہا:

لا اری لی عندک ولا عند اخیک منعة فهل انت مخرجی الی السوق غدا حتی نقر فی منازل قبائل الناس (البدایہ والنہایہ، جلد ۳)	تمھارے اور تمھارے اقربا کے یہاں میرے لئے حفاظت نہیں۔ کیا آپ کل مجھے بازار لے چلیں گے تاکہ ہم لوگوں کی قیام گاہوں پر چل کر ٹھہریں اور ان سے بات کریں۔

آپ ایک ایک قبیلہ کی قیام گاہ پر جاتے اور اس سے پوچھتے کہ تم لوگوں کے یہاں حفاظت کا کیا انتظام ہے (کیف المنعة فیکم)۔ ان کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرتے (یعرض علیهم نفسه) ان سے کہتے کہ میرے قبیلہ نے مجھ کو نکال دیا ہے (کذبنی وطردنی) تم مجھ کو اپنی حفاظت میں لے لو تاکہ میں تبلیغ رسالت کا فریضہ انجام دے سکوں (یمنعونی ویؤوونی حتی ابلغ عن اللّٰہ عزوجل ما ارسلنی بہ، ۷۷) مورخین نے اس سلسلے میں پندرہ قبیلوں کے نام لکھے ہیں جن سے آپ فرداً فرداً ملے۔

مگر قبائل کو معلوم تھا کہ قریش کے نکالے ہوئے ایک شخص کو پناہ دینا کس قدر خطرناک ہے۔ چنانچہ ہر ایک نے آپ کو اپنی پناہ میں لینے سے انکار کر دیا۔ ایک قبیلہ کے کچھ لوگوں میں آپ کی بابت نرمی پیدا ہوئی تو اس کے ایک بزرگ نے کہا:

اخرجته عشیرته وتوودونهٗ انتم تحملون حرب العرب (ابونعیم فی دلائل النبوۃ)	اس کے قبیلہ نے اس کو نکال دیا ہے اور تم اس کی پشت پناہی کرنا چاہتے ہو کیا تم تمام عرب سے لڑائی مول لینا چاہتے ہو۔

وہ جانتے تھے کہ کسی قبیلہ سے نکالے ہوئے شخص کو حفاظت میں لینا اس قبیلہ سے اعلان جنگ کے ہم معنے ہے اور جب کہ یہ قبیلہ قریش ہو جس کو پورے ملک پر سیادت حاصل ہو تو مسئلہ اور بھی زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔ عرب روایات میں یہ بات انتہائی معیوب تھی کہ کوئی شخص کسی سے پناہ طلب کرے اور وہ اس کو پناہ نہ دے۔ عرب تاریخ میں یہ پہلا نمایاں واقعہ تھا کہ آپ کئی سال تک مختلف قبائل کے درمیان پھرتے رہے، مگر کوئی آپ کو پناہ دینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ نہ طائف کے لوگ نہ دیگر عرب قبائل۔ اس کی وجہ آپ کے معاملہ کی مخصوص نوعیت تھی۔ آپ کا "طرد" کرنے والے قریش تھے جو سارے عرب کے قائد تھے۔ قریش کے نکالے ہوئے ایک شخص کو پناہ دینے کا مطلب سارے عرب سے جنگ مول لینے کے ہم معنی تھا۔ یہی پس منظر تھا جس کی بنا پر انصار سے بیعت کے وقت ابوالہیثم بن التیہان رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

فاعلموا انه ان تخرجوه رمتکم العرب عن قوس واحدة (طبرانی)	جان لو، اگر تم ان کو اپنے یہاں لے گئے تو سارے عرب مل کر تم کو ایک تیر سے نشانہ بنا لیں گے۔

اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی تھی وہ قبائل جو سرحدی علاقوں میں آباد تھے، ان کے پڑوس کی غیر عرب

حکومتوں سے معاہدات تھے، وہ ڈرتے تھے کہ آپ جیسی ایک متنازعہ شخصیت کو اپنے ساتھ لے جائیں تو ان حکومتوں سے کوئی جھگڑا نہ شروع ہو جائے۔ البدایہ والنہایہ میں ہے کہ آپ منیٰ کے میلہ میں گئے وہاں بنو شیبان بن ثعلبہ کے سرداروں سے آپ کی گفتگو ہوئی۔ انھوں نے آپ کے پیغام کی تحسین کی۔ مگر آخر میں ہانی بن قبیصہ نے کہا کہ ہم کسریٰ (شاہ فارس) کی مملکت کی سرحد پر بسے ہوئے ہیں اور شاہان فارس سے ہمارے معاہدے ہیں :

ولعل ھذا الامر الذی تدعو الیہ تکرھہ الملوك (البدایہ والنہایہ)	اور جس چیز کی طرف آپ ہمیں بلاتے ہیں شاید وہ بادشاہوں کی ناراضگی کا باعث ہو۔

اس زمانہ میں آپ پر جو بے بسی کا عالم تھا اس کا اندازہ ان الفاظ سے ہوتا ہے جو اس سلسلہ میں روایات میں آئے ہیں۔ ایک بار آپ ایک قبیلہ میں گئے جس کو بنو عبد اللہ کہا جاتا تھا :

فدعاھم الی اللہ وعرض علیھم نفسہ حتی انہ لیقول: یابنی عبد اللہ! ان اللہ قد احسن اسم ابیکم فلم یقبلوا منہ ماعرض علیھم (البدایہ والنہایہ)	ان کو آپ نے خدا کی طرف بلایا اور اپنے آپ کو ان کے سامنے پیش کیا کہ وہ آپ کو اپنی حمایت میں لے لیں۔ یہاں تک کہ آپ نے فرمایا اے بنو عبد اللہ! اللہ نے تمھارا نام کتنا اچھا رکھا ہے، پھر بھی انھوں نے وہ چیز قبول نہ کی جو آپ نے ان کے سامنے پیش کی تھی۔

اس طرح مکی زندگی کے آخری تقریباً تین سال مختلف قبائل کے درمیان اپنا حامی تلاش کرنے میں گزر گئے۔ مگر ہر قسم کی جد و جہد کے باوجود کوئی قبیلہ بھی آپ کی حمایت کے لئے تیار نہ ہوا۔ یہاں تک کہ بعض قبائل کہہ اٹھے، کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ آپ ہم سے مایوس ہو جائیں (اما آن لك ان تیأس منا) بالآخر اللہ تعالیٰ نے یثرب (مدینہ) کے قبائل اوس اور خزرج کو اس کی توفیق عطا فرمائی۔ اوس اور خزرج کی اس آمادگی کا ایک خاص نفسیاتی پس منظر بھی تھا۔ یہ قبائل یہود کے پڑوس میں بسے ہوئے تھے۔ خیبر کے یہودی اس علاقہ کی بہترین زمینوں پر قابض تھے، تجارتیں بھی انھیں کے قبضہ میں تھیں۔ چنانچہ یثرب کے عربوں (اوس وخزرج) کی معاشیات کا بڑا ذریعہ خیبر کے یہودیوں کے یہاں مزدوری کرنا تھا۔ ہجرت کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب اپنے ہاتھوں سے مسجد نبوی کی تعمیر کر رہے تھے تو آپ کی زبان پر یہ شعر تھا (البدایہ والنہایہ) :

ھذا الحمال لاحمال خیبر ھذا ابر ربنا واطھر

(یہ مزدوری ہے مگر خیبر کی مزدوری کی طرح نہیں۔ ہمارے رب کی قسم یہ اس سے بہت بہتر اور بھلی ہے)

یہودیوں کے اقتصادی غلبہ اور استحصال کی وجہ سے ان میں اور اوس وخزرج میں اکثر لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ چنانچہ ان سے یہودی کہا کرتے تھے کہ ہماری کتابوں کے مطابق جلد ہی عرب میں ایک نبی ظاہر ہونے والا ہے۔ وہ جب آئے گا تو ہم اس کے ساتھ ہو کر تم سے لڑیں گے اور تم کو ہمیشہ کے لیے فنا کر دیں گے۔ یہودیوں کے اسی قول کی طرف قرآن کے ان الفاظ میں اشارہ ہے (وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا، بقرہ۔ ۸۹) اوس وخزرج

کے لوگوں نے آپ کی دعوت سنی تو انھوں نے کہا "بخدا یہی وہ نبی ہے جس کے بارے میں یہود ہم سے کہا کرتے تھے۔ قبل اس کے کہ یہود سبقت کریں ہمیں آپ پر ایمان لاکر آپ کے گروہ میں شامل ہو جانا چاہئے"۔ اس مخصوص پس منظر کے علاوہ دوسرے تاریخی اور سماجی اسباب بھی تھے جس کی وجہ سے اوس و خزرج کے لئے آپ کی بات کو سمجھنا اور اس کو مان لینا دیگر عرب قبائل کے مقابلہ میں آسان ہوگیا اور انھوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔

اب وہ وقت آگیا تھا جس کے آپ برسوں سے منتظر تھے۔ آپ کو ایک ایسی جگہ مل گئی تھی جہاں قبائلی حمایت کے تحت اپنی جدوجہد کو مؤثر شکل میں جاری رکھ سکیں اور مکہ اور اطراف مکہ کے مسلمانوں کو ایک مقام پر جمع کرکے اس کو اسلامی مرکز بنادیں۔ اہل یثرب کا بڑی تعداد میں اسلام لانا اس بات کا امکان پیدا کرتا تھا کہ کہ اسلام کی متفرق طاقتوں کو ایک مرکز پر اکھٹا کر دیا جائے اور پھر دعوت حق کی جدوجہد کو زیادہ مؤثر شکل میں جاری رکھا جاسکے۔ چنانچہ جب اوس وخزرج نے بیعت کرلی تو تاریخ میں آتا ہے کہ:

قال: فلم یلبث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا یسیرا حتیٰ خرج الی اصحابہ فقال لھم: احمد واللہ کثیرا لقد ظفرت الیوم ابناء ربیعۃ باھل فارس

آپ فوراً اپنے اصحاب کی طرف لوٹے اور ان سے کہا۔ خدا کا شکر کرو، اللہ نے آج کے دن ربیعہ کی اولاد کو اہل فارس پر غلبہ دے دیا

البدایہ والنہایہ، جلد ۳، صفحہ ۱۴۵

آپ نے ہجرت کی تیاری شروع کردی۔ آپ کے انتہائی اخفا کے باوجود قریش کو بھی خبریں مل رہی تھیں۔ طبرانی نے حضرت عروہ کے حوالے سے نقل کیا ہے:

ان مشرکی قریش اجمعوا امرھم ومکرھم حین ظنوا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خارج وعلموا ان اللہ قد جعل لہ بالمدینۃ مادی ومنعۃ وبلغھم اسلام الانصار ومن خرج الیھم من المھاجرین، فاجمعوا امرھم علی ان یاخذوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاما ان یقتلوہ واما ان یسجنوہ واما ان یوثقوہ واما ان یخرجوہ

مشرکین قریش نے جب یہ گمان کرلیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے چلے جائیں گے اور انھیں معلوم ہوا کہ اللہ نے آپ کے لئے مدینہ میں ٹھکانا اور حفاظت کا انتظام کردیا ہے اور انھوں نے سنا کہ انصار نے اسلام قبول کرلیا ہے اور مہاجرین مدینہ میں جمع ہورہے ہیں تو انھوں نے آپ کے خلاف سازش کی اور طے کیا کہ آپ کو گرفتار کرلیں اور اس کے بعد یا تو قتل کردیں یا قید میں ڈال دیں یا شہر بدر کردیں یا باندھ کر رکھیں۔

(اخرجہ الطبرانی عن عروہ مرسلا)

اوس وخزرج کے ایمان کے بعد آپ نے چھ مہینے کے دوران سفر کا انتہائی کامل منصوبہ بنایا، اور اس کے بعد نہایت خاموشی سے مکہ سے نکل گئے۔

اہل یثرب کا اسلام

قدیم یثرب (مدینہ) میں دو عرب قبیلے اوس اور خزرج آباد تھے۔ اسی کے ساتھ وہاں چند یہودی قبیلے بھی تھے۔ یہود نے اوس و خزرج کو باہم لڑا رکھا تھا تاکہ وہ یہود کے مقابلہ میں کمزور رہیں اور ان کی مضبوط جمعیت بننے نہ پائے اور اس طرح یہود کی بالاتری ان کے اوپر قائم رہے۔ ہجرت نبوی سے پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ قبیلہ خزرج یہودیوں کے ابھارنے سے اوس کے خلاف آمادۂ جنگ ہو گیا۔ قبیلہ اوس کے ایک سردار ابوالحیسر انس بن رافع چند آدمیوں کو لے کر مکہ آئے تاکہ اپنے حریف کے مقابلہ میں قریش کی مدد حاصل کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی آمد کا علم ہوا تو آپ ان کے پاس گئے اور ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی۔

ان کے وفد کے ایک نوجوان ایاس بن معاذ اس سے متاثر ہوئے اور انھوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ خدا کی قسم اس سے بہتر ہے جس کے لئے تم آئے ہو (ھذا واللہ خیر مما جئتم بہ) مگر ان کے ساتھیوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی۔ ابوالحیسر انس بن رافع نے اپنے ہاتھ میں مٹی لے کر ایاس بن معاذ کے چہرہ پر پھینکی اور کہا: ان باتوں کو رہنے دو، میری زندگی کی قسم ہم تو اس کے علاوہ کسی اور کام کے لئے آئے ہیں (دعنا منک فلعمری لقد جئنا لغیر ھذا)

اوس کا وفد اسلام قبول کئے بغیر یثرب واپس چلا گیا۔ اس کے بعد اوس اور خزرج کے درمیان وہ جنگ ہوئی جو جنگ بُعاث کے نام سے مشہور ہے۔ اس وقت دونوں قبیلوں کے درمیان دشمنی اتنی بڑھ گئی تھی کہ ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ دوسرے قبیلہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے۔ اس جنگ میں پہلے خزرج نے اوس کو شکست دی۔ اس کے بعد اوس نے اپنے سردار ابواسید کی قیادت میں خزرج کو شکست دی۔ دونوں نے باری باری ایک دوسرے کو زبردست نقصانات پہنچائے۔ حتیٰ کہ ایک نے دوسرے کے باغات اور مکانات جلا ڈالے۔ دونوں عرب قبیلے خود ہی اپنے ہاتھوں کمزور ہو کر رہ گئے۔

اس جنگ کا فائدہ براہ راست یہود کو پہنچا۔ انھوں نے یثرب میں برتری کا مقام حاصل کرلیا۔ جب جذبات ٹھنڈے ہوئے تو دونوں قبائل کے سنجیدہ لوگوں کو احساس ہوا کہ انھوں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اپنے کو خود اپنے ہاتھوں ہلاک کرکے دشمن کو موقع دے دیا کہ وہ ان کے اوپر غلبہ حاصل کرلے۔ دونوں قبیلوں کے باشعور لوگوں نے طے کیا کہ وہ اپنے اختلافات کو بھول جائیں اور مشترکہ طور پر اپنا ایک بادشاہ مقرر کریں جو ان کے معاملات کا نظم کرے۔ اس کے لئے عبداللہ بن ابی خزرجی کا انتخاب ہوا جو ایک صاحب شخصیت آدمی تھا اور اپنے اندر قائدانہ اوصاف رکھتا تھا۔ عین اسی زمانہ میں یہ واقعہ ہوا کہ قبیلہ خزرج کے کچھ لوگوں نے کعبہ کی زیارت کے ارادہ سے مکہ کا سفر کیا۔ یہاں ان کی ملاقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی۔ آپ نے ان کو بتایا کہ میں خدا کا نبی ہوں تم لوگ میری دعوت کو قبول کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے بعد معاً ان کو یاد آیا کہ یہود بہت دنوں سے ان سے کہا کرتے تھے کہ ایک نبی غلبہ والا ظاہر ہونے والا ہے۔ ہم اس کے ساتھ ہوکر تم کو شکست دیں گے اور تمھارے اوپر اپنا غلبہ قائم کریں گے۔ یثرب والوں نے کہا: اے لوگو، خدا کی قسم یہ تو وہی نبی ہیں جن کی خبر تم کو یہود دیتے تھے۔ دیکھو، وہ تم سے پہلے اس کی طرف سبقت نہ کرنے پائیں۔

چنانچہ انھوں نے آپ کی دعوت قبول کرلی۔ انھوں نے مزید کہا: ہم اپنی قوم کو چھوڑ کر آئے ہیں۔ ان میں جتنا شر و عداوت ہے اتنا کسی اور قوم میں نہیں۔ شاید اللہ آپ کے ذریعہ ان کو متحد کردے۔ ہم واپس جاکر اس دین کو ان کے سامنے پیش کریں گے جس کو ہم نے قبول کرلیا ہے۔ اگر اللہ نے ان کو اس دین پر جمع کردیا تو آپ سے زیادہ اس ملک میں کوئی طاقت ور نہ ہوگا (سیرۃ ابن ہشام، جزء ثانی صفحہ ۳۸)

تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے بعد یثرب کے لوگ جوق در جوق اسلام لائے۔ وہ اسلام کے انصار (مددگار) بن گئے۔ ان کی قربانی اور تعاون سے اسلام کو عرب میں غلبہ حاصل ہوا۔

یثرب کے لوگوں نے ہجرت سے پانچ سال پہلے آپ کی دعوت کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کردیا تھا۔ مگر پانچ سال بعد یہی لوگ آپ کے مومن بن گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلی ملاقات کے وقت ان کے ذہن میں جنگ کے خیالات بھرے ہوئے تھے۔ وہ سارے معاملہ کو اس نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے کہ ان کا ایک دشمن ہے اور اس دشمن کو انھیں شکست دینا ہے۔ ان کی نفسیات پر جنگ کے مسائل چھائے ہوئے تھے۔ اس ذہنی پس منظر میں خدا اور آخرت کی باتیں انھیں غیر متعلق بلکہ تباہ کن معلوم ہوتی تھیں۔ ان کو ایسا نظر آتا تھا گویا ان کو اصل محاذ سے ہٹایا جارہا ہے۔

مگر جب جنگ بعاث میں ساری طاقت خرچ کرنے کے بعد ان کے حصہ میں صرف تباہی آئی۔

حتیٰ کہ یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ یہود ان کو لڑا لڑا کر ان کی عرب نسل کا خاتمہ کر دیں گے تو ان کا ذہن بدلنا شروع ہو گیا۔ اب وہ معاملہ کو جنگ سے وسیع تر دائرہ میں رکھ کر دیکھنے لگے۔ اب وہ جنگ کے بجائے امن، اختلاف کے بجائے اتحاد کی اصطلاحوں میں سوچنے لگے۔ ان کو نظر آیا کہ اصل مسئلہ اوس و خزرج کا نہیں بلکہ اوس و خزرج کے مقابلہ میں یہود کا ہے۔ اس کا حل انھیں یہ نظر آیا کہ ان کا ایک عقیدہ ہو جو قبائلی تفریق کو ختم کرے اور ان کے لیے نظریاتی اتحاد کی بنیاد فراہم کرے اور اسی کے ساتھ ایک شخصیت ہو جو ان کو باہم جوڑے اور ان کی مشترکہ قائد بن سکے۔ یہ دونوں چیزیں (نظریہ اور شخصیت) انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں مل گئیں اور انھوں نے لپک کر اس کو قبول کر لیا۔

اسی لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا بعاث کی جنگ ایک ایسی جنگ تھی جس کو اللہ نے اپنے رسول کی تائید کے لیے فراہم کیا تھا (کان یوم بعاث یوما قدّمہ اللہ تعالیٰ لرسولہ)

ہجرت

ہجرت کا واقعہ اسلامی تاریخ کا اہم ترین واقعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام نے اس کو اسلامی کیلنڈر کے آغاز کے لئے استعمال کیا۔ مگر اس واقعہ کی اصل حقیقت طلسماتی کہانیوں میں گم ہوگئی ہے۔

مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غار ثور میں داخل ہوئے تو مکڑی نے اس کے منھ پر جالا تن دیا اور اس کے بعد فاختہ آئی اور اس نے جالے کے اوپر انڈے دے دئے۔ مگر اس معاملہ میں وہی ہوا جو عام طور پر اس طرح کے واقعات میں ہوتا ہے۔ یعنی اصل بات پر اپنے تخیل سے اضافہ کرکے اس کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔

جیسا کہ ابن کثیر نے واضح کیا ہے، اس معاملہ میں صحیح ترین روایت وہ ہے جو امام احمد نے حضرت عبد اللہ بن عباس کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

فاقتصوا اثرہ فلما بلغوا الجبل اختلط علیھم فصعدوا الجبل فمروا بالغار فرأوا علی بابہ نسج العنکبوت فقالوا لو دخل ھھنا لم یکن نسج العنکبوت علی بابہ	وہ آپ کے نشانات پر چلے۔ جب وہ پہاڑ تک پہنچے تو راستہ ان پر مشتبہ ہوگیا۔ پھر وہ پہاڑ پر چڑھے اور غار سے گزرے۔ انھوں نے دیکھا کہ غار کے منھ پر مکڑی کا جالا ہے۔ یہ دیکھ کر انھوں نے کہا کہ اگر وہ یہاں داخل ہوتے تو اس کے منھ پر مکڑی کا جالا باقی نہ رہتا۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ انھوں نے جو غار دیکھا وہ غار ثور ہی تھا تب بھی مذکورہ روایت کے مطابق بات صرف اتنی ہے کہ انھوں نے اس کے منھ پر مکڑی کا جالا دیکھا۔ روایت میں یہ باتیں بالکل موجود نہیں ہیں کہ خدا نے حکم دیا تو ایک مکڑی آئی اور اس نے جالا تن دیا۔ پھر خدا نے فاختہ کو حکم دیا تو فاختہ آئی اور اس نے وہاں انڈے دے دئے۔ اس قسم کی تمام باتیں لوگوں نے اپنے تخیل سے اصل واقعہ پر اضافہ کرلیں۔

اس قسم کے اضافوں کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ آدمی کی نگاہ عجائبات اور طلسمات کی

طرف چلی جاتی ہے اور حکمت اور نصیحت کا پہلو نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

مہاجرین کی نصرت

مدینہ کے قبائل (انصار) نے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا ساتھ دیا وہ تاریخ کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔ لوگ کسی کو کوئی چیز دیتے ہیں تو وہ یا بدلہ کے طور پر ہوتا ہے یا خوف کی وجہ سے۔ لین دین کی تیسری قسم وہ ہے جو "برکت" کے تصور کے تحت وجود میں آتی ہے۔ کچھ زندہ یا مردہ لوگوں کے بارے میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہ "بزرگ" ہیں، اور ان کے اوپر خرچ کرنا یا چڑھاوا چڑھانا اولاد اور اموال میں ترقی کا باعث ہوگا۔ مگر معلوم انسانی تاریخ میں غالباً یہ پہلی نمایاں مثال ہے کہ ایک قوم نے خالص مقصدی بنیادوں پر لٹے پٹے مہاجرین کے لئے اپنے دروازے کھول دیئے۔ ان کو نہ صرف اپنے گھروں میں جگہ دی بلکہ مواخاۃ قائم کر کے ان کو سگے بھائی کی طرح اپنی جائدادوں میں حصہ دار بنا دیا۔ اور یہ سب کچھ یہ جانتے ہوئے کیا کہ مہاجرین کی یہ امداد صرف اقتصادی قربانی ہی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ عرب و عجم کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ حضرت علی کے یہ دو الفاظ ان کی بہترین تصویر ہیں:

کانوا صُدقاء صبراء	(اوس و خزرج کے لوگ) بڑے سچے اور بڑے صبر کرنے والے تھے۔
(البدایہ والنہایہ، جلد ۳)	

جب مہاجرین اپنا وطن چھوڑ کر یثرب پہنچے تو انصار کا یہ حال تھا کہ ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ مجھے میزبانی کا شرف حاصل ہو۔ حتیٰ کہ اس کے لئے قرعہ اندازی کی نوبت آگئی۔ انھوں نے اپنے اموال کے بہترین حصہ کو مہاجرین کے حوالے کر دیا (ولقد تشاحّوا فینا حتی ان کانوا لیقترعون علینا ثم کنا فی اموالھم احق بھا منھم) ان کے غیر معمولی ایثار کے باوجود ان سے باقاعدہ بیعت لی گئی کہ عہدوں کی تقسیم میں دوسروں کو ان پر ترجیح دی جائیگی (اثرۃ علینا) مگر وہ اس کے لئے جھگڑا نہ کریں گے (ان لاننازع الامر اھلہ)

تہذیب سیرت ابن ہشام، جلد اول، صفحہ ۱۱۱

تاہم ہجرت کے بعد مدینہ کی زندگی آپ کے لئے کوئی آرام کی زندگی نہ تھی۔ اہلِ عرب کی متحدہ جارحیت کے بارے میں تمام اندیشے اپنی بدترین شکل میں صحیح ثابت ہوئے۔ حضرت ابی بن کعب بیان کرتے ہیں:

لما قدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم اصحابہ المدینۃ وآوتھم الانصار رمتھم العرب عن قوس واحدۃ فکانوا لایبیتون الا فی السلاح ولا یصبحون الا فیہ	جب آپ اور آپ کے اصحاب مدینہ آئے اور انصار نے انھیں پناہ دی تو تمام عرب نے مل کر آپ کو نشانہ پر لے لیا۔ مدینہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہوا کہ وہ ہتھیاروں کے ساتھ رات گزارتے اور ہتھیار کے ساتھ صبح کرتے۔
(کنز العمال جلد ۱، صفحہ ۲۵۹)	

قریش نے تمام عرب میں اہل مدینہ کے معاشی بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ شہر کی معاشیات اچانک بڑھ جانے والی دگنا آبادی کے لئے انتہائی ناکافی ہوگئیں۔ اس پر مزید آئے دن ہونے والی جنگوں کے اخراجات، ان چیزوں نے

معاشی تنگی کو اپنے آخری درجہ پر پہنچا دیا۔ حضرت عمر کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبر اسلام کو مدینہ میں دیکھا ہے۔ آپ سارے دن بھوک سے بے قرار رہتے۔ ردی کھجوریں بھی اتنی میسر نہ آتیں جس سے اپنا پیٹ بھر سکیں۔ بعد کے دور میں حضرت عائشہ سے کسی نے چراغ کا ذکر کیا تو انھوں نے جواب دیا: اگر ہمارے پاس چراغ جلانے کے لئے تیل ہوتا تو اس کو ہم پی جاتے۔ غزوات میں بے سروسامانی کا عالم یہ تھا کہ حضرت ابو موسیٰ فرماتے ہیں، ہم لوگ آپ کے ہمراہ غزوہ کے لئے نکلے۔ ہمارے پاس چھ آدمیوں کے درمیان صرف ایک اونٹ تھا جس پر ہم باری باری سوار ہوتے۔ مسلسل پیدل چلنے کی وجہ سے ہمارے قدم چھلنی ہو گئے اور ہم نے اپنے پیروں پر چیتھڑے لپیٹ لئے، اسی لئے اس غزوہ کا نام ذات الرقاع (چیتھڑوں والا) رکھا گیا۔ غزوات کے سفر میں کھانے کا ذخیرہ اتنا کم ہوتا تھا کہ بعض اوقات لوگ کھجور کو کھانے کے بجائے چوستے تھے، اور بقیہ کمی کو ببول کے پتوں اور ٹڈیوں کے ذریعہ پوری کرتے تھے۔ اس پر مزید اضافہ وہ بیماری تھی جو غذائی عادت کی تبدیلی سے پیدا ہوئی۔ مکہ کے باشندے گوشت اور دودھ کے عادی تھے۔ مدینہ میں انھیں کھجور کھانے کو ملی۔ طبرانی نے روایت کیا ہے کہ ایک روز جب کہ آپ جمعہ کی نماز پڑھانے کے لئے مسجد میں تشریف لائے، ایک مکی مسلمان نے چلا کر کہا:

یا رسول اللہ! احرق بطوننا التمر (طبرانی)	اے خدا کے رسول! کھجور نے ہمارے پیٹوں کو جلا دیا

آپ کے مدینہ پہنچنے کے بعد اسلام عملی اور تاریخی طور پر دعوت کے مرحلہ سے نکل کر عملی مقابلہ کے مرحلہ میں داخل ہو گیا۔ دور دعوت میں آپ کا اصول یہ تھا کہ لوگوں کے معاشی، سیاسی، قبائلی اور اس طرح کے دوسرے نزاعی مسائل کو نہ چھیڑتے ہوئے اور اس سے بے تعلق رہ کر خالص "انذار و تبشیر" کے کام میں مشغول رہیں۔ بنی عامر بن صعصعہ کو آپ نے سوق عکاظ میں اسلام کی دعوت دی تو انھیں یہ بھی یقین دہانی کرائی کہ میں صرف پُرامن طور پر اپنا دینی پیغام پہنچاؤں گا۔ اس کے علاوہ تمہارے درمیان کوئی سیاسی، اقتصادی یا قبائلی جھگڑا نہیں کھڑا کروں گا۔ آپ نے ان سے فرمایا:

انی رسول اللہ، فان اتیتکم تمنعونی حتی ابلغ رسالۃ ربی ولم اکرہ احدا منکم علی شیئ ابو نعیم، دلائل النبوۃ، ۱۰۰	میں اللہ کا رسول ہوں۔ میں تمہارے یہاں آؤں تو کیا تم میری حفاظت کرو گے تاکہ میں اللہ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچا دوں اور میں تم میں سے کسی کو کسی چیز پر مجبور نہیں کروں گا۔

بعثت کے اصل مقصد کی حیثیت سے یہ کام اب بھی بدستور جاری تھا۔ مگر اب اسلام کو ایک اور چیز سے نمٹنا تھا۔ اور وہ ماحول کے پیدا کردہ عملی مسائل تھے۔ اس سلسلے میں آپ نے اپنے سامنے بنیادی اصول یہ رکھا کہ ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جن سے لوگوں کے دل اسلام کے لئے نرم ہو جائیں، اور لڑائی بھڑائی کے بغیر اسلامی مقاصد تک پہنچنا ممکن ہو سکے۔ یہی وہ بات ہے جس کو آپ نے ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے:

نصرت بالرعب علی مسیرۃ شہر	ایک مہینہ تک کی مسافت کے رعب سے میری مدد کی گئی ہے۔

اس طریق عمل کے دو خاص پہلو تھے۔ ایک قوت مرہبہ کا حصول (انفال۔ ۶۰) دوسرے تالیف قلب (توبہ۔ ۶۰)

تالیف قلب کے تحت آپ نے لوگوں کو اس کثرت سے اموال دیئے کہ داد و دہش کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ صفوان بن امیہ مکہ کے بڑے سردار تھے۔ فتح مکہ کے بعد وہ بھاگ کر ایک گھاٹی میں چھپ گئے۔ آپ نے انھیں امان دے کر بلایا۔ ہوازن کی فتح کے بعد جب آپ جعرانہ کے مقام پر مال غنیمت کی دیکھ بھال کر رہے تھے، اس وقت صفوان بن امیہ آپ کے ساتھ تھے اور ابھی حالت کفر میں تھے۔ صفوان بن امیہ ایک گھاٹی پر پہنچے جو بکریوں اور اونٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ حیرت و استعجاب کے ساتھ مسلسل اس کو دیکھتے رہے۔ آپ نے ان کا یہ حال دیکھ کر پوچھا "اے ابو وہب! کیا یہ مال سے بھری ہوئی گھاٹی تم کو پسند ہے"، صفوان نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا هولك وما فيه (وہ اور اس میں جو کچھ ہے، سب تمہارا ہے) صفوان نے یہ سن کر کہا، نبی کے سوا کسی کا نفس اتنی بڑی سخاوت نہیں کر سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور اسی وقت اسلام قبول کر لیا۔ (فاسلم مکانه) کنز العمال جلد ۵، صفحہ ۲۹۴

آپ کا متعدد شادیاں کرنا بھی ایک اعتبار سے اسی ذیل کا ایک واقعہ ہے۔ قبائلی نظام میں رشتہ داری اولین اہمیت کی چیز سمجھی جاتی تھی۔ ہجرت کے بعد آپ کا کئی شادیاں کرنے کا اہم پہلو یہ تھا کہ اس کے ذریعہ بے شمار لوگوں سے رشتہ داریاں قائم ہوگئیں اور ان کے قلوب آپ کے اور آپ کی دعوت کے حق میں نرم پڑ گئے۔ پہلی شادی کے علاوہ، جو آپ نے تقریباً دگنی عمر کی بیوہ سے نبوت سے پہلے کی تھی، دوسری شادیاں حقیقۃً ازدواجی تقاضے کے تحت وقوع میں نہیں آئیں، بلکہ ان کے ذریعہ اہم دعوتی اور سیاسی فائدے حاصل کرنا مقصود تھا۔

معاہدہ حدیبیہ کی رو سے اگلے سال (۶۲۸) آپ دو ہزار مسلمانوں کے ساتھ کعبہ کی زیارت کے لئے مکہ گئے۔ اس موقع پر تین روزہ قیام کے دوران آپ نے میمونہ بنت الحارث سے نکاح کیا جو بیوہ ہو گئی تھیں۔ میمونہ کی آٹھ بہنیں تھیں جن کی شادی مکہ کے آٹھ ممتاز گھرانوں میں ہوئی تھی۔ آپ نے میمونہ سے نکاح کر کے آٹھ خاندانوں سے اپنی رشتہ داری قائم کر لی۔ نیز خالد بن ولید میمونہ کے بھتیجے تھے اور انھوں نے ان کو اپنے بچے کی طرح پالا تھا۔ نکاح کے بعد قریش کا سب سے بڑا فوجی سردار آپ کا بیٹا ہو گیا۔ چنانچہ اس کے بعد پھر خالد بن ولید مسلمانوں کے خلاف کسی معرکہ میں نہیں نکلے اور جلد ہی مسلمان ہو گئے۔ اس تقریب سے آپ نے مکہ والوں کی دعوت ولیمہ کا بھی انتظام کیا تھا۔ مگر مکہ والوں نے کہا کہ معاہدہ کے مطابق آپ صرف تین روز مکہ میں ٹھہر سکتے ہیں اور یہ مدت پوری ہو چکی ہے، آپ کو فوراً واپس جانا چاہئے۔ اس لئے آپ مکہ والوں کو ولیمہ نہ کھلا سکے جو درحقیقت ان کی تالیف قلب کے لئے انتہائی اہمیت رکھتا تھا۔ خالد بن الولید اور عمرو بن العاص دونوں ایک ساتھ مسلمان ہوئے تھے۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو ان کو دیکھ کر ایک شخص چیخ پڑا: ان دو کے بعد مکہ نے اپنی نکیل دے دی (قد اعطت مكة المقادة بعد هذين، اخرجه البيهقي من طريق الواقدي)

ام حبیبہ بنت ابو سفیان اور ان کے شوہر عبید اللہ بن جحش نے اسلام قبول کر لیا تھا اور دونوں ہجرت کر کے حبش چلے گئے۔ وہاں ان کے شوہر نے نصرانیت اختیار کر لی، اس کے بعد جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے ام حبیبہ

سے نکاح کا منصوبہ بنایا۔ اس طرح آپ ابو سفیان کے داماد ہو جاتے تھے جو بدر میں ابو جہل کے قتل ہو جانے کے بعد مکہ کے سب سے بڑے لیڈر تھے۔ اس کے لئے آپ نے غائبانہ نکاح کا انتظام کیا۔ کیونکہ اندیشہ تھا کہ اگر ام حبیبہ حبش سے مکہ واپس آگئیں تو ان کا باپ آپ سے نکاح نہ ہونے دے گا۔ ام حبیبہ سے آپ کا نکاح غائبانہ طور پر نجاشی (بادشاہ حبش) نے پڑھایا۔ اس کے بعد وہ سیدھی مدینہ بھیج دی گئیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے بعد ابو سفیان کی مخالفت کمزور پڑ گئی۔ یہاں تک کہ فتح مکہ سے ایک دن پہلے انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔

اس حکمت کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو قرآن کے الفاظ میں "ارہاب" کی پالیسی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی طاقت کے استعمال کے بجائے طاقت کے مظاہرہ کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ احد (۳ھ) کی شکست مسلمانوں کے لئے مکمل شکست بن سکتی تھی اگر ابو سفیان اپنی فوج کو لے کر واپس نہ ہو جاتا اور اگلے روز دوبارہ حملہ کرتا۔ چنانچہ روحا کے مقام پر پہنچ کر ابو سفیان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، اور وہ اپنی فوج کو دوبارہ مدینہ کی طرف واپس لوٹانے کا ارادہ کرنے لگا۔ مگر اس سخت ترین انتشار کی حالت میں بھی پیغمبر اسلام کا جنگی اطلاعات کا نظام اتنا مکمل تھا کہ آپ کو فوراً ابو سفیان کے ارادہ کی خبر ہو گئی۔ آپ نے اقدام کا فیصلہ کیا۔ آپ نے اپنی زخمی فوج کو منظم کر کے فوراً مکہ کی طرف کوچ کر دیا اور حمراء الاسد تک پہنچ گئے جو مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ آپ کا یہ سفر پورے اعلان و اظہار کے ساتھ تھا جب کہ عام طور پر آپ نہایت خاموشی کے ساتھ کوچ کیا کرتے تھے۔ ابو سفیان کو خبر ہوئی تو اس نے سمجھا کہ آپ کو مزید کمک آگئی ہے۔ وہ واپسی کا ارادہ ترک کر کے مکہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب آپ کو اطمینان ہو گیا کہ ابو سفیان کی فوج واپس ہو چکی ہے تو آپ مدینہ لوٹ آئے۔

غزوۂ مُوتہ (جمادی الاولی ۸ھ) کے اگلے سال قیصر روم نے سرحد شام پر فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس کے ماتحت غسانی اور دوسرے عرب سردار بھی فوج اکھٹا کرنے لگے۔ اس کے جواب میں آپ ۳۰ ہزار کا لشکر لے کر نکلے جس کو غزوۂ تبوک (رجب ۹ھ) کہا جاتا ہے۔ تبوک کا غزوہ حقیقۃً ایک جنگی تدبیر تھی جس کا مقصد دشمن کے اقدام سے پہلے اقدام تھا، تاکہ دشمن مرعوب ہو کر اقدام کا حوصلہ کھو دے۔ چنانچہ تبوک کے مقام پر پہنچ کر جب معلوم ہوا کہ قیصر نے مقابلہ کے لئے بڑھنے کے بجائے سرحد سے اپنی فوجیں ہٹانی شروع کر دی ہیں تو آپ نے بھی حربی ارادہ ترک کر دیا۔ البتہ قیصر کے ہٹ جانے سے آپ کو جو اخلاقی فتح حاصل ہوئی تھی اس سے آپ نے سیاسی فائدہ اٹھانے کا منصوبہ بنایا۔ آپ نے تبوک میں بیس دن ٹھہر کر سرحد کے ان قبائل سے ربط قائم کیا، جو اس وقت تک رومیوں کے زیر اثر تھے۔ اس سلسلے میں دومۃ الجندل کے عیسائی رئیس اُکیدر بن عبد الملک کندی، ایلہ کے عیسائی یوحنا بن رویہ، اور اسی طرح مقنا، جربا اور اذرُح کے نصرانی رؤسا نے بھی جزیہ ادا کر کے مدینہ کی ماتحتی قبول کی۔

ابو بکر صدیق کی خلافت کے بعد جیش اسامہ کی روانگی بھی اسی قسم کا ایک واقعہ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد قبیلہ طے کے سوا مدینہ کے اطراف کے تمام عرب قبائل باغی ہو گئے۔ اپنی تعداد کی کمی اور دشمن کی کثرت کی وجہ سے مسلمانوں کا حال ایسا ہو رہا تھا جیسے "جاڑے کی بارش میں بھیگی ہوئی بکری"۔ اس وقت بظاہر ہر

حالات کا تقاضا تھا کہ اندرونی دشمنوں کو زیر کرنے کے لئے اپنی طاقت کو محفوظ رکھا جائے۔ مگر پیغمبر کے فیصلہ پر قائم رہتے ہوئے خلیفہ اول نے طے کیا کہ اسامہ کے لشکر کو جو سات سو افراد پر مشتمل تھا رومیوں کے مقابلہ کے لئے شام روانہ کردیں۔ اس اقدام کا جو اثر پڑا وہ حضرت ابوہریرہ کے الفاظ میں یہ ہے :

فجعل لا یمر بقبیل یرید دن الارتداد الا قالوا: لولا ان لھولاء قوۃ ماخرج مثل ھولاء من عندھم ولکن ندعھم حتی یلقوا الروم، فلقوا الروم فھزموھم وقتلوھم ورجعوا سالمین فثبتوا علی الاسلام

البدایہ والنہایہ جلد ۶ ۔ صفحہ ۳۰۵

اسامہ رضؓ کا لشکر جب ان قبیلوں پر سے گزرتا جو مرتد ہونا چاہ رہے تھے۔ وہ کہتے اگر مسلمانوں کے پاس قوت نہ ہوتی تو اس قسم کی فوج ان کے پاس سے روانہ نہ ہوتی۔ ہم ابھی انھیں چھوڑ دیں اور روم سے لڑنے دیں، چنانچہ وہ رومیوں سے لڑے اور انھیں شکست دی اور انھیں قتل کیا اور سلامتی کے ساتھ واپس آئے۔ یہ دیکھ کر ارتداد کا ارادہ کرنے والے بھی اسلام پر جم گئے۔

آپ مدینہ پہنچے تو وہاں مشرکین کی ایک مختصر اقلیت کو چھوڑ کر دو بڑے گروہ آباد تھے۔ یہود اور مسلمان ۔ پھر یہ بھی مختلف ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے جن کے درمیان کوئی اتفاق نہ تھا۔ لوگ نفسیاتی طور پر ایک ایسے شخص کے منتظر تھے جو ان کے درمیان اتحاد اور نظم پیدا کردے۔ آپ نے اس صورت حال کا اندازہ کرکے اپنی طرف سے ایک صحیفہ (نہ کہ معاہدہ) جاری کردیا جس میں یہود اور مسلمانوں کو مستقل حیثیت سے تسلیم کیا گیا تھا (انھم امۃ واحدۃ من دون الناس، ان یھود امۃ مع المومنین ۔ للیھود دینھم وللمسلمین دینھم) اس صحیفہ میں دونوں کے مروجہ حقوق اور ذمہ داریوں کو چھیڑے بغیر انھیں ایک قابل قبول شکل میں تسلیم کرلیا گیا۔ اور اس کے بعد ایک دفعہ ان لفظوں میں شامل کردی گئی :

وانکم مھما اختلفتم فیہ من شیٔ، فان مردہ الی اللہ عزوجل والی محمد

اور جب بھی تم میں کسی معاملہ میں کوئی اختلاف ہو تو وہ معاملہ خدا اور رسول کی طرف لوٹے گا۔

تہذیب سیرۃ ابن ہشام، ۱۲۹

اس طرح یہ صحیفہ گویا ایک قسم کا سیاسی اقدام تھا جس کے ذریعہ آپ نے انتہائی حکیمانہ طور پر مدینہ کے اوپر اسلام کی دستوری حکومت کا اعلان کردیا۔

آپ کے مدینہ پہنچنے کے بعد قریش کا غصہ کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گیا۔ کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ سارے مسلمانوں نے سمٹ کر ایک مقام پر اپنا مضبوط مرکز بنالیا ہے۔ ہجرت کے دوسرے ہی سال آپ کے سامنے یہ نازک صورت حال آئی کہ یا تو آگے بڑھ کر قریش کے لشکر کا مقابلہ کریں یا اس کو موقع دیں کہ وہ مدینہ میں گھس آئے اور اسلام کے بنتے ہوئے آشیانہ کو منتشر کردے۔ اگرچہ قریش کے لشکر کی تعداد ساڑھے نو سو اور مسلمانوں میں قابل جنگ افراد کی تعداد صرف تین سو تیرہ تھی۔ مگر آپ نے اپنے پیغمبرانہ تدبر سے یہ سمجھا کہ اہل شرک اپنی کثرت کے باوجود

صرف نفرت اور حسد کا منفی سرمایہ اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے پاس ایمان ویقین کا مثبت خزانہ ہے جو اول الذکر سے بدرجہا زیادہ طاقت ور ہے۔ اس کے علاوہ عرب اپنے جاہلی نخوت کے تحت اکیلے اکیلے لڑتے تھے تاکہ ہر شخص اپنا منفرد کمال دکھائے اور بہادر مشہور ہو۔ مسلمان اللہ پر ایمان لا کر اپنے اندر یہ کمزوری ختم کر چکے تھے۔ آپ نے انھیں عرب تاریخ میں پہلی بار مورچہ بندی کی تلقین کی۔ آپ نے انھیں سکھایا کہ ذاتی کمال دکھانے کا شوق نہ کرو، بلکہ دستہ بنا کر لڑو۔ قریش کی انفرادی طاقت کو اپنی اجتماعی طاقت سے شکست دو (صف ۴) ایمان اور مورچہ بندی کی طاقت سے وہ عظیم الشان واقعہ وجود میں آیا جس کو اسلام کی تاریخ میں بدر کی فتح کہتے ہیں۔

فتح اسلام

بدر کی شکست نے دوبارہ قریش کو بھڑکایا اور مختصر سی مدت میں ان سے کئی معرکے پیش آئے، جن میں احد (۳ ھ) اور احزاب (۵ ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان غزوات میں مسلمانوں کو شدید ترین مصائب پیش آئے۔ غزوۂ خندق میں ۳۰۰۰ آدمی تھے۔ مگر سردی اور بھوک اور تکان کا عالم یہ تھا کہ جب آپ نے دشمن کی جاسوسی کے لئے ایک شخص کو بھیجنا چاہا تو تین بار آواز دینے کے بعد بھی کوئی نہ اٹھا، یہاں تک کہ آپ حضرت حذیفہ کے پاس آئے اور نام لے کر ان کو بلایا اور ان کو اس کام پر متعین کیا۔

دوسری طرف مدینہ کے یہود ایک مستقل اندرونی مسئلہ بنے ہوئے تھے۔ قریش سے مل کر دونوں کے درمیان اسلام کے خلاف سازشیں جاری رہتی تھیں۔ خندق کے ۲۰ روزہ محاصرہ کے بعد جب ایک شدید آندھی سے مجبور ہو کر قریش کی فوج مکہ واپس ہوئی تو آپ نے اس موقع کو مدینہ کے اندرونی یہودیوں سے نمٹنے کے لئے موزوں ترین سمجھا جس میں ان یہودیوں کی سازش اور بغاوت برہنہ ہو کر سامنے آچکی تھی۔ آپ نے مدینہ کے قبائل (بنونضیر، بنو قینقاع، بنو قریظہ) کو خندق سے لوٹتے ہی فوراً گھیر لیا اور ان پر خود ان کی کتاب تورات کے قانون کو جاری کر کے ان کے مسئلہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

اب مسئلہ خیبر کا تھا۔ ہجرت کے چھٹے سال یہ صورت حال تھی کہ درمیان میں مدینہ کا دار الاسلام تھا اور جنوب میں چار سو کلومیٹر کے فاصلہ پر مکہ کے قریش تھے اور شمال میں دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر خیبر کے یہودی۔ قریش اور یہودی، اسلام دشمنی میں متفق الرائے ہونے کے باوجود، اکیلے اکیلے اتنے طاقت ور نہ تھے کہ تنہا اسلام کو ختم کرنے کا حوصلہ کر سکیں۔ اسی لئے ان کے درمیان مشترکہ جنگی اقدام کی سازشیں چل رہی تھیں۔ دوسری طرف مسلمان بھی اس پوزیشن میں نہ تھے کہ بیک وقت اپنے دونوں دشمنوں کا مقابلہ کر سکیں۔

ان حالات میں آپ نے ربانی تدبیر کے تحت ذی قعدہ ۶ھ میں اپنے ڈیڑھ ہزار اصحاب کے ساتھ مکہ کی طرف کوچ کر دیا، اور اعلان فرمایا کہ ہم کسی کے خلاف جنگ کے لئے نہیں جا رہے ہیں، بلکہ عمرہ کرنے کے لئے جا رہے ہیں۔ قربانی کے جانوروں کا قافلہ بھی آپ نے اپنے ساتھ لے لیا۔ حتیٰ کہ زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق

اونٹوں کو قربانی کا نشان (قلادہ) بھی پہنانے کا حکم دیا تاکہ مکہ والوں کو بخوبی معلوم ہوجائے کہ آپ زیارت کعبہ اور قربانی ہی کے لئے آئے ہیں۔ اس سفر کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ قریش پر اس بات کا مظاہرہ ہو کہ آپ کا مقصد کعبہ کی مذہبی یا تجارتی حیثیت کو ختم کرنا نہیں ہے۔

مکہ سے تقریباً گیارہ کیلو میٹر کے قریب حدیبیہ کے مقام تک پہنچے تھے کہ حسب توقع قریش نے آگے بڑھ کر روکا۔ آپ نے جھگڑے سے بچتے ہوئے وہیں پڑاؤ ڈال دیا اور قریش کو پیغام بھیجا کہ ہمارے اور تمھارے درمیان صلح کا معاہدہ ہو جائے:

انا لم نجیٔ لقتال احد ولکن جئنا معتمرین وان قریشا قد نهکتهم الحرب واضرت بهم فان شاؤا ماددتهم مدة ویخلوا بینی وبین الناس، فان اظهر فان شاؤا ان یدخلوا فیما دخل فیه الناس فعلوا والا فقد جموا، وان هم ابوا فوالذی نفسی بیده لاقاتلنهم علیٰ امری هذا حتی تنفرد سالفتی ولینفذن امر الله (صحیح بخاری)

ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے ہیں، بلکہ صرف عمرہ کے لئے آئے ہیں۔ جنگ نے قریش کا برا حال کر دیا ہے اور ان کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ اگر وہ چاہیں تو میں ان کے لئے ایک مدت (جنگ نہ کرنے کی) مقرر کردوں اور وہ میرے اور لوگوں کے درمیان سے ہٹ جائیں۔ اگر میں غالب رہوں تو وہ چاہیں تو اس دین میں داخل ہوجائیں گے جس میں لوگ داخل ہوئے اور مجھے غلبہ نہ ہوا تو ان کا مدعا حاصل ہے اور اگر قریش نے اس سے انکار کیا تو اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، میں اس معاملہ میں ان سے لڑوں گا خواہ میری گردن الگ ہوجائے اور اللہ کا امر پورا ہو کر رہے گا۔

یہ پیغام درحقیقت خود قریش کے اندر موجود ایک فکر سے فائدہ اٹھانا تھا۔ مکہ کے ابتدائی دور میں جب عتبہ بن ربیعہ قریش کے ایک نمائندہ کی حیثیت سے آپ سے ملا اور آپ سے گفتگو کے بعد قریش کی طرف لوٹا تو ایک روایت کے مطابق اس نے جو باتیں قریش سے کہیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی:

واترکوا الرجل واعتزلوه، فوالله ماهو بتارك ماهو علیه وخلوا بینه وبین سائر العرب فان یظهر علیهم یکن شرفه شرفکم وعزه عزکم وان یظهروا علیه قد کفیتموه بغیرکم

البدایہ والنہایہ

اس آدمی کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ خدا کی قسم وہ اپنی بات سے باز آنے والا نہیں۔ تم ان کے اور تمام عرب کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔ اگر وہ عرب پر غالب آگئے تو ان کی عزت تمھاری عزت ہوگی اور اگر وہ مغلوب ہوگئے تو تم دوسروں کے ہاتھوں ان سے نجات پالوگے۔

یہ فکر جو خود قریش کے اندر دبا ہوا موجود تھا۔ اسی کو آپ نے استعمال کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود دشمن کے اندر

آپ کو اپنے نقطۂ نظر کے حامی مل گئے۔

ایک طرف آپ نے یہ پیغام کہلایا۔ دوسری طرف قریش کو مختلف طریقوں سے متاثر کرنے کا عمل بھی شروع ہوگیا۔ بنی کنانہ کا ایک شخص مکہ سے روانہ ہوکر حدیبیہ پہنچا تاکہ یہ معلوم کرے کہ مسلمان کس لئے آئے ہیں لوگوں نے آپ کو اطلاع دی تو آپ نے فرمایا کہ اس شخص کے قبیلہ میں قربانی کے اونٹوں کی تعظیم کی جاتی ہے تم لوگ اپنے قربانی کے اونٹوں کو لے کر اس کا استقبال کرو۔ مسلمانوں نے اونٹوں کا قافلہ بنایا اور لبیک اللّٰھم لبیک پڑھتے ہوئے اس کے سامنے سے گزرے۔ یہ شخص مکہ واپس ہوا تو بہت متاثر تھا۔ اس نے قریش سے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ مسلمان صرف زیارت کعبہ کی غرض سے آرہے ہیں انھیں روکا نہ جائے۔

اسی طرح ڈیڑھ ہزار مسلمانوں کے ایمان و اسلام کا مظاہرہ بھی انھیں شدید طور پر متاثر کرنا تھا۔ قریش کا ایک سفیر جب حدیبیہ پہنچا تو مسلمان صف بندی کرکے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز کے ضبط و نظم کا منظر دیکھ کر وہ اتنا مرعوب ہوا کہ واپس ہوکر قریش سے کہا کہ مسلمانوں کا اتحاد اتنا زبردست ہے کہ ساری کی ساری قوم محمد کے ایک اشارے پر حرکت کرتی ہے ـــــــ ایک سفیر نے دیکھا کہ پیغمبر اسلام جب وضو کرتے ہیں تو مسلمان دوڑتے ہیں کہ ان کے غسالہ کو زمین پر گرنے سے پہلے اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ جب وہ بولتے ہیں تو سب کی آوازیں پست ہوجاتی ہیں۔ وہ ادب و تعظیم کی وجہ سے ان کی طرف دیکھتے تک نہیں۔ سفیر نے واپس ہوکر قریش سے مسلمانوں کی اس وفاداری اور محبت کا ذکر کیا تو وہ سخت مرعوب ہوئے۔

بدیل بن ورقاء الخزاعی کے ذریعہ جب مذکورہ پیغام قریش کو پہنچا تو ان کے ایک شخص (عروہ بن مسعود) نے تقریر کی:

فقام عروۃ بن مسعود فقال: ای قوم: السنتم بالوالد قالوا بلیٰ۔ قال السنتم بالولد۔ قالوا بلیٰ۔ قال فهل تتھمونی قالوا لا، قال فان ھذا قد عرض علیکم خطۃ رشد اقبلوھا و دعونی آتیہ (البدایہ والنہایہ)

اے میری قوم! کیا تم میں سے کچھ لوگ میرے والد کے برابر نہیں۔ لوگوں نے کہا کیوں نہیں، عروہ نے کہا، کیا تم میں سے کچھ میری اولاد کے برابر نہیں۔ لوگوں نے کہا کیوں نہیں۔ عروہ نے کہا کیا تمھیں میرے اوپر کوئی شک ہے۔ لوگوں نے کہا نہیں۔ عروہ نے کہا اس آدمی نے تمھارے سامنے ایک بہترین تجویز پیش کی ہے، تم اس کو مان لو اور مجھے جانے دو کہ میں ان سے بات کروں۔

آپ نے اعلان کردیا کہ قریش جس چیز کا بھی مطالبہ کریں گے، میں اس کو مان لوں گا (والذی نفسی بیدہ لا یسئلونی خطۃ یعظمون فیھا حرمات اللہ الا اعطیتھم ایاھا) تاہم ناجنگ معاہدہ لکھا جانے لگا تو انھوں نے طرح طرح سے حمیت جاہلیت کا مظاہرہ کیا، معاہدہ کے مسودہ سے "محمد رسول اللہ" کو مٹا کر محمد بن عبداللہ لکھوایا۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بجائے بسمک اللّٰھم لکھنے پر اصرار کیا۔ یہ دفعہ بڑھائی کہ قریش کا کوئی آدمی مسلمانوں کے ہاتھ لگے تو وہ اس کو واپس کرنے کے پابند ہوں گے۔ اس کے برعکس کوئی مسلمان قریش

کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اس کو واپس نہیں کریں گے۔ اس کی اجازت نہ دی کہ مسلمان اس سال مکہ جاکر عمرہ کریں۔ سارے صحابہ کے لئے یہ شرطیں انتہائی گراں ہو رہی تھیں۔ حتیٰ کہ ایک موقع پر جب عروہ بن مسعود نے کہا اے محمد! یہ جو ادھر ادھر کے لوگ آپ نے اپنے گرد جمع کر رکھے ہیں، یہ سب آپ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے (انی لاری اشوابا من الناس خلیقا ان یفروا ویدعوک) اس کو سن کر ابوبکرؓ جیسا سنجیدہ آدمی بھی غصہ میں آگیا۔ ان کی زبان سے نکلا:

امصص بظر اللات، انحن نفر عنہ وندعہ — تو لات کی شرم گاہ چوس، کیا ہم آپ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ (البدایہ والنہایہ)

مگر خدا کا رسول ہر قسم کی اشتعال انگیز باتوں کو برداشت کرتا رہا اور قریش کے ہر مطالبہ کو مان کر ان سے دس سال کے لئے ناجنگ معاہدہ کرلیا۔ اب قریش پابند ہو گئے کہ وہ دس برس تک بالواسطہ یا براہ راست کسی ایسی جنگ میں حصہ نہ لیں جو مسلمانوں کے خلاف ہو۔

یہ معاہدہ جو مسلمانوں پر اتنا سخت تھا کہ اس کی تکمیل کے بعد جب آپ نے لوگوں سے قربانی کرنے کو کہا تو تین بار اعلان کرنے کے باوجود کوئی ایک شخص قربانی کے لئے نہ اٹھا۔ اس کے بعد اٹھے بھی تو غم کا یہ حال تھا کہ قربانی کے بعد سر مونڈنے لگے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک دوسرے کو کاٹ ڈالیں گے (وجعل بعضهم يحلق بعضا حتى كاد بعضهم يقتل بعضا غما) مگر دب کر کئے جانے والے اس معاہدہ کے اتنے عظیم الشان فائدے ہوئے جن کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔

صلح حدیبیہ کے وقت مسلمانوں کے دو طاقتور حریف تھے، ایک خیبر کے یہودی۔ دوسرے مکہ کے قریش۔ مسلمان ابھی اتنے طاقتور نہ ہوئے تھے کہ بیک وقت دونوں سے نمٹ سکیں۔ ایک پر حملہ کرنا گویا دوسرے کو موقع دینا تھا کہ وہ پیچھے سے آکر مدینہ میں گھس جائے اور مسلمانوں کے مرکز کو برباد کردے۔ آپ نے یہ کیا کہ قریش مکہ کے سارے مطالبات منظور کرکے ان کو دس سال تک کے "ناجنگ معاہدہ" پر راضی کرلیا۔ اور اس طرح انھیں "بطن مکہ" میں روک دیا۔ (فتح۔ ۲۴) اس کے بعد مدینہ واپس آکر پہلی فرصت میں خیبر پر حملہ کرکے یہودی مسئلہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا۔ پہلا واقعہ ذی قعدہ ۶ھ میں ہوا اور دوسرا محرم ۷ھ میں۔

خیبر میں یہودیوں کے آٹھ پتھر کے قلعے تھے جن میں ۲۰ ہزار جنگ جو ایسے ہتھیاروں کے ساتھ جمے ہوئے تھے جن سے اسلامی فوج بالکل خالی تھی۔ ان قلعوں کے استحکام کے لئے وہی طریقہ اختیار کیا گیا تھا جس کو ۱۶۷۰ء میں فرانس کے فوجی انجینئر مارشل وابان (۱۷۰۷ – ۱۶۳۳) نے اختیار کرکے شہرت پائی۔ اس مضبوط اور مسلح شہر کو کس طرح فتح کیا گیا۔ یہ بذات خود ایک طویل داستان ہے۔ اس موقع پر جو حیرت انگیز جنگی حکمت عملی اختیار کی گئی، اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہ واقعہ کافی ہے کہ قلعوں کا پھاٹک توڑنے کے لئے یہ کیا گیا کہ بھاری درخت کا تنہ لے کر پچاس آدمی دوڑتے تھے اور اس کو تیزی سے قلعہ کے پھاٹک پر مارتے تھے، چند بار ایسا کرنے سے قلعہ کا دروازہ

ٹوٹ جاتا تھا اور اس کے بعد تیروں اور منجنیقوں کے طوفان میں مسلمان قلعہ کے اندر گھس جاتے۔ اس طرح چار قلعے مسخر ہوئے تھے کہ بقیہ نے مرعوب ہو کر خود سے اپنے دروازے کھول دیئے اور اپنے کو اسلامی فوج کے سپرد کر دیا۔

خیبر کی تسخیر کے بعد اب قریش مکہ کا مسئلہ تھا۔ آپ کی فراست ربانی نے بتایا کہ اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ دشمن کو موقع دیا جائے کہ وہ کوئی غلطی کرے تاکہ آپ کے لئے مداخلت جائز ہو جائے۔ آپ جانتے تھے کہ قریش کو جس چیز نے اسلام کے خلاف برانگیختہ کر رکھا ہے، وہ بغض، حسد، اقتدار پرستی اور گھمنڈ کے سوا کچھ نہیں ہے اور جو لوگ اس قسم کی نفسیات کے تحت کسی چیز کی مخالفت کریں وہ اپنے آپ کو غیر منطقی اور غیر اخلاقی کارروائیوں سے باز نہیں رکھ سکتے۔ اندازہ نہایت صحیح نکلا۔ قبیلہ خزاعہ اور قبیلہ بنی بکر کی جنگ (شعبان ۸ھ) میں قریش نے در پردہ اپنے حلیف قبیلہ (بنو بکر) کی حمایت میں آپ کے حلیف قبیلہ (بنو خزاعہ) کے خلاف چڑھائی کر کے یہی غلطی کی۔ یہ معاہدۂ صلح کی صریح خلاف ورزی تھی۔ یہ صلح حدیبیہ کے دو برس بعد کا واقعہ ہے۔ اس صلح کے نتیجہ میں اس مدت میں اسلام اتنا بڑھ چکا تھا کہ صلح حدیبیہ کے وقت اگر آپ کے ساتھ ڈیڑھ ہزار مرد تھے تو اب ان کی تعداد دس ہزار ہو چکی تھی۔ آپ نے خاموشی کے ساتھ مکہ کی طرف مارچ کر دیا۔ یہ سب کچھ اتنی حکمت اور تدبر کے ساتھ ہوا کہ تقریباً خون بہائے بغیر مکہ فتح ہو گیا:

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَأْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ فتح ــ ۲۰	وعدہ کیا ہے تم کو اللہ نے بہت غنیمتوں کا تم ان کو لوگے۔ بس شتاب دے دی تم کو یہ، اور روک دیئے لوگوں کے ہاتھ تم سے۔

معاہدہ کے وقت صورت حال یہ تھی کہ تقریباً ۲۰ برس کی مسلسل تبلیغی جد و جہد کے ذریعہ اسلام کی آواز سارے عرب میں پھیل چکی تھی۔ ہر قبیلہ میں بے شمار ایسے لوگ وجود میں آچکے تھے جن کے دلوں میں اسلام کی صداقت نے اپنی جگہ بنالی تھی۔ مگر اس وقت کے عرب میں قریش کو قیادت کا مقام حاصل تھا۔ لوگ قریش کے ڈر سے اپنے اسلام کا اعلان نہیں کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اسلام کا اعلان کرنا قریش سے جنگ چھیڑنے کے ہم معنی ہے۔ معاہدہ حدیبیہ کے بعد جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان دس سال کا ناجنگ معاہدہ ہو گیا ہے تو یہ خطرہ دور ہو گیا اور لوگ اس طرح اسلام قبول کرنے لگے جیسے ٹریفک پوسٹ پر بند سڑک کھلنے کے بعد اچانک سواریاں ٹوٹ پڑتی ہیں

قال الفقیه ابن شهاب الزهری وغیره ان الله فتح علی المسلمین بصلح الحدیبیة اکثر مما فتح الله علیهم به من ای غزو آخر بدلیل ان النبی صلی الله علیه وسلم رجع الی مکة عام الفتح بعشرة آلاف ولم تکن عدته من قبل لتزید علی ثلاثة	ابن شہاب زہری اور دوسروں نے کہا ہے کہ اللہ نے صلح حدیبیہ کے ذریعہ مسلمانوں کو جو فتوحات دیں وہ کسی بھی دوسرے غزوہ سے زیادہ تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فتح کے سال مکہ میں دس ہزار افراد کے ساتھ داخل ہوئے جب کہ اس سے پہلے ان کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہیں

آلاف بحال، وعلله بانه لما هادن قريشا لم يجد العرب حرجا ان يدخلوا الاسلام فان ذلك لا يغيظ قريشا ولا يعتبر تحديا لها

محمد صلی اللہ علیہ وسلم وبنو اسرائیل: ۱۰۲-۱۰۱

تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب قریش نے جنگ بندی کر دی تو عربوں کو اسلام میں داخل ہونے کے لئے کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ کیونکہ اب قریش کے غصہ اور مقابلہ کا خطرہ نہیں تھا۔

بخاری نے حضرت براء سے روایت کیا ہے، انھوں نے بعد کے لوگوں سے کہا، تم لوگ فتح مکہ کو فتح سمجھتے ہو۔ مگر ہم لوگ صلح حدیبیہ کو فتح کہا کرتے تھے۔ (ماکنا نعد الفتح الا یوم الحدیبیة)

اس معاہدہ کے ذریعے مدینہ کا اقتصادی محاصرہ ختم ہوگیا اور مدینہ کے تجارتی قافلے آزادی کے ساتھ مکہ سے گزرنے لگے۔ ابو بصیر، ابو جندل وغیرہ جن کو از روئے معاہدہ قریش کی طرف واپس آنا ضروری تھا، وہ بھاگ کر ذوالمروہ پہنچے۔ وہاں اس قسم کے اور مسلمان جمع ہونے لگے حتیٰ کہ وہ ایک نیا مرکز بن گیا اور اس نے قریش کے تجارتی قافلوں کو اتنا پریشان کیا کہ انھوں نے از خود معاہدہ کی یہ دفعہ ختم کر دی۔ انسان کی سب سے بڑی کمزوری عجلت اور ظاہر پرستی ہے۔ اگر آدمی ظواہر سے بلند ہو جائے تو اس دنیا میں اللہ تعالےٰ نے ایسے امکانات رکھے ہیں جو آدمی کو کامیابی تک پہنچانے کی یقینی ضمانت ہیں:

اخرج ابن عساکر عن الواقدی قال: کان ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ یقول: ماکان فتح اعظم فی الاسلام من فتح الحدیبیة ولکن الناس یومئذ قصر رأیهم عما کان بین محمد وربه والعباد یعجلون والله لا یعجل کعجلة العباد حتی یبلغ الامور ما اراد

حضرت ابوبکر فرماتے تھے اسلام میں فتح حدیبیہ سے زیادہ بڑی فتح کوئی نہیں ہوئی، مگر اس دن لوگوں کی نظریں وہاں تک نہ پہنچ سکیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رب کے درمیان تھا۔ بندے جلدی چاہتے ہیں۔ مگر اللہ بندوں کی طرح جلدی نہیں کرتا یہاں تک کہ معاملات وہاں پہنچ جائیں جہاں وہ انکو پہنچانا چاہتا ہے۔

حقیقت پسندی دنیا میں سب سے زیادہ کمیاب ہے، اگرچہ حقیقت پسندی ہی وہ چیز ہے جو کسی کامیابی تک پہنچنے کا واحد یقینی ذریعہ ہے۔

خیبر سے فارغ ہونے کے بعد ہی آپ نے ایک اور مہم کی تیاری شروع کر دی تھی۔ مگر کسی ایک شخص سے بھی آپ نے نہیں بتایا کہ یہ تیاری کس کے خلاف ہے حتیٰ کہ حضرت ابوبکر تک کو معلوم نہ تھا کہ آپ کدھر کا قصد کرنے والے ہیں۔ رمضان ۸ھ کے آغاز میں جب اسلامی لشکر نے آپ کے حکم کے مطابق مکہ کا رخ کیا، اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ آپ کی منزل کیا ہے۔ تاہم پورا سفر اتنی خاموشی سے طے ہوا کہ آپ مر الظہران تک پہنچ گئے اور مکہ والوں کو خبر نہ ہوئی (ولم تعلم به قریش) آپ نے روانگی سے پہلے دعا فرمائی:

اللهم خذ العیون والاخبار عن قریش حتی نبغتها فی بلادها

خدایا قریش سے جاسوسوں اور خبروں کو روک لے یہاں تک کہ میں ان کے شہر میں داخل ہو جاؤں

اس مہم کی تیاری کے لئے آپ نے حیرت انگیز انتظامات کئے۔ آپ نے حکم دیا کہ شہر مدینہ کا تعلق باہر سے منقطع کر دیا جائے۔ نہ کوئی شخص باہر سے شہر کے اندر داخل ہو اور نہ کوئی شخص شہر سے باہر جانے پائے۔ حضرت علی کی قیادت میں کچھ لوگ راستوں کی نگرانی کے لئے مقرر کر دیئے گئے۔ انھیں لوگوں نے حاطب بن ابی بلتعہ کے قاصد کو پکڑ کر اس سے مشہور خط برآمد کیا تھا۔ سارا لشکر سامان اور ہتھیار سے لیس تھا۔ (وفی کل القبائل عدد وسلاح، طبرانی عن ابن عباس)

مسلمانوں کی ساری تعداد کو ساتھ لیا گیا (لم یتخلف منھم احد) روانگی کا انتظام آپ نے اس طرح کیا کہ دس ہزار فوج کو مختلف دستوں میں بانٹ دیا۔ ہر دستہ کا ایک سردار تھا جو جھنڈا لے کر آگے چلتا اور اس کے پیچھے چند سو کا دستہ قطار در قطار مارچ کرتا۔ اپنے چچا حضرت عباس سے آپ نے کہا کہ ابوسفیان کو فوجوں کے مارچ کا منظر دکھایئے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم للعباس: اجلسہ بمضیق الوادی عند خطم الجبل حتّٰی تمر بہ جنود اللہ فیراھا	آپ نے حضرت عباس سے فرمایا، ابوسفیان کو پہاڑ کے پاس گزرگاہ پر روکے رہئے تاکہ اللہ کا لشکر ان کے سامنے سے گزرے اور وہ اس کو دیکھیں۔

(تہذیب سیرۃ ابن ہشام، جلد ۲، صفحہ ۶۱)

اسلامی لشکر قطار در قطار گزر رہا تھا اور ابوسفیان حیرانی کے ساتھ دیکھ رہے تھے، یہاں تک کہ ابوسفیان کی زبان سے نکلا من لہ بھؤلاء طاقۃ لم ار کالیوم جنودا قط ولا جماعۃ۔ ایک طرف آپ نے مکہ کے لیڈر (ابوسفیان) کو اس طرح متاثر کیا، دوسری طرف یہ اعلان کر دیا کہ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اس کو امان ہے (من دخل دار ابی سفیان فھو آمن) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابوسفیان نے خود ہی مکہ میں اعلان کر دیا کہ اے لوگو محمد کی اطاعت قبول کر لو۔ آج ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت کسی میں نہیں۔ فتح مکہ کے بعد کے واقعات ثابت کرتے ہیں کہ اس مہم کے لئے اتنی زبردست تیاری مکہ میں خوں ریزی کے لئے نہ تھی بلکہ اہل مکہ کو مرعوب کرنے کے لئے تھی تاکہ خون بہائے بغیر مکہ پر اسلام کا قبضہ ہو جائے۔ لشکر اسلام کے سردار سعد بن عبادہ نے مکہ کے قریب پہنچ کر نعرہ لگایا الیوم یوم الملحمۃ (آج گھمسان کا دن ہے) آپ نے فرمایا نہیں، آج رحمت کا دن ہے اور ان کو سرداری سے معزول کر کے جھنڈا ان کے لڑکے قیس کو دے دیا۔

فتح مکہ کے بعد بھی اگرچہ کچھ لڑائیاں ہوئیں اور مجموعی طور پر آپ کے غزوات (چھوٹے بڑے) کی تعداد ۸۰ تک پہنچتی ہے۔ تاہم مکہ کا فتح ہونا ملک کے دار السلطنت کا قبضہ میں آنا تھا۔ چنانچہ معمولی جھڑپوں کے بعد سارے عرب نے آپ کے اقتدار کو تسلیم کر لیا۔

فتح کے بعد

دشمن کے اوپر فتح آدمی کے اندر بیک وقت دو جذبات پیدا کرتی ہے ——— غرور اور انتقام۔ مگر آپ کی فتح پیغمبر کی فتح تھی۔ آپ اس قسم کے جذبات سے بالکل خالی تھے۔ ابن اسحاق نے روایت کیا ہے کہ فتح مکہ کے وقت جب آپ مکہ میں داخل ہوئے تو تواضع سے آپ کی گردن جھکی ہوئی تھی، حتیٰ کہ لوگوں نے دیکھا کہ آپ کی داڑھی کجاوہ کی لکڑی کو چھو رہی ہے۔ باب کعبہ پر کھڑے ہو کر آپ نے جو خطبہ دیا، اس میں یہ الفاظ فرمائے:

لا الہ الا اللہ وحدہ صدق وعدہ ونصر عبدہ وہزم الاحزاب وحدہ (البدایۃ والنہایۃ)	ایک اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔ اس نے اپنے بندے کی مدد کی اور دشمن کی جماعتوں کو اس نے تنہا شکست دی۔

گویا آپ نے فتح کے اس واقعہ کو تمام کا تمام خدا کے خانہ میں ڈال دیا۔

اسی خطبہ میں آگے چل کر یہ الفاظ روایت کئے گئے ہیں:

ثم قال یا معشر قریش ماترون انی فاعل بکم قالوا خیرا، اخ کریم وابن اخ کریم قال فانی اقول لکم کما قال یوسف لاخوتہ لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء (زاد المعاد، ابن قیم)	آپ نے فرمایا اے گروہ قریش، میری نسبت تمھارا کیا خیال ہے کہ میں تمھارے ساتھ کیا کروں گا۔ انھوں نے کہا کہ بھلائی۔ آپ شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں۔ آپ نے فرمایا میں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا، آج تمھارے اوپر کوئی ملامت نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔

اس طرح آپ نے پہلے ہی مرحلہ میں اس چیز کو ختم کر دیا جو فاتح اور مفتوح کے درمیان انتقام اور ردعمل کی صورت میں لامحدود مدت تک جاری رہتی ہے۔ فاتح قومیں، اس طرح کی فتح کے بعد، عام

طور پر تخریب کے عمل میں لگ جاتی ہیں۔ مگر آپ نے عمومی معافی کا طریقہ اختیار کرکے تمام قوتوں کو تعمیر کے راستہ میں لگا دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر جب مکہ میں داخل ہوئے تو آپ نے اپنے فوجی سرداروں کو حکم دیا کہ وہ کسی سے جنگ نہ کریں الا یہ کہ کوئی خود ان سے لڑنے کے لئے آجائے (ان لا یقاتلوا الا من قاتلھم) فتح کے بعد آپ نے عمومی طور پر ان سب لوگوں کی معافی کا اعلان کردیا جنھوں نے آپ کے خلاف سخت ترین جرائم کئے تھے۔ البتہ آپ نے کچھ لوگوں کی بابت فرمایا کہ وہ قتل کردئے جائیں خواہ وہ کعبہ کے پردے کے نیچے پائے جائیں۔ ابن ہشام وغیرہ نے اپنی سیرت کی کتابوں میں نام بنام ان کا ذکر کیا ہے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ عبداللہ بن سعد: یہ مسلمان ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کاتب وحی مقرر کیا۔ پھر وہ مرتد ہو کر کافروں سے جا ملے۔ فتح مکہ کے بعد جب ان کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قتل کا حکم دیا ہے تو وہ بھاگ کر حضرت عثمان کے پاس پہنچے جو ان کے دودھ شریک بھائی تھے۔ وہ ان کو چھپا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے اور کہا کہ ان کو دوبارہ مسلمان کر لیجئے۔ آپ خاموش رہے۔ حضرت عثمان نے پھر درخواست کی تو آپ نے ان سے بیعت لے لی۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان کے زمانۂ خلافت میں وہ مصر کے حاکم رہے اور افریقہ کی فتح میں ان کا خاص حصہ تھا۔

۲۔ عبداللہ بن خطل: اس نے پہلے اسلام قبول کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صدقہ وصول کرنے کے لئے بھیجا۔ اس کے ساتھ ایک غلام اور ایک انصاری تھے۔ ایک منزل پر پہنچ کر عبداللہ بن خطل نے اپنے غلام سے کہا کہ مرغ ذبح کرکے اس کو پکاؤ۔ مگر غلام سو گیا۔ اور وقت پر کھانا تیار نہ کر سکا۔ اس پر ابن خطل کو غصہ آگیا اور اس نے غلام کو مار ڈالا۔ اب اس کو ڈر ہوا کہ اگر میں مدینہ واپس جاتا ہوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے قصاص لیں گے۔ چنانچہ وہ مرتد ہو کر مکہ چلا گیا اور مشرکین سے مل گیا۔ وہ شاعر تھا اور آپ کی ہجو میں اشعار کہا کرتا تھا۔ فتح مکہ کے دن ابن خطل خانہ کعبہ کے پردوں سے لپٹ گیا۔ آپ کو بتایا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہیں جاکر قتل کردو۔ چنانچہ ابو برزہ اسلمی اور سعید بن حریث نے حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان اس کو قتل کیا۔

۳۔ فَرتنیٰ: یہ مذکورہ عبداللہ بن خطل کی باندی تھی۔ وہ آپ کی ہجو میں اشعار پڑھتی تھی اور مشرکین مکہ کی شراب کی مجلسوں میں گاتی بجاتی تھی۔ آپ نے ابن خطل کے ساتھ اس کے قتل کا بھی حکم دیا اور وہ قتل کردی گئی۔

۴۔ قُریبہ: یہ بھی عبداللہ بن خطل کی باندی تھی اور اس کا بھی وہی پیشہ تھا جو فَرتنیٰ کا تھا۔ آپ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ مگر اس نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر امن کی درخواست کی۔ اس کو آپ نے امن دے دیا اور وہ مسلمان ہو گئی۔

۵۔ حویرث بن نُقیذ بن وہب: یہ شخص شاعر تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں شعر کہتا تھا،

بالفاظ دیگر استہزاء و تمسخر کی حد تک اسلام کا مخالف تھا۔ حضرت عباس بن مطلب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں، فاطمہ اور ام کلثوم کو لے کر مکہ سے مدینہ روانہ ہوئے۔ حویرث بن نقیذ نے ان کا پیچھا کیا اور ان کے اونٹ کو نیزہ مار کر بھڑکا دیا جس کی وجہ سے دونوں خواتین زمین پر گر پڑیں۔ آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا اور حضرت علی نے اس کو قتل کر دیا۔

۶۔ مقیس بن صبابہ: اس شخص کا ایک بھائی ہشام بن صبابہ تھا۔ غزوہ ذی قرد کے موقع پر ایک انصاری نے ہشام کو غلطی سے قتل کر دیا۔ اس کے بعد مقیس بن صبابہ مکہ سے مدینہ آیا اور مسلمان ہوگیا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میرے بھائی کی دیت مجھے دلائی جائے جو غلطی سے دشمن سمجھ کر قتل کیا گیا ہے۔ آپ نے اس کی دیت ادا کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد وہ چند دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہا اور پھر اپنے بھائی کے قاتل کو قتل کر کے اچانک مکہ بھاگ گیا اور مرتد ہوگیا۔ آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا اور نُمیلہ بن عبداللہ لیثی نے اس کو قتل کیا۔

۷۔ سارہ: یہ عورت عکرمہ بن ابی جہل کی باندی تھی۔ آپ کی ہجو میں اشعار گایا کرتی تھی اور آپ کا مذاق اڑاتی تھی۔ آپ نے اس کا خون مباح کیا تھا۔ پھر اس نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر امن مانگا تو آپ نے امن دے دیا۔ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ وہ حضرت عمر رض کے زمانہ خلافت تک زندہ رہی۔

۸۔ ۹ حرث بن ہشام اور زہیر بن ابی امیہ: ان دونوں شخصوں کا خون بھی مباح کر دیا گیا تھا۔ وہ بھاگ کر اپنی ایک رشتہ دار خاتون ام ہانی بنت ابی طالب کے گھر میں داخل ہو گئے۔ حضرت علی ان کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں پہنچے اور کہا کہ خدا کی قسم میں ان دونوں کو ضرور قتل کروں گا۔ ام ہانی نے حضرت علی کو روکا اور ان دونوں کو اپنے گھر میں بند کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچیں۔ اور کہا کہ میں نے ان دونوں آدمیوں کو پناہ دی ہے مگر علی ان کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تم نے جن کو پناہ دی ہم نے بھی ان کو پناہ دی اور تم نے جن کو امن دیا ہم نے بھی ان کو امن دیا۔ علی رض ان کو قتل نہ کریں۔ چنانچہ وہ دونوں چھوڑ دئے گئے۔

۱۰۔ عکرمہ بن ابی جہل: عکرمہ اپنے باپ کی طرح اسلام کے سخت ترین دشمن تھے۔ ان کا خون بھی آپ نے مباح کر دیا تھا۔ وہ مکہ سے بھاگ کر یمن چلے گئے۔ ان کی بیوی ام حکیم بنت حارث جو مسلمان ہو چکی تھیں۔ انھوں نے اپنے شوہر کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے امان کی درخواست کی۔ آپ نے ان کی امان منظور کر لی۔ اس کے بعد وہ یمن گئیں اور عکرمہ کو مکہ واپس لائیں۔ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گئے۔ عکرمہ نے اس کے بعد اسلام کے لئے زبردست جانی و مالی قربانی دی۔ وہ حضرت ابوبکر کی خلافت کے زمانہ میں مرتدین سے لڑتے ہوئے اجنادین کے مقام پر شہید ہوئے۔

۱۱۔ ہبار بن الاسود: اس شخص سے مسلمانوں کو بہت تکلیفیں پہنچی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی زینب زوجہ ابو العاص ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ جا رہی تھیں۔ ہبار بن اسود نے آپ کے اونٹ کو

نیزہ مارا۔ اس کے بعد اونٹ بدک کر دوڑا تو حضرت زینب اونٹ سے زمین پر گر پڑیں۔ اس وقت وہ حاملہ تھیں۔ ان کا حمل ساقط ہوگیا۔ اس کے بعد وہ آخر عمر تک بیمار رہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہبار کے قتل کا حکم دیا تھا۔ ہبار نے آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر امان طلب کی اور کہا کہ اے خدا کے رسول میری جہالت کو معاف کر دیجئے اور میرا اسلام قبول کر لیجئے۔ آپ نے ان کو معاف کر دیا۔

۱۲۔ وحشی بن حرب: وحشی نے آپ کے چچا حضرت حمزہ کو قتل کیا تھا اور ان کا خون بھی مباح کر دیا گیا تھا۔ وہ اولاً مکہ سے طائف بھاگ گئے۔ پھر مدینہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی غلطی کی معافی چاہتے ہوئے اسلام کی پیش کش کی۔ آپ نے ان کو اسلام میں داخل کر لیا اور ان کو معاف کر دیا۔ وہ حضرت ابوبکر کے زمانہ میں مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے اور جس حربہ سے حضرت حمزہ کو شہید کیا تھا اسی حربہ سے مسیلمہ کذاب کو قتل کیا۔

۱۳۔ کعب بن زہیر: عرب کے مشہور شاعر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں اشعار کہا کرتے تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر ان کا خون بھی مباح کر دیا گیا۔ وہ مکہ سے بھاگ گئے۔ وہ بعد کو مدینہ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگتے ہوئے بیعت کی درخواست کی۔ آپ نے ان کو بیعت کر لیا اور اس کے بعد ان کو اپنی چادر عنایت فرمائی۔

۱۴۔ حارث بن طلاطل: یہ شخص شاعر تھا اور اشعار کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ آپ نے اس کا خون مباح کر دیا اور حضرت علی رضہ نے اس کو قتل کیا۔

۱۵۔ عبداللہ بن زبعری: یہ عرب کے بڑے شاعروں میں سے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذمت میں ہجویہ اشعار کہا کرتے تھے۔ آپ نے ان کے قتل کا حکم دے دیا۔ وہ مکہ سے بھاگ کر نجران چلے گئے۔ بعد میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر انھوں نے توبہ کی اور اسلام لائے۔ آپ نے ان کو معاف کر دیا۔

۱۶۔ ہبیرہ بن ابی وہب مخزومی: یہ شخص شاعر تھا اور شعر کہہ کر آپ کا اور آپ کے مشن کا استہزا کیا کرتا تھا۔ آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا۔ وہ مکہ سے بھاگ کر نجران چلا گیا اور وہیں کفر کی حالت میں مرگیا۔

۱۷۔ ہند بنت عتبہ زوجہ ابوسفیان: اس عرب خاتون کو اسلام سے اتنی دشمنی تھی کہ غزوہ احد کے موقع پر انھوں نے حضرت حمزہ کا جگر نکال کر چبایا تھا۔ آپ نے ان کے قتل کا حکم دیا۔ مگر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔ آپ نے ان کو معاف کر دیا۔ اس کے بعد وہ اپنے گھر گئیں اور تمام بتوں کو توڑ ڈالا اور کہا: خدا کی قسم تمھاری ہی وجہ سے ہم دھوکہ میں تھے۔

اوپر جو تفصیل درج کی گئی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد سترہ مردوں اور عورتوں کے قتل کا حکم دیا تھا۔ ان میں سے ہر شخص متعین اور معلوم شخصی جرم کی بنا پر گردن زدنی تھا تاہم ان میں سے جس شخص نے بھی معافی مانگی یا اس کی طرف سے کسی نے معافی کی درخواست کی اس کو آپ نے معاف کر دیا۔

معافی طلب کرنے والوں میں سے کسی کو بھی قتل نہیں کیا گیا۔ سترہ آدمیوں کا خون مباح کیا گیا تھا، ان میں سے گیارہ آدمیوں کو براہ راست یا بالواسطہ معافی طلب کرنے پر معاف کر دیا گیا۔ پانچ آدمی جنھوں نے معافی کی درخواست نہیں کی وہ قتل کر دئے گئے اور ایک آدمی مکہ سے دور بھاگ گیا اور طبعی موت سے اس کا خاتمہ ہوا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بنو مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی جس کا نام فاطمہ تھا۔ اس کے قبیلہ والوں کو ڈر ہوا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ اسامہ بن زید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت قریبی لوگوں میں تھے۔ چنانچہ لوگوں نے اسامہ سے کہا کہ تم رسول اللہ علیہ وسلم سے سفارش کرو کہ ہماری عورت کو چھوڑ دیا جائے۔ حضرت اسامہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور فاطمہ مخزومی کی معافی کی درخواست کی۔ یہ سن کر آپ کا چہرہ متغیر ہو گیا، آپ نے فرمایا: کیا تم اللہ کی حدوں میں سے ایک حد کے لئے مجھ سے سفارش کر رہے ہو (اتکلمنی فی حد من حدود اللہ) اس کے بعد آپ نے لوگوں کو جمع کیا اور تقریر کرتے ہوئے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر میری لڑکی فاطمہ چوری کرتی تو یقیناً میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا (والذی نفس محمد بیدہ لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا) چنانچہ اس عورت کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ اس کے بعد وہ تائب ہو کر ایک صالح خاتون بن گئی (بخاری ومسلم)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی ایک حد کو معاف کرنے کا اختیار کسی کو نہیں ہے۔ پھر کیوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد لوگوں کو اتنی فراخ دلی کے ساتھ معاف کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام حالت میں کئے جانے والے جرم اور جنگی حالت میں کئے جانے والے جرم میں فرق ہے۔ عام حالات میں کوئی شخص جرم کرے تو اس کا جرم معاف نہیں کیا جا سکتا۔ مگر جنگ ومقابلہ کے دوران دشمن گروہ کے افراد جو جرائم کرتے ہیں وہ اس وقت معاف کر دئے جاتے ہیں جب کہ مذکورہ فرد اطاعت قبول کر کے معافی کا طالب ہو۔ غیر جنگی حالات میں کیا ہوا جرم "حد" پر ختم ہوتا ہے اور جنگی حالات میں کیا ہوا جرم اطاعت اور درخواست معافی پر۔ عرب میں اسلام دشمنوں نے مسلمانوں کے خلاف بدترین قسم کے جرائم کئے تھے۔ مگر اعلان کیا گیا کہ یہ کفر کرنے والے لوگ اگر باز آجائیں تو اب تک جو کچھ ہو چکا ہے وہ معاف کر دیا جائے گا (انفال ۳۸) حکم ہوا کہ دشمن اگر صلح کی درخواست کرے تو قبول کر لو، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ صلح کے بعد اس کی طرف سے خیانت کا اندیشہ ہو:

وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله انه هو السميع العليم ۔ وان يريدوا ان يخدعوك فان حسبك الله هو الذی ايدك بنصره وبالمومنين (انفال ۶۲ — ۶۱)	اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اس طرف جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ تم کو دھوکا دینا چاہیں تو اللہ تمھارے لئے کافی ہے، وہی ہے جس نے اپنی نصرت سے اور مومنین کے ذریعہ تم کو قوت دی۔

جن مباح الدم افراد کو اس موقع پر معافی دی گئی ان میں سے ایک عکرمہ بن ابی جہل تھے۔ وہ اپنے والد کے ساتھ اسلام دشمنی میں بے حد سرگرم رہ چکے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر طرح کی تکلیفیں پہنچائی تھیں مگر جب معلوم ہوا کہ وہ آپ کے پاس مطیع ہو کر آرہے ہیں تو آپ نے اپنے اصحاب سے کہا:

یاتیکم عکرمۃ مومنا فلا تسبوا اباہ فان سبّ المیت یوذی الحی

عکرمہ بن ابی جہل مومن ہو کر تمھارے پاس آرہے ہیں تو ان کے باپ کو تم لوگ برا نہ کہنا۔ مردہ کو برا کہنے سے زندہ کو تکلیف ہوتی ہے۔

یہی وہ فراخ دلی اور وسعت ظرفی تھی کہ عرب میں اچانک یہ منظر نظر آیا کہ فتح مکہ سے پہلے جو لوگ اسلام کے سخت ترین دشمن بنے ہوئے تھے وہ فتح کے بعد اسلام کے زبردست حامی اور پاسبان بن گئے۔

حصّه سوم

ختم نبوت

بعثت کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے۔ کسی عرب قبیلہ کا ایک شخص کعبہ کی زیارت کے لئے مکہ آیا۔ وہ جب واپس گیا تو اس کے قبیلہ والوں نے پوچھا، مکہ کی کوئی خبر بتاؤ۔ اس نے جواب دیا:

محمد تنبأ و تبعه ابن ابی قحافة

محمدؐ نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور ابوقحافہ کا لڑکا ان کا ساتھ دے رہا ہے

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۶۱۰ء میں جب آپ نے نبوت کا اعلان فرمایا اس وقت لوگوں کے ذہن میں آپ کی تصویر کیا تھی۔ آپ کے مخالفین اس زمانہ میں آپ کو ابن ابی کبشہ کہتے تھے، جس کا مطلب ہوتا تھا: فلاں دیہاتی کا لڑکا۔ کوئی زیادہ شریف زبان بولنا چاہتا تو کہتا: فتی من قریش، یعنی قبیلہ قریش کا ایک جوان۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال اپنے زمانہ میں تھا۔ مگر صدیاں گزرنے کے بعد اب صورت حال بالکل مختلف ہے۔ کیوں کہ اب آپ کی نبوت کوئی نزاعی مسئلہ نہیں۔ اب وہ ایک تسلیم شدہ واقعہ (Established Facts) کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ آج جب ایک شخص کہتا ہے "محمد رسول اللہ" تو اس کے ذہن میں ایک ایسے پیغمبر کا تصور ہوتا ہے جس کے گرد ایک عظیم الشان تاریخ بن چکی ہے، جس کی پشت پر ڈیڑھ ہزار برس کی تصدیقی عظمتیں قائم ہیں۔ اگر ایسا ہو کہ یہ تاریخ مکمل طور پر آپ سے الگ کر دی جائے اور نبی عربی دوبارہ "ابن ابی کبشہ" کی صورت میں ظاہر ہوں تو اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ آپ پر ایمان لانے والوں کی تعداد جو آج کروروں میں گنی جاتی ہے، صرف درجنوں تک محدود ہو کر رہ جائے گی — "ابن ابی کبشہ" کے حلیہ میں رسول خدا کو پہچان لینا انتہائی مشکل کام ہے۔ جب کہ یہی کام اس وقت انتہائی آسان ہو جاتا ہے جب رسول ایک مسلّمہ تاریخی حیثیت یا قرآن کے لفظوں میں مقام محمود (اسراء — ۷۹) کا درجہ حاصل کر چکا ہو۔

پچھلے ادوار میں نبیوں کے ہم زمانہ لوگوں کے لئے نبی کا انکار کرنے کی سب سے بڑی نفسیاتی وجہ یہی تھی — "یہ تو وہی معمولی شخص ہے جس کو اب تک ہم فلاں بن فلاں کے نام سے جانتے تھے، وہ اچانک خدا کا پیغمبر کیسے ہو گیا"۔ جب بھی کوئی نبی اٹھتا، یہ خیال ایک قسم کا شک اور تردد بن کر ان کے اوپر چھا جاتا، اور نبی کی پیغمبرانہ حیثیت کو پہچاننے کے معاملہ کو اس کے معاصرین کے لئے مشکل بنا دیتا۔

یہ صورت حال، خاتم النبین کے ظہور سے پہلے، انسانیت کو مسلسل ایک کڑی آزمائش میں مبتلا کئے ہوئے تھی۔ ہر بار ان کے اندر سے ایک نیا شخص خدا کے رسول کی حیثیت سے اٹھتا۔ مخاطب قوم کی اکثریت، مذکورہ نفسیاتی رکاوٹ کی وجہ سے، اپنے ہم عصر نبی کے بارے میں شک اور تردد میں پڑ کر انکار کر دیتی اور بالآخر سنت اللہ کے مطابق ہلاک کر دی جاتی۔

اب اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک ایسا نبی بھیجے جو ساری دنیا کے لئے رحمت کا دروازہ کھول دے۔ اس کی ذات پچھلے پیغمبروں کی طرح لوگوں کو اس آزمائش میں نہ ڈالے کہ "معلوم نہیں یہ واقعی پیغمبر ہے یا شخصی حوصلہ مندی نے اس کو اس قسم کے دعوے پر آمادہ کر دیا ہے۔" اس کی نبوت ہر دور کے لوگوں کے لئے ایک مسلّمہ واقعہ کی حیثیت رکھتی ہو۔ لوگ کسی نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا ہوئے بغیر اس کی "محمودیت" کی وجہ سے اس کو پہچان لیں اور اس پر ایمان لا کر خدا کی رحمتوں میں حصہ دار بنیں۔

متعدد روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے افراد تمام دوسرے انبیاء کی امتوں سے زیادہ ہوں گے۔ اس کا تعلق بھی اسی مسئلہ سے ہے۔ آپ کے بعد چونکہ کوئی نبی آنے والا نہیں۔ اس لئے آپ کی امت میں آپ کے بعد دوبارہ کفر و اسلام کا مسئلہ کھڑا ہونے والا نہیں ہے۔ آپ کی امت بدستور بڑھتی رہے گی، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

اس معاملہ کو بنی اسرائیل کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ حضرت مسیح کے زمانہ میں جو یہود تھے، وہ سب خدا کی شریعت پر ایمان رکھتے تھے، وہ حضرت موسیٰ کے امتی تھے۔ مگر ابن مریم کی صورت میں جب ان کے اندر ایک نیا نبی اٹھا تو اس کو ماننا یہود کے لئے ممکن نہ ہو سکا۔ حضرت موسیٰ کو وہ اب بھی مانتے تھے۔ مگر اپنے ہم عصر نبی کا انکار کر رہے تھے۔ اس کی وجہ سے، ایک درجن مومنین مسیح کو چھوڑ کر، سارے کے سارے یہودی کافر قرار پا گئے۔ حضرت مسیح کے چھ سو برس بعد جب نبی عربی کی بعثت ہوئی تو مسلمانوں کی اس نئی جماعت (عیسائیوں) کی تعداد بہت بڑھ چکی تھی۔ مگر دوبارہ وہی ہوا کہ نئے "اسماعیلی نبی" کو ماننے کے لئے وہ اپنے کو آمادہ نہ کر سکے۔ وہ تاریخی نبی (حضرت مسیحؑ) پر بدستور ایمان رکھتے تھے۔ مگر اپنے ہم عصر نبی (حضرت محمدؐ) کے منکر تھے۔ اس کی وجہ سے دوبارہ ایسا ہوا کہ نبوت محمدی پر ایمان لانے والے چند عیسائیوں کو چھوڑ کر پوری عیسائی قوم کو کافر قرار دے دیا گیا۔

ختم نبوت کی وجہ سے امت محمدی میں اس قسم کی چھٹنی، کم از کم موجودہ دنیا میں، دوبارہ ہونے والی نہیں۔ اس لئے آپ کے امتیوں کی تعداد بھی دوسرے انبیاء کے پیروؤں سے زیادہ رہے گی —— یہ بھی ایک پہلو ہے آپ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا جو اس لئے حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مقام محمود پر کھڑا کیا۔ مقام محمود دنیوی اعتبار سے یہ ہے کہ آپ کی نبوت کو ساری دنیا کے لئے ایک تاریخی مسلّمہ بنا دیا گیا۔ یہی تعریفی حیثیت قیامت کے دن خصوصی خداوندی اعزاز کی صورت میں ظاہر ہوگی جو اولین و آخرین میں آپ کے سوا کسی کو حاصل نہ ہوگی۔

مگر کسی نبی کو مقام محمود پر کھڑا کرنا سادہ طور پر محض نامزدگی کا معاملہ نہ تھا۔ یہ ایک نئی تاریخ کو ظہور میں لانے کا

معاملہ تھا۔ اس کے لئے ایک طرف ایسی معیاری شخصیت درکار تھی جیسی کوئی دوسری شخصیت بنی آدم میں پیدا نہ ہوئی ہو دوسری طرف ایسی قربانی اور حوالگی درکار تھی جیسی قربانی و حوالگی کا ثبوت کسی دوسرے انسان نے نہ دیا ہو۔ یہی وہ نازک لمحہ تھا جب کہ خدا نے اپنے ایک بندے کو پکار کر کہا: یَا اَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ ۔ ۔ ۔ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ، اور کمل میں لپٹی ہوئی اس عظیم روح نے لبیک کہہ کر اپنے آپ کو ہمہ تن خدائی منصوبہ کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد طویل عمل کے نتیجہ میں بالآخر وہ نبوت ظہور میں آئی جو سارے عالم کے لئے رحمت بن گئی۔ جس نے انسانی تاریخ میں بار بار نئے نبیوں کی آمد کے آزمائشی دور کو ختم کیا اور ایک مسلّمہ نبوت کے دور کا آغاز کر کے لوگوں کے لئے خدا کی رحمتوں میں فوج در فوج داخل ہونے کا دروازہ کھول دیا۔

نبوت کو تاریخی مسلّمہ بنانے کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ آئندہ کے لئے نبیوں کی آمد کا سلسلہ بند ہو جائے۔ مگر یہ بھی محض اعلان کا معاملہ نہ تھا۔ ختم نبوت سے پہلے ضروری تھا کہ چند شرائط لازمی طور پر پوری ہو چکی ہوں:

۱۔ زندگی کے تمام معاملات کے لئے احکام خداوندی کا نزول (وَهُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ اِلَیْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا)

۲۔ انسانی کردار کے لئے ایک کامل نمونہ سامنے آجانا (لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ)

۳۔ وحی الٰہی کی دائمی حفاظت کا انتظام (نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ)

اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک فیصلہ کے ذریعہ ان تینوں شرائط کی تکمیل کا انتظام فرما دیا۔

پچھلے نبیوں کے لئے اللہ کی سنّت یہ رہی ہے کہ ہر نبی کو کچھ آیات (معجزے) دیئے جاتے تھے۔ نبی اپنی مخاطب قوم میں تبلیغ و دعوت کا فریضہ آخری حد تک ادا کرتا۔ وہ غیر معمولی نشانیوں کے ذریعہ اپنے نمائندہ الٰہی ہونے کا ثبوت پیش کرتا۔ اس کے باوجود جب لوگ ایمان نہ لاتے تو نبی کا کام ختم ہو جاتا۔ اب اللہ تعالیٰ کے فرشتے متحرک ہوتے اور زمینی یا آسمانی عذاب کے ذریعہ اس قوم کو ہلاک کر دیتے۔

نبی آخر الزماں کے لئے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہوا کہ آپ کی مخاطب قوم کے لئے اس قسم کا عذاب نہیں آئے گا۔ بلکہ خود نبی اور آپ کے اصحاب کو ان سے ٹکرا کر انھیں مجبور کیا جائے گا کہ وہ دین خداوندی کو قبول کریں (تقاتلونهم او یسلمون) اس کے باوجود ان میں سے جو لوگ اطاعت نہ کریں وہ اہل ایمان کی تلواروں سے قتل کر دیئے جائیں (قَاتِلُوْهُمْ یُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَیْدِیْكُمْ) دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس سے پہلے جو کام فرشتے کرتے تھے، اس کو انسانوں کے ذریعہ انجام دیا جائے۔

اسی فیصلۂ الٰہی کا نتیجہ تھا کہ ہجرت اور اتمام حجت کے بعد، دیگر انبیاء کی قوموں کے برعکس، اہل عرب پر کوئی جوالا مکھی پہاڑ نہیں پھٹا اور نہ آسمان سے آگ برسی۔ بلکہ رسول اور اصحاب رسول کو ان کے ساتھ ٹکرا دیا گیا۔ اس فوجی تصادم میں اللہ کی خصوصی نصرت کے ذریعہ رسول اور آپ کے اصحاب کو فتح حاصل ہوئی۔ خدا کا دین ایک باقاعدہ اسٹیٹ کی شکل میں جزیرہ نمائے عرب پر قائم ہو گیا۔

اس واقعہ کے مختلف نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ تھا کہ دعوت نبوت کو، انفرادی تقاضوں سے لے کر اجتماعی معاملات تک، زندگی کے تمام مراحل سے گزرنا پڑا اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے لئے مسلسل احکام اترتے رہے۔ اگر یہ واقعات پیش نہ آتے تو اسلامی شریعت میں ہر قسم کے احکام نہیں اتر سکتے تھے۔ کیونکہ اللہ کی یہ سنت ہے کہ وہ حالات کے لحاظ سے اپنے احکام بھیجتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ کتابی مجموعہ کی شکل میں بیک وقت سارے احکام لکھ کر نبی کو دے دیئے جائیں۔ فرشتوں کے ذریعے منکرین عرب کا استیصال کرنے کے بجائے اہل ایمان کی تلوار کے ذریعہ ان کو زیر کرنے کے فیصلے نے شریعت کی تکمیل کے اسباب پیدا کر دیئے۔

پھر اسی کی وجہ سے یہ امکان پیدا ہوا کہ پیغمبر کا سابقہ زندگی کی تمام صورتوں سے پیش آئے۔ اور ہر قسم کی سرگرمیوں میں وہ اسلامی کردار کا عملی نمونہ دکھا سکے۔ اس کے بعد خود حالات کے ارتقار کے تحت ایسا ہوا کہ نبی کو مسجد اور مکان سے لے کر میدان جنگ اور تخت حکومت تک ہر جگہ کھڑا ہونا پڑا اور ہر جگہ اس نے معیاری انسانی کردار کا مظاہرہ کر کے قیامت تک کے لوگوں کے لئے نمونہ قائم کر دیا۔

پھر اسی واقعہ نے قرآن کی حفاظت کی صورتیں بھی پیدا کیں۔ پچھلی آسمانی کتابیں جو محفوظ نہ رہ سکیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ نبی کے بعد ان کتابوں کی پشت پر کوئی ایسی طاقت نہ رہی جو بزور ان کو ضائع ہونے سے بچاتی۔ پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب نے اپنی ہم عصر قوموں سے مقابلہ کر کے اولاً عرب اور اس کے بعد قدیم دنیا کے بڑے حصہ پر اسلام کا غلبہ قائم کر دیا۔ اس طرح کتاب الٰہی کو حکومتی اقتدار کا سایہ حاصل ہو گیا جو خدا کی کتاب کو محفوظ رکھنے کی یقینی ضمانت تھا۔ یہ انتظام اتنا طاقت ور تھا کہ ایک ہزار برس تک اس میں کوئی فرق نہ آسکا۔ اسلامی اقتدار کے زیر سایہ قرآن ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا رہا۔ یہاں تک کہ صنعتی انقلاب ہوا اور پریس کا دور آگیا جس کے بعد قرآن کے ضائع ہونے کا کوئی سوال نہیں۔

یہ سب جو ہوا، اس طرح ٹھنڈے ٹھنڈے نہیں ہو گیا جیسے آج ہم اس کو سیرت و تاریخ کی کتابوں میں پڑھ لیتے ہیں۔ اس کے لئے نبی اور آپ کے ساتھیوں کو ناقابل برداشت طوفان سے گزرنا پڑا۔ کفار کے مطالبہ اور نبی کی خواہش کے باوجود ان کو فوق الفطری معجزے نہیں دیئے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں اپنے اخلاق و کردار کو معجزاتی واقعات کا بدل بنانا پڑا۔ ان کے مکذبین کے لئے کوئی ارضی و سماوی عذاب نہیں آیا۔ اس طرح انھیں وہ کام کرنا پڑا جس کے لئے پہلے بھونچال آتے تھے اور آتش فشاں پھٹتے تھے۔ ختم نبوت کے فیصلہ کے باوجود کتاب الٰہی کو یکبارگی ان کے حوالے نہیں کیا گیا۔ اس لئے ان کے واسطے ضروری ہو گیا کہ وہ زندگی کے وسیع سمندروں میں کود یں اور ہر قسم کی چٹانوں سے ٹکرائیں تاکہ تمام معاملات زندگی کے بارے میں ان پر احکام الٰہی کا نزول ہو سکے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس پورے عمل کے دوران نبیؐ اور آپ کے اصحاب امتحان کے اس انتہائی کڑے معیار پر تھے جس کو قرآن میں زلزال شدید (احزاب۔ ۱۱) کہا گیا ہے۔ نبیؐ کو سخت ترین حکم تھا کہ ظالموں کی طرف ادنیٰ جھکاؤ بھی مت دکھاؤ

(اسراء۔ ۷۵) ورنہ تم کو دگنی سزا دی جائے گی۔ حالات خواہ کتنے ہی شدید ہوں، آپ کے ساتھیوں کے لئے کسی بھی حال میں تخلف (توبہ۔ ۱۱۹) کی اجازت نہ تھی۔ آپ کی ازواج اگر دو وقت کی روٹی کا بھی مطالبہ کریں تو ان کے لئے یہ صاف جواب تھا کہ۔ پیغمبر کی صحبت اور دنیا میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کر لو (احزاب۔ ۲۸)

حقیقت یہ ہے کہ نبوتِ محمودی کو بردئے کار لانا انسانی تاریخ کا مشکل ترین منصوبہ تھا۔ اور یہ سب کچھ اتنی قیامت خیز سطح پر ہوا کہ خود رسول کی زبان سے نکلا کہ "اس راہ میں مجھ کو اتنا ستایا گیا جتنا کسی دوسرے نبی کو نہیں ستایا گیا"۔ آپ کی رفیقۂ حیات نے شہادت دی کہ لوگوں نے آپ کو روند ڈالا تھا (۔۔۔ حطمہ الناس) خاتم النبین اور آپ کے ساتھیوں نے دنیا کا آرام تو درکنار زندگی کی ناگزیر ضرورتوں سے بھی اپنے کو محروم کر لیا، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکا کہ تاریخ میں اس نبوت کا دور شروع ہو جس کو رحمۃ للعالمین کہا گیا ہے۔

نبیؐ عربی کا آپ کے بعد آنے والی نسلوں پر یہی وہ احسان عظیم ہے جس کی وجہ سے دائمی طور پر آپ پر صلوٰۃ و سلام بھیجنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تاریخ کے اس مشکل ترین مشن میں چونکہ آپ کے اہل خاندان نے آپ کے ساتھ مکمل تعاون کیا اور آپ کے اصحاب اس صبر آزما جدوجہد میں پوری طرح صادق القول اور صابر العمل ثابت ہوئے، اس لئے رسولؐ کے ساتھ آپ کے آل اور آپ کے اصحاب کے لئے بھی رحمت اور سلام بھیجنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جب کوئی شخص کسی کے اوپر احسان کرے تو انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس پر شکر کا اظہار کیا جائے۔ درود و سلام اسی قسم کے ایک عظیم ترین احسان کا دعائی شکل میں اعتراف ہے۔ حدیث میں ہے: البخیلُ مَن ذُکرتُ عندہ فلم یُصلِّ عَلَیَّ (نسائی، ترمذی)

اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلیٰ آلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَسَلَّم

آپ کا معجزہ ـــــ قرآن

ہر پیغمبر کا ایک معجزہ ہوتا ہے اور پیغمبر آخرالزماں کا معجزہ قرآن ہے۔ جو پیغمبر قیامت تک کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا، اس کا معجزہ کوئی ابدی معجزہ ہی ہو سکتا تھا۔ خدا نے قرآن کو پیغمبر آخرالزماں کا ابدی معجزہ بنا دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین نے مسلسل مطالبہ کیا کہ پچھلے نبیوں کی طرح تم بھی کوئی معجزہ دکھاؤ۔ قرآن میں صاف اعلان کر دیا گیا کہ اس نبی کے لئے پچھلے نبیوں جیسا کوئی معجزہ نہیں بھیجا جائے گا (بنی اسرائیل ۵۹) حتیٰ کہ قرآن میں کہا گیا کہ اے رسول اگر تجھ پر ان کا اعراض گراں گزرتا ہے (اور تم ان کے لئے کوئی معجزہ چاہتے ہو) تو اگر تم سے ہو سکے تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈو یا کوئی سیڑھی آسمان میں لگاؤ اور پھر ایک معجزہ لاکر انھیں دکھاؤ ــــ اگر اللہ چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ پس تم نادانوں میں سے نہ بنو (الانعام ۳۵)

اس کے برعکس کہا گیا کہ یہ قرآن جو آتارا گیا، یہی خدا کی طرف سے معجزہ ہے:

وقالوا لولا انزل علیہ آیت من ربہ قل انما الآیات عند اللہ وانما انا نذیر مبین ـ اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتاب یتلیٰ علیھم ان فی ذلک لرحمۃ وذکری لقوم یومنون (العنکبوت ۵۱ ـ ۵۰)	اور وہ کہتے ہیں کہ اس رسول پر نشانیاں کیوں نہ اتریں۔ کہو کہ نشانیاں تو اللہ کے اختیار میں ہیں۔ اور میں تو بس کھول کر سنا دینے والا ہوں۔ کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تمھارے اوپر قرآن اتارا جو ان پر پڑھا جاتا ہے۔ بے شک اس میں رحمت اور نصیحت ہے ان لوگوں کے لئے جو ماننے والے ہیں۔

قرآن کے معجزہ ہونے کے بہت سے پہلو ہیں۔ یہاں ہم خاص طور پر اس کے تین پہلوؤں کا ذکر کریں

گے (۱) عام لسانی تاریخ کے علی الرغم قرآنی زبان کا زندہ زبان کی حیثیت سے باقی رہنا۔(۲) مذہبی کتابوں کی تاریخ میں قرآن کا یہ استثنار کہ اس کے متن میں کسی قسم کا کوئی فرق نہ ہو سکا۔ (۳) قرآن کے چیلنج کے باوجود کسی کے لیے یہ ممکن نہ ہوناکہ وہ قرآن کے جواب میں قرآن جیسی ایک کتاب لکھ سکے۔

جتنی بھی قدیم کتابیں آج دنیا میں پائی جاتی ہیں، ان میں قرآن ایک حیرت انگیز استثنار ہے، تمام مقدس کتابوں کی اصل زبانیں تاریخ کی الماری میں بند ہو چکی ہیں۔ مگر قرآن کی زبان (عربی) آج بھی بدستور زندہ ہے۔ آج بھی کروڑوں انسان اس زبان کو لکھتے اور بولتے ہیں جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار برس پہلے قرآن اتارا گیا تھا ——— یہ واقعہ قرآن کے معجزاتی کتاب ہونے کا یقینی ثبوت ہے۔ کیونکہ قرآن کے سوا ساری انسانی تاریخ میں کوئی دوسری کتاب نہیں جس نے اپنی اصل زبان کو اس طرح بعد کے زمانوں میں باقی رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہو۔

مثال کے طور پر انجیل کو لیجئے جو قرآن کے بعد سب سے زیادہ قریب العہد مقدس کتاب ہے۔ اس کا حال یہ ہے کہ ابھی تک قطعیت کے ساتھ یہ بھی نہیں معلوم کہ حضرت مسیح کون سی زبان بولتے تھے۔ قیاساً یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی زبان غالباً آرامی تھی۔ تاہم انجیل کی شکل میں آپ کی تعلیمات کا جو بالواسطہ ریکارڈ آج ہمارے پاس ہے اس کا قدیم ترین نسخہ یونانی زبان میں پایا جاتا ہے۔ گویا حضرت مسیح کے خیالات صرف ترجمہ شدہ حالت میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ پھر یہ یونانی زبان بھی قدیم و جدید یونانی سے بالکل مختلف ہے حتیٰ کہ انیسویں صدی کے آخر تک نئے عہدنامہ میں کم از کم ۵۵۰ الفاظ (کل متن کا ۱۲ فی صد) ایسے تھے جن کے معانی معلوم نہ تھے۔ انیسویں صدی میں ایک جرمن عالم اڈولف ڈیزمن (Adolf Deissmann) نے مصر میں بعض قدیم تحریریں پائیں۔ ان کے مطالعہ کے بعد اس نے قیاس کیا کہ "ببلیکل گریک" دراصل قدیم یونانی زبان کی غیر علمی بولی تھی جو پہلی صدی عیسوی میں فلسطین کے عوام میں رائج تھی۔ اس نے مذکورہ نامعلوم الفاظ کے کچھ معانی متعین کیے۔ تاہم اب بھی یونانی انجیل میں ۵۰ الفاظ (کل متن کا ایک فی صد) ایسے ہیں جن کے معانی ابھی تک نامعلوم ہیں۔

Xavier Leon-Dufour S.J., *The Gospels and The Jesus of History* Desclee Co. Inc., New York 1970, pp. 79-80

ارنسٹ رینان (۱۸۹۲ - ۱۸۲۳) نے عربی زبان کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنی کتاب اللغات السامیہ میں لکھا ہے:

> "انسانی تاریخ کا سب سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ عربی زبان ہے۔ یہ زبان قدیم تاریخ میں ایک غیر معروف زبان تھی۔ پھر اچانک وہ ایک کامل زبان کی حیثیت سے ظاہر ہوئی۔ اس کے بعد سے اس میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہ ہو سکی حتیٰ کہ اس کا نہ کوئی بچپن ہے اور نہ بڑھاپا۔ وہ اپنے ظہور کے اول دن جیسی تھی ویسی ہی آج بھی ہے۔"

قرآن کی زبان کے بارے میں فرانسیسی مستشرق کا یہ اعتراف دراصل اعجاز قرآن کا اعتراف ہے۔ کیونکہ حقیقۃً یہ قرآن کا

معجزاتی ادب ہی ہے جس نے عربی زبان کو تبدیلی کے اس عام تاریخی قانون سے مستثنیٰ رکھا جس سے دوسری تمام زبانیں متاثر ہوئی ہیں۔ مسیحی عالم جرجی زیدان (۱۹۱۴-۱۸۶۱) نے اس کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:

وبالجملة فان للقرآن تاثیراً فی آداب اللغة العربیة لیس لکتاب دینی مثلہ فی اللغات الاخری (آداب اللغات العربیہ)	مختصر یہ کہ عربی زبان کے ادب پر قرآن نے ایسا غیر معمولی اثر ڈالا ہے جس کی مثال کسی اور دینی کتاب کی دوسری زبانوں میں نہیں ملتی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام زبانیں تبدیلی کا شکار رہی ہیں۔ حتیٰ کہ کسی زبان کا آج کا ایک عالم اس زبان کی چند سو برس پہلے کی کتاب کو لغت اور شرح کی مدد کے بغیر سمجھ نہیں سکتا۔ اس تبدیلی کے اسباب عام طور پر دو قسم کے رہے ہیں۔ ایک، اجتماعی انقلاب، دوسرے، ادبی ارتقاء۔ عربی زبان کے ساتھ پچھلی صدیوں میں یہ دونوں واقعات اسی شدت کے ساتھ پیش آئے جس طرح کسی دوسری زبان کے ساتھ پیش آسکتے ہیں۔ مگر وہ اس زبان کے لسانی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہ کرسکے۔ عربی زبان اب بھی وہی زبان ہے جو چودہ سو برس پہلے نزول قرآن کے وقت مکہ میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ ہومر (م ۸۵۰ ق م) کی ایلیڈ، تلسی داس (م ۱۶۲۳ء) کی رامائن، اور شیکسپیئر (۱۶۱۶-۱۵۶۴) کے ڈرامے انسانی ادب کا شاہکار سمجھے جاتے ہیں اور زمانۂ تالیف سے لے کر اب تک مسلسل پڑھے جاتے رہے ہیں۔ مگر وہ ان زبانوں کو اپنی ابتدائی شکل میں محفوظ نہ رکھ سکے جن میں وہ لکھے گئے تھے۔ ان کی زبانیں اب کلاسیکی زبانیں ہیں نہ کہ زندہ زبانیں۔ زبانوں کی تاریخ میں قرآن واحد مثال ہے جو مختلف قسم کے علمی اور سیاسی انقلابات کے باوجود اپنی زبان کو مسلسل اسی حالت پر باقی رکھے ہوئے ہے جس حالت پر وہ نزول قرآن کے وقت تھی۔ انسانی سماج کی کوئی بھی تبدیلی اُس میں تبدیلی کا باعث نہ بن سکی۔ یہ واقعہ قرآن کے ایک برتر کلام ہونے کا یقینی ثبوت ہے۔ پچھلے ڈیڑھ ہزار برس کی تاریخ نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ قرآن ایک معجزہ ہے، اس کے بعد اعجاز قرآن کے لئے مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔

اجتماعی انقلابات

اجتماعی انقلابات کس طرح زبانوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، اس کو سمجھنے کے لئے لاطینی کی مثال لیجئے۔ لاطینی کا مرکز بعد کے دور میں اگرچہ اٹلی بنا، مگر اصلاً یہ زبان اٹلی کی پیداوار نہ تھی۔ تقریباً ۱۲ سو قبل مسیح، لوہے کا زمانہ آنے کے بعد، جب وسط یورپ کے قبائل اطراف کے علاقوں میں پھیلے تو ان کی ایک تعداد، خاص طور پر کوہ الپ کے قبائل اٹلی میں داخل ہوئے اور روم اور اس کے آس پاس آباد ہوئے۔ ان کی بولی اور مقامی بولی کے ملنے سے جو زبان بنی وہی ابتدائی لاطینی زبان تھی۔ تیسری صدی قبل مسیح میں لیویس اینڈرونیکس نے یونانی زبان کے کچھ ڈراموں اور کہانیوں کا ترجمہ لاطینی میں کیا۔ اس طرح لاطینی زبان ادبی زبان کے دور میں داخل ہوئی۔ پہلی صدی قبل مسیح میں رومی سلطنت قائم ہوئی تو اس نے لاطینی کو اپنی سرکاری زبان بنایا، مسیحیت کے پھیلاؤ سے بھی اس کو تقویت ملی۔ اس طرح مذہب اور سیاست نیز سماجی اور اقتصادی زور پر اس کی ترقی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ قدیم یورپ کے تقریباً پورے علاقہ میں

پھیل گئی۔ سینٹ آگسٹین (۴۳۰ - ۳۵۴) کے زمانے میں لاطینی اپنے عروج پر تھی۔ قرون وسطیٰ میں لاطینی زبان دنیا کی سب سے بڑی بین اقوامی زبان سمجھی جاتی تھی۔

آٹھویں صدی میں مسلم قومیں ابھریں اور انھوں نے رومی سلطنت کو توڑ کر اس کو قسطنطنیہ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ ۱۴۵۳ میں ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے وہاں سے بھی اس کا خاتمہ کر دیا۔

ہزار برس قبل جب رومی شہنشاہیت ٹوٹی تو مختلف علاقائی بولیوں کو ابھرنے کا موقع مل گیا۔ یہی بولیاں، لاطینی کی آمیزش کے ساتھ بعد کو وہ زبانیں بنیں جن کو آج ہم فرانسیسی، اطالوی، اسپینی، پرتگالی، رومانوی زبانیں کہتے ہیں۔

اب لاطینی زبان صرف رومن کلیسا کی عبادتی زبان ہے اور سائنس اور قانون کی اصطلاحات میں استعمال ہوتی ہے۔ اب وہ کوئی زندہ زبان نہیں ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت تاریخی ہے۔ مثال کے طور پر نیوٹن (۱۷۲۷ - ۱۶۴۲) کی پرنسپیا کوئی اصل زبان میں پڑھنا چاہے تو اس کو قدیم لاطینی زبان سیکھنی پڑے گی۔

یہی معاملہ تمام قدیم زبانوں کے ساتھ ہوا ہے۔ ہر زبان مختلف سماجی حالات کے تحت بدلتی رہی۔ یہاں تک کہ ابتدائی زبان ختم ہو گئی اور اس کی جگہ دوسری بدلی ہوئی زبان نے لے لی۔ قومی اختلاط، تہذیبی تصادم، سیاسی انقلاب، زمانی تبدیلی جب بھی کسی زبان کے ساتھ پیش آئے ہیں تو وہ بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ یہی تمام حالات پچھلے ڈیڑھ ہزار برس میں عربی زبان کے ساتھ بھی پیش آئے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ عربی زبان میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ اس تغیر پذیر لسانی دنیا میں عربی کا غیر تغیر پذیر رہنا تمام تر قرآن کا معجزہ ہے۔

۷۰ء میں یہودی قبائل شام سے نکل کر یثرب (مدینہ) آئے۔ یہاں اس وقت عمالقہ آباد تھے جن کی زبان عربی تھی۔ عمالقہ کے ساتھ اختلاط کے بعد یہودی نسلوں کی زبان عربی ہو گئی۔ تاہم ان کی عربی عام عربوں کی زبان سے مختلف تھی۔ وہ عبری اور عربی کا ایک مرکب تھی۔ یہی واقعہ اسلام کے بعد عربوں کے ساتھ زیادہ بڑے پیمانہ پر پیش آیا جب کہ وہ اپنے وطن عرب سے نکلے اور ایشیا اور افریقہ کے ان ملکوں میں داخل ہوئے جہاں کی زبانیں دوسری تھیں۔ مگر اس اختلاط کا کوئی اثر ان کی زبان پر نہیں پڑا۔ عربی بدستور اپنی اصل حالت پر محفوظ رہی۔

نزول قرآن کے بعد عربی زبان کے لئے اس قسم کا پہلا موقع خود صدر اول میں پیش آیا۔ اسلام عرب کے مختلف قبائل میں پھیلا۔ وہ لوگ اسلامی شہروں میں یک جا ہونے لگے۔ مختلف قبائل کی زبانیں تلفظ، لب ولہجہ وغیرہ کے اعتبار سے کافی مختلف تھیں۔ ابو عمرو بن العلاء کو کہنا پڑا تھا: ما لسان حمير بلساننا ولا لغتهم بلغتنا (قبیلہ حمیر کی زبان ہماری زبان نہیں ہے) حضرت عمرؓ نے ایک بار ایک اعرابی کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو اس کو پکڑ کر آنحضورؐ کے پاس لائے۔ کیونکہ وہ الفاظ قرآن کو اتنے مختلف ڈھنگ سے ادا کر رہا تھا کہ حضرت عمرؓ یہ نہ سمجھ سکے کہ وہ قرآن کا کون سا حصہ پڑھ رہا ہے۔ اسی طرح آنحضورؐ نے ایک بار ایک عرب قبیلہ کے وفد سے اس کی اپنی بولی میں گفتگو کی تو حضرت علیؓ کو ایسا محسوس ہوا جیسے آپ کوئی اور زبان بول رہے ہیں۔

اس کی بڑی وجہ لہجوں کا اختلاف تھا۔ مثلاً بنو تمیم جو مشرقی نجد میں رہتے تھے، وہ جیم کا تلفظ یا سے کرتے تھے، وہ

مسجد کو مسید اور شجرات کو سرات کہتے تھے۔ اسی طرح بنو تمیم ق کو جیم بولتے تھے۔ مثلاً طریق کو طریج، صدیق کو صدیج، قدر کو جدر اور قاسم کو جاسم وغیرہ۔ اس طرح مختلف قبائل کے ملنے سے لسانی تاریخ کے عام قانون کے مطابق ایک نیا عمل شروع ہونا چاہئے تھا جو بالآخر ایک نئی زبان کی تشکیل پر منتہی ہوتا۔ مگر قرآن کے برتر ادب نے عربی زبان کو اس طرح اپنے قبضہ میں لے رکھا تھا کہ اس کے اندر اس قسم کا عمل جاری نہ ہوسکا۔ اس کے برعکس وہ واقعہ پیش آیا جس کو ڈاکٹر احمد حسین زیات نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

ما کانت لغة مُضَرَ بعد الاسلام لغة امة واحدة و انما کانت لغة لجمیع الشعوب التی دخلت فی دین اللہ

اسلام کے بعد عربی زبان ایک قوم کی زبان نہیں رہی۔ بلکہ ان تمام قبائل کی زبان بن گئی جو خدا کے دین میں داخل ہوئے تھے۔

پھر یہ عرب مسلمان اپنے ملک سے باہر نکلے۔ انھوں نے ایک طرف جبل الطارق تک اور دوسری طرف کاشغر تک فتح کر ڈالا۔ ان علاقوں میں مختلف زبانیں رائج تھیں۔ وہ فارسی، قبطی، بربری، عبرانی، سریانی، یونانی، لاطینی، آرامی زبانیں بولتے اور لکھتے تھے۔ ان میں ایسی قومیں بھی تھیں جو اپنے سیاسی نظام اور اپنے تمدن میں عربوں سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھیں۔ وہ عراق میں داخل ہوئے جو ایک قدیم تمدن کا حامل تھا اور بڑی بڑی قوموں کا مرکز رہ چکا تھا۔ ان کا ایران سے اختلاط ہوا جو اس وقت کی دو عظیم ترین شہنشاہیتوں میں سے ایک تھا۔ ان کا تصادم رومی تہذیب اور عیسائی مذہب سے ہوا جو زبردست ترقی کے مقام پر پہنچ چکے تھے۔ ان کا سابقہ شام سے پیش آیا جہاں فینیقی، کنعانی، مصری، یونانی، غسانی قوموں نے اپنے آداب و اطوار کے نمایاں اثرات چھوڑے تھے۔ ان کا مقابلہ مصر سے ہوا جہاں مشرق و مغرب کے فلسفے آکر ملے تھے۔ یہ اسباب بالکل کافی تھے کہ عربی میں ایک نیا عمل شروع ہو اور ابتدائی زبان کے ساتھ ان نئے عوامل کے اثر سے ایک اور زبان وجود میں آجائے جیسا کہ دوسری زبانوں کے ساتھ ہوا۔ مگر اتنے بڑے لسانی بھونچال کے باوجود قرآن اس زبان کے لئے ایک ایسا برتر معیار بنا رہا جس نے تمام دوسرے عوامل کو اس کے لئے بے حقیقت بنا دیا۔

اسلام کی فتوحات کے بعد عربی زبان صرف ایک ملک کی زبان نہ رہی بلکہ کئی درجن ملکوں اور قوموں کی زبان بن گئی۔ ایشیا اور افریقہ کی عجمی اقوام نے جب اسلام قبول کیا تو ان کی زبان بھی دھیرے دھیرے عربی بن گئی۔ فطری طور پر ان غیر ملکی اقوام میں عربی زبان بولنے کی وہ قدرت نہ تھی جو خود عربوں میں تھی۔ ان کی زبان میں اپنی غیر عربی زبانوں کے اثر سے بہت سی خامیاں پیدا ہوگئیں۔ پھر یہی نہیں بلکہ خود عربوں میں جو لوگ زیادہ باشعور نہ تھے، دھیرے دھیرے وہ ان قوموں سے اثر لینے لگے۔ یہاں تک کہ خود ان کی زبان بدلنا شروع ہوگئی۔ بڑے بڑے شہروں میں یہ غلطیاں سب سے زیادہ تھیں۔ کیونکہ یہاں مختلف قوموں کے لوگ جمع تھے۔ بڑھتے بڑھتے یہ خرابی خواص تک پہنچ گئی۔ زیاد بن امیہ کے دربار میں ایک بار ایک شخص آیا اور بولا: توفی ابانا و ترک بنون (ہمارا باپ مرگیا اور اولاد چھوڑ گیا) اس جملہ میں ابانا کی جگہ ابونا ہونا چاہئے تھا اور بنون کی جگہ بنین۔ اس طرح کے بے شمار فروق پیدا ہوگئے۔ دیگر تاریخی زبانوں

کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہی عربی زبان کے ساتھ بھی لازماً ہوتا۔ مگر یہاں بھی قرآن کی ادبی عظمت عربی کے لئے ڈھال بن گئی اور عربی زبان کی صورت پھر بھی وہی باقی رہی جو قرآن نے اس کے لئے مقرر کر دی تھی۔

اس طرح کے واقعات جو عربی زبان کی پچھلی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ میں بار بار پیش آئے ہیں قرآن کے معجزہ ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔ کیونکہ یہ تمام تر قرآن کی عظمت ہی کا نتیجہ تھا جس نے عربی کو کسی تغیری عمل کا معمول بننے نہ دیا۔

دوسری صدی ہجری میں اموی سلطنت کا خاتمہ اور عباسی سلطنت کا قیام عربی زبان کے لئے زبردست فتنہ تھا۔ بنی امیہ کی حکومت خالص عربی حکومت تھی۔ اموی حکمراں عرب قومیت اور عربی زبان و ادب کی حمایت میں جانب داری اور تعصب کی حد تک سخت تھے۔ انھوں نے اپنا پایہ تخت دمشق کو بنایا تھا جو عرب دیہات کی سرحد پر واقع تھا۔ ان کی فوج، دفتری عملہ اور افسران سب عرب ہوا کرتے تھے۔ مگر عباسی حکومت میں ایرانیوں کا غلبہ ہو گیا۔ عباسیوں نے ایرانیوں ہی کی مدد سے بنی امیہ کا خاتمہ کیا تھا، اس لئے ان کے نظم ونسق میں ایرانی اعاجم کا عمل دخل ہو جانا لازمی تھا، حتیٰ کہ عباسیوں نے دار الخلافہ بغداد کو قرار دیا جو ایران سے بہت قریب تھا۔ انھوں نے ایرانیوں کو اتنی چھوٹ دی کہ وہ حکومت کے سارے معاملات میں آزادانہ کارروائیاں کرنے لگے۔ انھوں نے عرب اور عرب تہذیب کو حقارت کی نظر سے دیکھا اور اس کو بالقصد کمزور کرنے کی تدبیریں کرنے لگے۔ عربی عصبیت کے کمزور ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی، ترکی، سریانی، رومی اور بربری عناصر حکومت اور سماج کے تمام معاملات پر چھا گئے۔ عربوں اور غیر عربوں میں رشتہ داریاں قائم ہوئیں۔ آریائی تہذیب اور سامی تہذیب کے ملنے سے زبان اور تہذیب میں نیا انقلاب آگیا۔ کاسرہ کے پوتے اور قدیم جاگیرداروں کے بیٹے پھر سے ابھر آئے۔ انھوں نے اپنے آبا و اجداد کی تہذیب کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

ان واقعات کا عربی زبان پر بہت گہرا اثر پڑا۔ متنبی (۹۱۵ - ۹۶۵) کے زمانہ میں عربی کی جو حالت ہو چکی تھی، اس کا اندازہ اس کے چند اشعار سے ہوتا ہے:

مَغَانِي الشِّعبِ طِيباً فِي المغانی ... بِمنزِلَةِ الربیعِ مِنَ الزَّمانِ

ولكنّ الفتىَ العربىّ فيها ... غريب الوجه واليد واللسانِ

مَلاعِبُ جِنّةٍ لو سَارَ فيها ... سليمان لسار بترجمان

شرح دیوان المتنبی (بیروت ۱۹۳۸) صفحہ ۴۸۳

"شعب بوان (ایران) کے مکانات عمدگی میں تمام مکانوں سے اسی طرح بڑھے ہوئے ہیں جس طرح زمانہ کی تمام فصلوں میں بہار کی فصل۔ مگر اس بستی میں ایک عرب جوان (ہیں) اپنے چہرہ، ہاتھ اور زبان کے لحاظ سے بالکل اجنبی ہے۔ سلیمان جن کے تابع جنات تھے (جو جانوروں تک کی بولیاں سمجھتے تھے) اگر اس علاقہ میں آئیں تو انھیں اپنے ساتھ ترجمان رکھنا پڑے گا" ——— ترکوں اور کردوں نے بھی اس سلسلے میں ایرانیوں کی تقلید کی۔ مگر قرآن کی ادبی عظمت عربی زبان کے لئے ڈھال بنی رہی۔ اس قسم کی کوششوں سے وقتی ہلچل تو ضرور پیدا ہوئی مگر جلد ہی وہ دب کر رہ گئی اور عربی زبان میں کوئی مستقل تبدیلی پیدا نہ کر سکی۔

خلیفہ متوکل (۲۴۷ - ۲۰۷ھ) کے بعد عجمی اقوام، ایرانی اور ترک، عرب علاقہ میں بہت زیادہ دخیل ہو گئے۔ ۶۵۶ھ میں ہلاکو خاں نے بغداد کی سلطنت کو برباد کر دیا۔ ۸۹۸ھ میں اندلس کی عرب حکومت کو یورپی اقوام نے ختم کر دیا۔ ۹۲۳ھ میں مصر و شام سے فاطمیوں کا خاتمہ ہو گیا اور ان عرب علاقوں کی حکومت عثمانی ترکوں کے قبضہ میں چلی گئی۔ اسلامی حکومت کا دار السلطنت قاہرہ کے بجائے قسطنطنیہ ہو گیا۔ سرکاری زبان عربی کے بجائے ترکی قرار پائی۔ عربی زبان میں غیر زبان کے الفاظ اور اسالیب کثرت سے آنے لگے۔

عالم عرب پر ساڑھے پانچ سو سال ایسے گزرے ہیں جب کہ تمام عرب دنیا عجمی بادشاہوں کے جھنڈے کے نیچے رہی، حتیٰ کہ مغل، ترک اور ایرانی حکمراں عرب آثار تک کو مٹانے پر تلے رہے۔ عربی کے کتب خانے جلائے گئے، مدرسے اجاڑے گئے، علماء کو ذلیل کیا گیا۔ عثمانی سلطنت نے اپنی ساری طاقت کے ساتھ عربوں کو ترک بنانے کی وہ مہم چلائی جس کو جمال الدین افغانی نے بجا طور پر "تتریک العرب" کہا ہے۔ مگر ان میں سے کوئی واقعہ بھی عربی زبان میں کوئی مستقل تبدیلی پیدا نہ کر سکا۔ بغداد و بخارا میں تاتاریوں نے، شام میں صلیبیوں نے اور اندلس میں یورپی قوموں نے عربی زبان وادب اور عرب تہذیب کو جو نقصانات پہنچائے وہ عربی زبان کا نام ونشان مٹانے کے لئے بالکل کافی تھے۔ اس کے بعد، دوسری زبانوں کی تاریخ کے مطابق، یہ ہونا چاہئے تھا کہ عربی زبان اپنی دیگر سامی زبانوں سے مل جاتی۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ترکوں کی جہالت اور ایرانیوں کا تعصب اگر حائل نہ ہوا ہوتا تو عربی زبان آج تمام دنیا کے مسلمانوں کی واحد زبان ہوتی۔

تاہم جہاں تک عرب علاقہ کا تعلق ہے، وہاں اس کا بدستور اپنی سابقہ شان میں باقی رہ جانا تمام تر قرآن ہی کا معجزہ تھا۔ قرآن کی عظمت نے اس مدت میں لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ عربی زبان سے اپنا تعلق حکومت واقتدار کے علی الرغم باقی رکھیں یہی وجہ ہے کہ اس دور میں بھی بے شمار ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے عربی زبان وادب کی خدمت کی۔ مثال کے طور پر ابن منظور (۶۳۰ - ۷۱۱ھ) ابن خلدون (۷۳۲ - ۸۰۸ھ) وغیرہ۔

نپولین کے قاہرہ میں داخلہ ۱۷۹۸ء کے بعد جب مصر میں پریس آیا اور تعلیم کا دور دورہ ہوا تو عربی زبان کو نئی زندگی ملی تاہم پچھلے سیکڑوں برس کے حالات نے یہ صورت حال پیدا کر دی تھی کہ مصر و شام کے دفاتر کی زبان ترکی، عربی کا ایک مرکب تھا۔

۱۸۸۲ء میں مصر پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد پھر صورت حال بدلی۔ انھوں نے عربی کے خلاف اپنی ساری طاقت لگا دی۔ تمام تعلیم انگریزی کے ذریعہ لازمی کر دی گئی۔ مختلف زبانیں سکھانے کے ادارے ختم کر دیئے گئے۔ اسی طرح جن عرب علاقوں پر فرانسیسیوں کا غلبہ ہوا، وہاں انھوں نے فرانسیسی کو رواج دیا۔ مگر تقریباً سو سال تک انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے غلبہ کے باوجود عربی زبان بدستور اپنی اصل حالت پر باقی رہی۔ اس میں الفاظ کی وسعت ضرور پیدا ہوئی۔ مثال کے طور پر ٹینک کے لئے دبابہ کا لفظ رائج ہوا جو پہلے معمولی منجنیق کے لئے بولا جاتا تھا۔ اسی طرح طرز بیان میں وسعت پیدا ہوئی۔ مثلاً نو مسلموں کے حالات پر آج ایک کتاب شائع ہو تو اس کا نام رکھا جاتا ہے لماذا اسلمنا۔ جب کہ اس سے پہلے مسجع ومقفیٰ ناموں کا رواج تھا۔ اسی طرح بہت سے الفاظ معرب ہو کر رائج ہوئے مثلاً دکتور (ڈاکٹر)۔ مگر اس سے

اصل زبان میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اصل زبان بدستور وہی آج بھی ہے جو قرآن کے نزول کے وقت مکہ میں رائج تھی۔

ادبی ارتقاء

زبانوں میں تبدیلی کا دوسرا سبب ادیبوں اور مصنفوں کے کارنامے ہیں۔ جب بھی کوئی غیر معمولی ادیب یا مصنف پیدا ہوتا ہے، وہ زبان کو کھینچ کر نئے لسانی اسلوب کی طرف لے جاتا ہے۔ اس طرح زبان تبدیلی اور ارتقاء کے مراحل طے کرتی رہتی ہے، اور بدلتے بدلتے کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ عربی زبان میں، اس کے برعکس، ایسا ہوا کہ قرآن نے اول روز ہی ایسا برتر معیار سامنے رکھ دیا کہ کسی انسانی ادیب کے لئے ممکن نہ ہو سکا کہ وہ اس سے اوپر جا سکے۔ اس لئے عربی زبان اسی اسلوب پر باقی رہی جو قرآن نے اس کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں، عربی زبان میں، قرآن کے بعد کوئی دوسرا "قرآن" نہ لکھا جا سکا۔ اس لئے زبان بھی قرآنی زبان کے سوا کوئی اور زبان نہ بن سکی۔

انگریزی زبان کی مثال لیجئے۔ ساتویں صدی عیسوی میں وہ ایک معمولی مقامی بولی کی حیثیت رکھتی تھی جس میں کسی علمی خیال کو ظاہر کرنا ممکن نہ تھا۔ پانچ سو برس سے بھی زیادہ عرصہ تک یہی حال رہا۔ انگریزی زبان کا معمار اول جافرے چاسر (۱۴۰۰-۱۳۴۰) پیدا ہوا تو انگلستان کی درباری زبان فرانسیسی تھی۔ چاسر جو لاطینی، فرانسیسی اور اطالوی زبانیں جانتا تھا، اس نے انگریزی میں اشعار کہے اور نظمیں لکھیں۔ اپنی غیر معمولی ذہانت اور دیگر زبانوں سے واقفیت کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب ہو سکا کہ انگریزی بولی کو آگے لے جائے اور اس کو ایک علمی زبان کا روپ دے۔ ہاسر (Ernest Hauser) کے الفاظ میں اس نے اپنی کامیاب نظموں کے ذریعہ انگریزی کو ایک مضبوط بڑھاوا (Firm Boost) دیا۔ اس نے ایک بولی کو ایسی طاقتور زبان بنا دیا جس میں ترقی کے نئے امکانات چھپے ہوئے تھے۔ (ریڈرز ڈائجسٹ۔ جون ۱۹۷۵)

دو سو برس تک چاسر انگریزی شاعروں اور ادیبوں کا رہنما بنا رہا۔ یہاں تک کہ ولیم شکسپیر (۱۶۲۵-۱۵۵۸) کا ظہور ہوا جس نے چاسر سے زیادہ برتر ادب کا نمونہ پیش کیا۔ اپنے اشعار اور ڈراموں کے ذریعہ اس نے انگریزی کو دوبارہ ایک نیا معیار عطا کیا۔ اب انگریزی زبان ایک قدم اور آگے بڑھی اور ترقی کی نئی شاہراہ پر سفر کرنے لگی۔ یہ دور تقریباً ایک سو برس تک رہا، یہاں تک کہ سائنس کے ظہور نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب میں بھی، دوبارہ نئے معیار قائم کرنے شروع کئے۔ اب شعر کے بجائے نثر، اور افسانہ نویسی کے بجائے واقعہ نگاری کو اہمیت ملنے لگی۔ اس کے اثر سے انگریزی میں سائنٹفک اسلوب وجود میں آیا۔ سویفٹ (۱۷۴۵-۱۶۶۷) سے لے کر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (1888-1965) تک درجنوں ادیب پیدا ہوئے جنھوں نے زبان کو وہ نیا معیار عطا کیا جس سے اب ہم گزر رہے ہیں۔

یہی عمل تمام زبانوں میں ہوا ہے۔ ایک کے بعد دوسرا زیادہ بہتر لکھنے والا ادیب یا ادیبوں کا گروہ اٹھتا ہے اور وہ زبان کو نیا اسلوب دے کر نئے مرحلے کی طرف لے جاتا ہے۔ اس طرح زبان بدلتی رہتی ہے یہاں تک کہ چند صدیاں گزرنے کے بعد اتنا فرق ہو جاتا ہے کہ اگلے لوگ پچھلی زبان کو لغات اور شرح کے بغیر سمجھ ہی نہ سکیں۔

اس کلیہ سے صرف ایک زبان مستثنیٰ ہے اور وہ عربی زبان ہے۔ یہی واقعہ قرآن کے اس دعوے کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ کوئی شخص قرآن جیسی کتاب وضع نہیں کر سکتا۔ بلاشبہ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ پچھلی صدیوں میں

متعدد لوگوں نے قرآن کے جواب میں دوسرا قرآن لکھنے کی کوشش کی، مگر سب کے سب ناکام رہے۔ مثال کے طور پر مسیلمہ بن حبیب، طلیحہ بن خویلد، نضر بن الحارث، ابن الراوندی، ابو العلاء المعری، ابن المقفع، متنبی وغیرہ۔ اس سلسلے میں ان کی جو عبارتیں نقل کی گئی ہیں، وہ اتنی سطحی ہیں کہ قرآن کے مقابلہ میں ان کو رکھنا بھی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔
مثلاً مسیلمہ کے "قرآن" کا ایک حصہ یہ تھا:

یاضفدع نقّی ماتنقین، فلا الماء تکدرین ولا الشارب تمنعین

اے مینڈکی جتنا ٹرا سکے ٹرالے، تو نہ پانی کو گدلا کرے گی نہ پینے والوں کو روکے گی۔

اسی طرح مسیلمہ کا ایک اور "الہام" یہ تھا:

لقد انعم اللّٰہ علی الحبلی، اخرج منہا نسمۃ تسعی، من بین صفاق وحشا

تہذیب سیرۃ ابن ہشام، جلد دوم، صفحہ ۱۲۱

اللہ نے حاملہ عورت پر بڑا انعام کیا ہے، اس کے اندر سے دوڑتی ہوئی جان نکالی، جھلی اور پیٹ کے اندر سے

تاہم اس سے بھی زیادہ بڑا ثبوت وہ مسلسل واقعہ ہے جس کو ارنسٹ رینان نے ایک لسانی عجوبہ قرار دیا ہے جس طرح دوسری زبانوں میں زبان آور پیدا ہوئے، اسی طرح عربی میں بھی شعراء اور ادباء اور مصنفین پیدا ہوئے اور پیدا ہو رہے ہیں، مگر اس پوری مدت میں کوئی ایسا زباں داں نہ اٹھا جو قرآن سے برتر ادب پیش کر کے عربی میں نیا لسانی معیار قائم کرتا اور زبان کو نئے مرحلہ کی طرف لے جاتا۔ اس لئے زبان اسی مرحلۂ ترقی پر قائم رہی جو قرآن نے اس کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ اگر دوسری زبانوں کی طرح عربی زبان میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوتے جو قرآن کے مقابلہ میں زیادہ اعلیٰ ادب کا نمونہ پیش کرتے تو ناممکن تھا کہ زبان ایک مقام پر رکی رہے۔

قرآن کی مثال عربی زبان میں ایسی ہی ہے جیسے کسی زبان میں آخری اعلیٰ ترین ادیب اول روز ہی پیدا ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد کوئی ایسا ادیب نہیں ابھرے گا جو زبان میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکے۔ قرآن کے نزول کے زمانہ میں جو زبان عرب میں رائج تھی، اس کو ترقی دے کر قرآن نے اعلیٰ ترین ادب کی شکل میں ڈھال دیا۔ اس کے بعد اس میں تبدیلی کا کوئی سوال نہ تھا۔

قرآن نے عربی کے روایتی اسالیب پر اضافے کر کے اس میں توسیع کا دروازہ کھولا۔ مثال کے طور پر سورہ اخلاص میں لفظ "احد" کا استعمال۔ عربی زبان میں اس سے پہلے یہ لفظ مضاف مضاف الیہ کے طور پر استعمال ہوتا آیا تھا جیسے یوم الاحد (ہفتے کا دن) یا نفی عام کے لئے جیسے ما جاءنی احدٌ (میرے پاس کوئی نہیں آیا) وغیرہ مگر قرآن نے یہاں لفظ احد کو ہستی باری تعالیٰ کے لئے وصف کے طور پر استعمال کیا جو عربی زبان میں غیر معمولی تھا۔
عربی میں دوسری زبانوں کے الفاظ شامل کئے، مثلاً استبرق (فارسی) قسورہ (حبشی) صراط (یونانی) یم (سریانی) غساق (ترکی) قسطاس (رومی) ملکوت (آرامی) کافور (ہندی) وغیرہ۔ مکہ کے مشرکین نے جب کہا تھا کہ وما الرحمٰن (فرقان ۔ ۶۰) تو اس کا لسانی پس منظر یہ تھا کہ رحمان کا لفظ عربی نہیں یہ سبائی اور حمیری زبان سے آیا ہے۔ یمن اور حبشہ

کے نصرانی اللہ کو رحمٰن کہتے تھے۔ قرآن نے اس لفظ کی تعریب کرکے اس کو اللہ کے لئے استعمال کیا تو مکہ والوں کو وہ اجنبی محسوس ہوا۔ انھوں نے کہا "رحمان کیا"۔ قرآن میں غیر عربی الاصل الفاظ ایک سو سے زیادہ شمار کئے گئے ہیں جو فارسی رومی، نبطی، حبشی، عبرانی، سریانی قبطی وغیرہ زبانوں سے لئے گئے ہیں۔

قرآن اگرچہ قریش کی زبان میں اترا۔ مگر دوسرے قبائل عرب کی زبان بھی اس میں شامل کی گئی۔ مثلاً قرآن میں "فاطر" کا لفظ آیا ہے، عبداللہ بن عباسؓ جو ایک قریشی مسلمان تھے، کہتے ہیں:

ماکنت ادری معنی (فاطر السماوات والارض	میں فاطر السماوات والارض کے معنی نہیں سمجھتا تھا
حتی سمعت اعرابیا یقول لبئر ابتدأ حفرھا :	یہاں تک کہ ایک اعرابی جس نے ایک کنواں کھودنا شروع
انا فطرتہا	کیا تھا، کہا، انا فطرتُہا۔ تب میں اس کو سمجھا۔

ابوہریرہ رضؓ کہتے ہیں:

ماسمعت السکین الا فی قولہ تعالیٰ (یوسف - ۳۱)	میں نے سکین (چھری) کا لفظ پہلی بار قرآن کی آیت
ماکنا نقول الا المدیۃ	سے جانا۔ اس سے پہلے ہم اس کو مدیہ کہا کرتے تھے۔

بہت سے الفاظ ایسے تھے جن کے مختلف لہجے عرب قبائل میں رائج تھے۔ قرآن نے ان میں سے فصیح تر لفظ کا انتخاب کرکے اس کو اپنے ادب میں استعمال کیا۔ مثلاً قریش کے یہاں جس مفہوم کے لئے اعطیٰ کا لفظ تھا اس کے لئے حمیرین کے یہاں انطیٰ بولا جاتا تھا۔ قرآن نے انطیٰ کو چھوڑ کر اعطیٰ کا انتخاب کیا۔ اسی طرح شناتر کی جگہ اصابع کتع کی جگہ ذئب وغیرہ۔ قرآن اصلاً قریش کی زبان میں اترا ہے، مگر بعض مقامات پر قریش کی زبان کو چھوڑ کر کسی دوسرے قبیلے کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر لا یلتکم من اعمالکم بنی عبس کی زبان ہے۔ (الاتقان)

اس طرح قرآن نے الفاظ اور اسالیب کو نئی دسعتیں اور نیا حسن دے کر ایک اعلیٰ عربی ادب کا نمونہ قائم کر دیا۔ یہ نمونہ اتنا بلند تھا کہ اس کے بعد کوئی ادیب اس سے برتر معیار پیش نہ کرسکا۔ اس لئے عربی زبان ہمیشہ کے لئے قرآن کی زبان ہو کر رہ گئی۔

عربوں میں جو امثال اور تعبیرات قدیم زمانہ سے رائج تھیں، ان کو قرآن نے زیادہ بہتر پیرایہ میں ادا کیا۔ مثلاً زندگی کی بے ثباتی کو قدیم عربی شاعر نے ان لفظوں میں نظم کیا تھا:

کل ابن انثی وان طالت سلامتہ — یوما علی آلۃ حدباء محمول

ہر آدمی خواہ وہ کتنے ہی عرصہ تک صحیح وسالم رہے، ایک دن بہرحال وہ تابوت کے اوپر اٹھایا جائے گا۔

قرآن نے اس تصور کو ان لفظوں میں ادا کیا: كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران — ۱۸۵)

قدیم عرب میں قتل وغارت گری سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ اس صورت حال نے چند فقرے پیدا کئے تھے جو اس زمانہ میں فصاحت کا کمال سمجھے جاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ قتل کا علاج قتل ہے۔ اس تصور کو انھوں نے حسب ذیل مختلف الفاظ میں موزوں کیا تھا:

قَتْلُ الْبَعْضِ اِحْيَاءٌ لِلْجَمْعِ — بعض لوگوں کا قتل سب کی زندگی ہے
اَکْثِرُوا الْقَتْلَ لِيُقِلَّ الْقَتْلُ — قتل کی زیادتی کرو تاکہ قتل کم ہو جائے۔
اَلْقَتْلُ اَنْفٰی لِلْقَتْلِ — قتل کو سب سے زیادہ روکنے والی چیز قتل ہے

قرآن نے اس تصور کو ان لفظوں میں ادا کیا: وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیَاۃٌ یَّا اُولِی الْاَلْبَابِ (بقرہ ۔ ۱۷۹)

قرآن سے پہلے عربی میں اور دنیا کی تمام زبانوں میں شعر کو بلند مقام حاصل تھا۔ لوگ شعر کے اسلوب میں اپنے خیالات کو ظاہر کرنا کمال سمجھتے تھے۔ قرآن نے اس عام روش کو چھوڑ کر نثر کا اسلوب اختیار کیا۔ یہ واقعہ بجائے خود قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت ہے۔ کیوں کہ ساتویں صدی کی دنیا میں صرف خدائے لم یزل ہی اس بات کو جان سکتا تھا کہ انسانیت کے نام ابدی کتاب بھیجنے کے لیے اسے نثر کا اسلوب اختیار کرنا چاہیے نہ کہ شعر کا، جو مستقبل میں غیر اہم ہو جانے والا ہے۔ اسی طرح پہلے کسی بات کو مبالغہ کے ساتھ کہنا ادب کا کمال سمجھا جاتا تھا۔ قرآن نے تاریخ ادب میں پہلی بار واقعہ نگاری کو رواج دیا۔ پہلے جنگ اور عاشقی سب سے زیادہ مقبول مضامین تھے۔ قرآن نے اخلاق، قانون، سائنس، نفسیات، اقتصادیات، سیاسیات، تاریخ وغیرہ مضامین کو اپنے اندر شامل کیا۔ پہلے قصہ کہانی میں بات کہی جاتی تھی، قرآن نے براہ راست اسلوب کو اختیار کیا۔ پہلے قیاسی منطق کو ثبوت کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا، قرآن نے علمی استدلال کی حقیقت سے دنیا کو باخبر کیا۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ ساری چیزیں قرآن میں اتنے بلند اسلوب کلام میں بیان ہوئیں کہ اس کے مثل کوئی کلام پیش کرنا انسان کے امکان سے باہر ہے۔

قدیم عرب میں یہ مقولہ تھا کہ ان اعذب الشعر اکذبہ (سب سے زیادہ میٹھا شعر وہ ہے جس میں سب سے زیادہ جھوٹ ہو) مگر قرآن نے ایک نیا طرز بیان (رحمٰن ۔ ۴) پیدا کیا جس میں فرضی مبالغوں کے بجائے واقعیت تھی، اس نے حقیقت پسند ادب کا نمونہ پیش کیا۔ قرآن عربی زبان و ادب کا حاکم بن گیا۔ ادب جاہلی کا جو سرمایہ آج محفوظ ہے، وہ سب قرآن کی زبان کو محفوظ رکھنے اور اس کو سمجھنے کے لئے جمع کیا گیا۔ اسی طرح صرف ونحو، معانی وبیان، لغت وتفسیر، حدیث وفقہ، علم کلام، سب قرآن کے معانی ومطالب کو حل کرنے اور اس کے اوامر و نواہی کی شرح کرنے کے لئے وجود میں آئے۔ حتیٰ کہ عربوں نے جب تاریخ وجغرافیہ اور دیگر علوم کو اپنایا تو وہ بھی قرآن کے احکام وہدایت کو سمجھنے اور ان پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کی ایک کوشش تھی ـــــ قرآن کے سوا تاریخ میں کوئی دوسری مثال نہیں کہ کسی ایک کتاب نے کسی قوم کو اتنا زیادہ متاثر کیا ہو۔

قرآن نے عربی زبان میں تصرف کر کے جو اعلیٰ تر ادب تیار کیا، وہ اتنا ممتاز اور بدیہی ہے کہ کوئی بھی عربی جاننے والا شخص کسی بھی دوسری عربی کتاب کی زبان سے قرآن کی زبان کا تقابل کر کے ہر وقت اسے دیکھ سکتا ہے۔ قرآن کا الٰہی ادب عام انسانی ادب سے اتنا نمایاں طور پر فائق ہے کہ کوئی عربی داں اس کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہاں ہم مثال کے لئے ایک واقعہ نقل کرتے ہیں جس سے اس فرق کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔ طنطاوی جوہری لکھتے ہیں:

"۱۳ ، جون ۱۹۳۲ کو میری ملاقات مصری ادیب استاذ کامل گیلانی سے ہوئی۔ انھوں نے ایک عجیب واقعہ

بیان کیا۔ انھوں نے کہا، میں امریکی مستشرق فنکل کے ساتھ تھا۔ میرے اور ان کے درمیان ادبی رشتہ سے گہرے تعلقات تھے۔ ایک دن انھوں نے میرے کان میں چپکے سے کہا "کیا تم بھی انھیں لوگوں میں ہو جو قرآن کو ایک معجزہ مانتے ہیں" یہ کہہ کر وہ ایک معنی خیز ہنسی ہنسے جس کا مطلب یہ تھا کہ اس عقیدہ کی کوئی حقیقت نہیں۔ محض تقلیداً مسلمان اس کو مانتے چلے جارہے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ انھوں نے ایسا تیر مارا ہے جس کا کوئی روک نہیں۔ ان کا یہ حال دیکھ کر مجھے بھی ہنسی آگئی۔ میں نے کہا: قرآن کی بلاغت کے بارے میں کوئی حکم لگانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم تجربہ کرکے دیکھ لیں کہ کیا ہم اس جیسا کلام مرتب کرسکتے ہیں۔ تجربہ کرکے خود بخود اندازہ ہوجائے گا کہ ہم ویسا کلام تیار کرنے پر قادر ہیں یا نہیں۔

اس کے بعد میں نے استاد فنکل سے کہا کہ آیئے ہم ایک قرآنی تصور کو عربی الفاظ میں مرتب کریں۔ وہ تصور یہ کہ "جہنم بہت وسیع ہے"۔ انھوں نے اس رائے سے اتفاق کیا اور ہم دونوں قلم کاغذ لے کر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں نے مل کر "تقریباً بیس جملے عربی کے بنائے جس میں مذکورہ بالا مفہوم کو مختلف الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ جملے یہ تھے:

ان جهنم واسعة جدا
ان جهنم لاوسع مما تظنون
ان سعة جهنم لا يتصورها عقل الانسان
ان جهنم لتسع الدنيا كلها
ان الجن والانس اذا دخلوا جهنم لتسعهم ولا تضيق بهم
كل وصف فى سعة جهنم لا يصل الى تقريب شئ من حقيقتها
ان سعة جهنم لتصغر امامها سعة السماوات والارض
كل ماخطر ببالك فى سعة جهنم فانها لارحب منه واوسع
سترون من سعة جهنم مالم تكونوا لتحلموا به او تتصوروه
مهما حاولت ان تخيل سعة جهنم فانت مقصر ولن تصل الى شئ من حقيقتها
ان البلاغة المعجزة لتقصر وتعجز اشد العجز عن وصف سعة جهنم
ان سعة جهنم قد تخطت احلام الحالمين وتصور المتصورين
متى امسكت بالقلم وتصديت لوصف سعة جهنم احسست بقصورك وعجزك
ان سعة جهنم لا يصفها وصف ولا يتخيلها وهم ولا تدور بحسبان
كل وصف لسعة جهنم انما هو فضول وهذيان

ہم دونوں جب اپنی کوشش مکمل کرچکے اور ہمارے پاس مزید عبارت کے لئے الفاظ نہ رہے تو میں نے

پروفیسر فنکل کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ "اب آپ پر قرآن کی بلاغت کھل جائے گی"۔ میں نے کہا: "جب کہ ہم اپنی ساری کوشش صرف کر کے اس مفہوم کے لئے اپنی عبارتیں تیار کر چکے ہیں۔ پروفیسر فنکل نے کہا: کیا قرآن نے اس مفہوم کو ہم سے زیادہ بلیغ اسلوب میں ادا کیا ہے۔ میں نے کہا ہم قرآن کے مقابلے میں بچے ثابت ہوئے ہیں۔ انھوں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا، قرآن میں کیا ہے۔ میں نے سورۂ ق کی یہ آیت پڑھی: یَوْمَ نَقُوْلُ لِجَہَنَّمَ ہَلِ امْتَلَئْتِ وَتَقُوْلُ ہَلْ مِنْ مَّزِیْدٍ ۔ یہ سن کر ان کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ اس بلاغت کو دیکھ کر حیران گئے، انھوں نے کہا:

صدقت نعم صدقت دانا اقر ذلك مغتبطا من كل قلبی۔

آپ نے سچ کہا بالکل سچ۔ میں کھلے دل سے اس کا اقرار کرتا ہوں۔

میں نے کہا، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ آپ نے حق کا اعتراف کر لیا۔ کیوں کہ آپ ادیب ہیں اور اسالیب کی اہمیت کا آپ کو پورا اندازہ ہے۔ یہ مستشرق انگریزی، جرمن، عبرانی اور عربی زبانوں سے بخوبی واقف تھا۔ لٹریچر کے مطالعہ میں اس نے اپنی عمر صرف کر دی تھی۔"

الشیخ طنطاوی جوہری، الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم، مصر ۱۳۵۱ھ، جزء ۲۳، صفحات ۱۲-۱۱۱

اصحاب رسول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سادہ لفظوں میں محض اصحاب نہ تھے بلکہ وہ خود تاریخ رسالت کا لازمی جزء تھے۔ اللہ نے ان کو اس لئے منتخب کیا تھا کہ وہ اللہ کے رسول کے معاون بنیں۔ وہ آپ کے شریک کار بن کر اس ربانی مشن کو تکمیل تک پہنچائیں جو آپ کے ذریعہ پورا کیا جانا مطلوب تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اصحاب رسول کے بارے میں فرمایا: ان کو اللہ نے اپنے رسول کی صحبت کے لئے اور اپنے دین کی اقامت کے لئے چن لیا تھا (اختارھم اللہ لصحبۃ نبیہ ولاقامۃ دینہ)

اصحاب رسول کو ان کی کن خصوصیات نے یہ تاریخی مقام دیا، اس سلسلے میں اس کے چند پہلو یہاں مختصراً درج کئے جاتے ہیں۔

دین ان کے لئے محبوب چیز بن گیا تھا

اصحاب رسول کی خصوصیت قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ ایمان ان کے لئے ایک محبوب شئے بن گیا تھا (الحجرات ۷) محبت کسی چیز سے تعلق کا آخری درجہ ہے۔ اور جب کسی چیز سے محبت کے درجہ کا تعلق پیدا ہوجائے تو وہ آدمی کے لئے ہر چیز کا بدل بن جاتا ہے۔ اس کے بعد آدمی کا ذہن اس چیز کے بارے میں اس طرح متحرک ہوجاتا ہے کہ آدمی بغیر بتائے ہوئے اس سے متعلق ہر بات کو جان لیتا ہے۔ اس کو خواہ معروف معنوں میں کوئی نقشہ کار نہ دیا گیا ہو مگر اس کا ذہن خود بتا دیتا ہے کہ اس کو اپنی محبوب شے کے لئے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے (التوبہ ۴۶)

محبت کی سطح کے تعلق کا مطلب ہے دل چسپی کی سطح کا تعلق۔ یعنی یہ کہ آدمی اسلام کے نفع نقصان کو خود اپنا نفع نقصان سمجھنے لگے۔ اصحاب رسول کو اسلام سے اسی قسم کا تعلق پیدا ہوگیا تھا۔ وہ اسلام کے فائدے سے اسی طرح خوش ہوتے تھے جس طرح کوئی شخص اپنے بیٹے کی کامیابی سے خوش ہوتا ہے۔ اسلام کو کوئی نقصان پہنچے تو وہ اسی طرح بے چین ہوجاتے تھے جیسے کوئی شخص اپنے بیٹے کے متعلق ناخوش گوار خبر سن کر تڑپ اٹھتا ہے اور اس وقت تک اسے چین نہیں آتا جب تک وہ اس کی تلافی نہ کرلے۔

کسی چیز سے محبت کے درجے کا تعلق پیدا ہوجائے تو آدمی کا ذہن اس کے بارے میں پوری طرح

جاگ اٹھتا ہے۔ وہ اس کی خاطر ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس کی ضرورت اور تقاضوں کو وہ بتائے بغیر جان لیتا ہے۔ اس کی بات کو پانے کے لئے کوئی نفسیاتی گرہ اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ اس کے راستے میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے وہ کسی چیز کو عذر نہیں بناتا۔

جب آدمی کسی معاملہ کو اپنا معاملہ سمجھ لے تو اس کے بعد اس کو نہ زیادہ بتانے کی ضرورت ہوتی اور نہ زیادہ سمجھانے کی۔ اس کا قلبی تعلق اس کے لئے ہر دوسری چیز کا بدل بن جاتا ہے۔ وہ کسی معاوضہ کی امید کے بغیر یک طرفہ طور پر اپنا سب کچھ اس کے لئے لٹا دیتا ہے۔ اس کی خاطر کھونا بھی اس کو پانا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی خاطر بے قیمت ہو جانا اس کی نظر میں سب سے زیادہ قیمتی ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے وہ ہر دوسری مصلحت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کے لئے وہ ہر تکلیف کو اس طرح سہہ لیتا ہے جیسے کہ وہ کوئی تکلیف ہی نہ ہو۔

اصحاب رسول کوئی غیر معمولی انسان نہ تھے۔ وہ کوئی ماورائے بشر مخلوق نہیں تھے۔ ان کی خصوصیت صرف یہ تھی کہ "محبت" کے درجہ کا تعلق جو عام انسانوں کو صرف اپنے آپ سے ہوتا ہے وہی تعلق ان کو دین و ایمان سے ہو گیا تھا۔ عام آدمی اپنے مستقبل کی تعمیر کو جو اہمیت دیتا ہے وہی اہمیت وہ اسلام کے مستقبل کی تعمیر کو دینے لگے تھے۔ وہ دین کے لئے اپنا حصہ ادا کرنے کو اتنا ہی ضروری سمجھنے لگے تھے جتنا کوئی شخص اپنی ذاتی دل چسپی کے معاملہ میں اپنے آپ کو اور اپنے اثاثہ کو استعمال کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ ان کی یہی خصوصیت تھی کہ وہ تاریخ کے وہ گروہ بنے جس نے اسلام کو عظیم ترین کامیابی کے مقام تک پہنچایا۔

پیغمبر کو آغاز تاریخ میں پہچاننا

صحابہ کی یہ انوکھی صفت تھی کہ انھوں نے اپنے ایک معاصر رسول کو پہچانا اور اس کا ساتھ دیا۔ یہ کام اتنا مشکل ہے کہ معلوم تاریخ میں جماعت کی سطح پر صرف ایک بار پیش آیا ہے۔ قدیم تاریخ کے ہر دور میں یہ قصہ پیش آیا کہ رسولوں کے مخاطبین نے ان کا انکار کیا اور ان کا مذاق اڑایا۔ بائبل میں ہے کہ "تم نے میرے نبیوں کو ناچیز جانا" یہ نبیوں کو ناچیز جاننے والے کون لوگ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو وحی و رسالت کو مانتے تھے۔ نبیوں کے نام پر ان کے یہاں ادارے قائم تھے اور بڑے بڑے جشن ہوتے تھے۔ مگر یہ سب کچھ قدیم نبیوں کے نام پر ہوتا تھا۔ جہاں تک وقت کے نبی کا سوال تھا، اس کے لئے ان کے پاس استہزا و تمسخر کے سوا کچھ نہ تھا۔

یہود نے حضرت مسیح کا انکار کیا، حالانکہ وہ موسیٰ کو مانتے تھے۔ نصاریٰ نے حضرت محمد کا انکار کیا، حالانکہ وہ حضرت مسیح کی پرستش کی حد تک عزت کرتے تھے۔ اسی طرح قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر مارے اور آپ کو گھر سے نکالا، حالانکہ وہ حضرت ابراہیم کے وارث ہونے پر فخر کرتے تھے۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم نبی کی نبوت تاریخی روایات کے نتیجہ میں ثابت شدہ نبوت بن جاتی ہے۔ وہ کسی قوم کے قومی اثاثہ کا ایک لازمی جزء ہوتی ہے۔ کسی قوم میں آنے والا نبی اس کی بعد کی نسلوں کے لئے ایک طرح کا مقدس ہیرو بن جاتا ہے۔ اس کو ماننا اپنے قومی تشخص کو قائم کرنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے نبی کو کون نہیں مانے گا۔ مگر وقت کے نبی کی نبوت ایک متنازعہ نبوت ہوتی ہے۔ وہ التباس کے پردہ میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس کو ماننے کے لئے ظواہر کا پردہ پھاڑ کر حقیقت کو دیکھنا پڑتا ہے۔ اس کا ساتھ دینے کے لئے اپنی انا کو دفن کرنا ہوتا ہے۔ اس کے مشن کی راہ میں اپنا سرمایہ خرچ کرنا ایک ایسے مشن کی راہ میں اپنا سرمایہ خرچ کرنا ہوتا ہے جس کا برسرِ حق ہونا ابھی اختلافی ہو، جس کے بارے میں تاریخ کی تصدیقات ابھی جمع نہ ہوئی ہوں۔ صحابہ کرام وہ لوگ تھے جنھوں نے معاصر رسول کو اس طرح مانا جس طرح کوئی شخص تاریخی رسول کو مانتا ہے۔

غزوۂ خندق میں جب محاصرہ شدید ہوا اور معمولی ضروریات کی فراہمی ناممکن ہوگئی تو ایک مسلمان کی زبان سے یہ جملہ نکل گیا کہ محمد ہم سے وعدہ کرتے تھے کہ ہم کسریٰ اور قیصر کے خزانے حاصل کریں گے اور اب یہ حال ہے کہ ہمارا ایک شخص بیت الخلا جانے کے لئے بھی محفوظ نہیں (کان محمد یعدنا ان ناکل کنوز کسریٰ وقیصر واحدنا لا یأمن ان یذھب الی الغائط، سیرۃ ابن ہشام جزء ثانی صفحہ ۲۲۲) غزوۂ خندق کے وقت رسول اللہ کا وعدہ محض ایک لفظی وعدہ تھا، آج یہ ایک تاریخی واقعہ بن چکا ہے۔ صحابہ نے اس وعدہ کے تاریخی واقعہ بننے سے پہلے رسول کی عظمت کو مانا۔ ہم آج اس وعدہ کے تاریخی واقعہ بننے کے بعد رسول کی عظمت کو مان رہے ہیں۔ دونوں ماننے میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ ایک کو دوسرے سے کوئی نسبت نہیں۔ آج ایک غیر مسلم محقق بھی پیغمبر اسلام کو تاریخ کا سب سے بڑا انسان کہنے پر مجبور ہے مگر آپ کی زندگی میں آپ کی عظمت کو پہچاننا اتنا مشکل تھا کہ صرف وہی لوگ اس کو پہچان سکتے تھے جن کو خدا کی طرف سے خصوصی توفیق ملی ہو۔

قرآن کو دور نزاع میں اپنانا

سیرت کی کتابوں میں صحابہ کا دعوتی طریقہ یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ قرآن کے نازل شدہ حصہ کو لے لیتے اور اس کو لوگوں کے سامنے پڑھ کر سناتے تھے (فعرض علیھم الاسلام وتلا علیھم القرآن) چنانچہ مدینہ میں جو صحابہ تبلیغ کے لئے گئے ان کو وہاں مقری (قرآن پڑھنے والا) کہا جاتا تھا۔ یہ بات آج کے ماحول میں بظاہر انوکھی معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن اگر چودہ سو سال کی تاریخ کو حذف کرکے آپ اسلام کے ابتدائی دور میں پہنچ جائیں اور اس وقت کے حالات میں اسے دیکھیں تو یہ اتنا انوکھا واقعہ معلوم ہوگا کہ نہ اس سے پہلے وہ کبھی جماعتی سطح پر پیش آیا اور نہ اس کے بعد۔

آج جب ہم لفظ "قرآن" بولتے ہیں تو یہ ہمارے لئے ایک ایسی عظیم کتاب کا نام ہوتا ہے جس نے چودہ صدیوں میں اپنی عظمت کو اس طرح مسلم کیا ہے کہ آج کروروں انسان اس کو خدا کی کتاب ماننے پر مجبور ہیں ۔ آج اپنے آپ کو قرآن سے منسوب کرنا کسی آدمی کے لئے فخر و اعزاز کی بات بن چکی ہے ۔ مگر زمانہ نزول میں لوگوں کے نزدیک اس کی یہ حیثیت نہ تھی ۔ عرب میں بہت سے لوگ تھے جو یہ کہتے تھے کہ محمد نے پرانے زمانہ کے قصے کہانیوں کو جوڑ کر ایک کتاب بنالی ہے ۔ ہم چاہیں تو ہم بھی ایسی ایک کتاب بنالیں (لو نشاء لقلنا مثل ھذا ان ھذا الا اساطیر الاولین ، الانفال ۳۱) کوئی قرآن میں تکرار کو دیکھ کر کہتا کہ یہ کوئی خاص کتاب نہیں ۔ محمد کے پاس بس چند باتیں ہیں ، انھیں کو وہ صبح شام دہراتے رہتے ہیں (وقالوا اساطیر الاولین اکتتبھا فھی تملی علیہ بکرۃ واصیلا ، الفرقان ۵)

ایسی حالت میں قرآن کو پہچاننا گویا مستقبل میں ظاہر ہونے والے واقعہ کو حال میں دیکھنا تھا ۔ یہ ایک چھپی ہوئی حقیقت کو اس کے ثابت شدہ بننے سے پہلے پالینا تھا ۔ پھر ایسے وقت میں قرآن کو کتاب دعوت بنالینا اور بھی زیادہ مشکل کام ہے ۔ کیونکہ اس کے لئے اپنی عظمت کو کھو کر دوسرے کی عظمت میں گم ہونا پڑتا ہے ۔ یہ اپنے مقابلہ میں دوسری شخصیت کا اعتراف کرنا ہے ، اور وہ بھی ایسی شخصیت کا جس کی حیثیت ابھی مسلّم نہ ہوئی ہو ۔ عرب کے مشہور شاعر لبید نے اسلام قبول کیا اور شاعری چھوڑ دی ۔ کسی نے پوچھا کہ تم نے شاعری کیوں چھوڑ دی ۔ لبید نے کہا : ابعد القرآن (کیا قرآن کے بعد بھی) آج کوئی آدمی شاعری چھوڑ کر یہ جملہ کہے تو اس کو زبردست عظمت اور مقبولیت حاصل ہوگی ۔ مگر لبید کے قول میں اور آج کے شاعر کے قول میں کوئی نسبت نہیں ۔ کیونکہ آج کا شاعر تاریخ کے اختتام پر یہ جملہ کہہ رہا ہے جب کہ لبید نے تاریخ کے آغاز پر یہ جملہ کہا تھا ۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے ۔

لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولئك اعظم درجة من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا الحدید ۱۰	تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنھوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ۔ ان کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بہت زیادہ ہے ۔

غیر قائم شدہ صداقت کے لئے مال لٹانا

ابن ابی حاتم نے ایک صحابی کا واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے :

عن عبد الله بن مسعود قال لما نزلت ھٰذہ الآیة (من ذا الذی یقرض الله قرضاً حسناً فیضاعفه	عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب قرآن میں یہ آیت اتری کہ کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے

له «الحدید ۱۱) قال ابوالدحداح الانصاری یارسول اللّٰه وانّ اللّٰه لیرید منا القرض قال نعم یا ابا الدحداح۔ قال ارنی یدك یارسول اللّٰه۔ قال فناوله یده۔ قال فانی قد اقرضت ربی حائطی۔ وله حائط فیه ستمائة نخلة وام الدحداح فیه وعیالها۔ قال فجاء ابوالدحداح فناداها یا امّ الدحداح قالت لبیك۔ قال اخرجی فقد اقرضته ربی عزوجل فقالت له ربح بیعك یا ابا الدحداح و نقلت منه متاعها وصبیانها۔ وانّ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه قال کم من عذق رداح فی الجنة لابی الدحداح

(تفسیر ابن کثیر)

تو حضرت ابودحداح انصاری نے رسول اللہ صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اے خدا کے رسول، کیا اللہ واقعی ہم سے قرض چاہتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں اے ابودحداح۔ انھوں نے کہا اے خدا کے رسول، اپنا ہاتھ لائیے۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیا۔ ابودحداح نے کہا کہ میں نے اپنا باغ اپنے رب کو قرض میں دے دیا۔ ان کا ایک کھجوروں کا باغ تھا جس میں چھ سو درخت تھے۔ اس وقت ان کی بیوی ام دحداح اپنے بچوں کے ساتھ باغ میں تھیں۔ وہ باغ میں واپس آئے اور آواز دی کہ اے ام دحداح۔ انھوں نے کہا ہاں۔ ابودحداح نے کہا باغ سے نکلو، کیونکہ اس کو میں نے اپنے رب کو قرض میں دے دیا۔ بیوی نے کہا: اے ابودحداح آپ کی تجارت کامیاب رہی۔ اور اس کے بعد اپنے سامان اور اپنے بچوں کو لے کر باغ سے نکل آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابودحداح کے لئے جنت میں کتنے ہی شاداب اور پھل دار درخت ہیں۔

یہ ایک نمائندہ واقعہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام جس دین پر ایمان لائے تھے اس دین کی خاطر قربانی پیش کرنے کے لئے وہ کس قدر بے چین رہتے تھے۔ یہاں دوبارہ ذہن میں رکھ لیجئے کہ یہ واقعہ چودہ سو سال پہلے کا ہے۔ آج کوئی شخص دین کے نام پر اس قسم کا انفاق کرے تو عین ممکن ہے کہ لاکھوں مسلمانوں کے درمیان مقبولیت کی صورت میں اس کو بہت جلد اپنے انفاق سے زیادہ بڑی چیز مل جائے۔ مگر اصحاب رسول کے زمانے میں صورت حال بالکل مختلف تھی۔ اس وقت دین کی راہ میں اپنا مال لٹانا ماحول میں دیوانگی کا خطاب پانے کا ذریعہ تھا، وہ اونچے میناروں پر نمایاں ہونے کے بجائے بنیاد کی زمین میں دفن ہونے کے ہم معنی تھا۔ اس وقت ایسا اقدام ایک ایسی تحریک کے خانہ میں لکھا جانے والا تھا جس کی صداقت ابھی مشتبہ تھی جس کی پشت پر تاریخ کی تصدیقات ابھی جمع نہیں ہوئی تھیں۔ یہ ایک غیر مسلمہ مد میں اپنا اثاثہ پیش کرنا تھا، جب کہ آج کا آدمی ایک مسلمہ مد میں اپنا اثاثہ پیش کرتا ہے۔

اپنا تاج دوسرے کے سر پر رکھنا

مدینہ میں عبداللہ بن ابی بہت عاقل اور صاحب شخصیت آدمی تھا، وہ مدینہ کا سب سے زیادہ ممتاز سردار سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ مدینہ کے باشندوں کو اپنا اختلاف و انتشار ختم کرنے کا احساس ہوا تو انھوں نے عبداللہ بن ابی کو منتخب کیا کہ اس کو اپنا بادشاہ بنائیں اور اس کی علامت کے طور پر اس کو ایک تاج پہنائیں (فاما عبد اللہ بن ابی فکان قومہ قد نظموا لہ الخرز لیتوجوہ ثم یملکوہ علیہم، سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۲۱۶)

عبداللہ بن ابی کی تاج پوشی کا انتظام مکمل ہو چکا تھا کہ عین اس وقت اسلام مدینہ میں پہنچ گیا۔ مدینہ کے باشندوں کی فطرت نے اس کی صداقت کی گواہی دی اور اسلام گھر گھر میں پھیلنے لگا۔ اس کے بعد مدینہ کے باشندوں کا ایک نمائندہ وفد مکہ آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور آپ کی زبان سے آپ کا پیغام سنا۔ انھیں نظر آیا کہ مدینہ کی اجتماعی تنظیم کے لئے انھیں جو شخصیت درکار ہے وہ زیادہ بہتر طور پر محمد بن عبداللہ کی صورت میں موجود ہے۔ انھوں نے مدینہ کے لوگوں کی طرف سے آپ کو پیش کش کی کہ آپ مدینہ آئیں اور وہاں ہمارے سردار بن کر رہیں۔ اسلامی تاریخ کا یہی وہ واقعہ ہے جو بیعت عقبہ ثانیہ کے نام سے مشہور ہے۔

یہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ یہ اپنا تاج دوسرے آدمی کے سر پر رکھ دینے کے ہم معنی تھا۔ قدیم قبائلی دور میں ایسا کوئی واقعہ بے حد نادر واقعہ تھا۔ اپنی قوم یا قبیلہ سے باہر کسی آدمی کو اپنا غیر مشروط سردار بنا لینا ہمیشہ انسان کے لئے مشکل ترین کام رہا ہے اور قدیم زمانہ میں تو یہ اور بھی زیادہ مشکل تھا۔ مزید یہ کہ جب یہ واقعہ پیش آیا اس وقت "محمد" اس پر عظمت ہستی کا نام نہ تھا جس سے ہم آج واقف ہیں۔ اس وقت محمد ایک ایسے انسان تھے جن کو ان کے اہل وطن نے نکال دیا تھا۔ جن کے ساتھ قومی عصبیت اور تاریخی عظمت شامل نہ ہوئی تھی۔ جو نہ صرف متنازعہ شخصیت تھے بلکہ ایک لٹے ہوئے بے گھر انسان تھے۔ جن کو اپنا سب کچھ دے دینا تھا اور ان سے پانا کچھ بھی نہ تھا ——— بیسویں صدی میں کسی برنارڈ شا کے لئے بہت آسان ہے کہ وہ پیغمبر اسلام کے لئے یورپ کی سرداری کی پیش کش کرے۔ مگر چھٹی صدی عیسوی میں کسی کے لئے اس کا تصور بھی نا ممکن تھا کہ وہ آپ کو پیغمبر مان کر آپ کو اپنا اجتماعی امام بنا لے۔

اپنی محدودیت کو جاننا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ جب بھی کوئی معاملہ پیش آتا تو آپ اس کے بارے میں لوگوں سے مشورہ کرتے۔ آپ اپنے اصحاب کو جمع کرتے اور معاملہ کو بیان کر کے فرماتے کہ اشیروا علی ایہا الناس

(اے لوگو مجھے مشورہ دو) آپ بظاہر سب سے مشورہ طلب کرتے۔ مگر عملاً یہ ہوتا کہ کچھ دیر خاموشی رہتی اور اس کے بعد حضرت ابوبکر کھڑے ہوکر مختصراً اپنی رائے ظاہر کرکے بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد حضرت عمر کھڑے ہوتے اور مختصراً کچھ بول کر بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد معمولی طور پر کچھ لوگ بولتے اور اتفاق رائے سے فیصلہ ہوجاتا۔ آپ کی وفات کے بعد جب حضرت ابوبکر کی خلافت کا زمانہ آیا تو آپ بھی اسی طرح لوگوں کو جمع کرکے مشورہ طلب کرتے، اب یہ ہوتا کہ کچھ دیر خاموشی کے بعد حضرت عمر کھڑے ہوتے اور مختصر طور پر اپنی رائے ظاہر کرکے بیٹھ جاتے، اس کے بعد چند لوگ بولتے اور اتفاق رائے سے فیصلہ ہوجاتا۔ حضرت عمر کے بعد غیر اصحاب کی تعداد بڑھ گئی اور مذکورہ صورت باقی نہ رہی۔

یہ بظاہر ایک سادہ سی بات ہے مگر یہ اتنی اہم بات ہے کہ تاریخ میں کوئی دوسرا معاشرہ نہیں پایا جاتا جس نے اس کا ثبوت دیا ہو۔ یہ طرز عمل صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی اتنا خود شناس ہوجائے کہ وہ اپنی کمیوں اور محدودیتوں کو جاننے لگے۔ وہ دوسرے کے "ہے" کے مقابلہ میں اپنے "نہیں" سے واقف ہوجائے۔ وہ اپنے کو اس حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھنے لگے جس نظر سے دوسرا شخص اسے دیکھ رہا ہے۔

اس میں اتنا اور اضافہ کرلیجئے کہ یہ واقعہ جس ابوبکر وعمر کے ساتھ پیش آیا وہ ابوبکر وعمر وہ نہ تھے جن کو آج ہم جانتے ہیں، آج ہم تکمیل تاریخ والے ابوبکر وعمر کو جانتے ہیں۔ مگر وہ آغاز تاریخ والے ابوبکر وعمر کو جانتے تھے۔ اس وقت وہ اپنے معاصرین کے لئے صرف ان میں سے ایک تھے۔ جب کہ آج وہ ہمارے لئے گزری ہوئی تاریخ کے ستون ہیں جن کو ہم اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کوئی ثابت شدہ واقعہ کو دیکھتا ہے۔ "ابوبکر وعمر" کو تاریخ بننے کے بعد جاننا انتہائی آسان ہے۔ لیکن "ابوبکر وعمر" کو تاریخ بننے سے پہلے جاننا اتنا ہی مشکل ہے۔ اصحاب رسول وہ لوگ تھے جو اس مشکل ترین معیار پر پورے اترے۔

ذمہ داری کو اپنے اوپر لے لینا

غزوۂ ذات السلاسل کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً ایک دستہ حضرت عمرو بن العاص کی سرداری میں بھیجا۔ یہ جگہ شام کے اطراف میں تھی۔ حضرت عمرو بن العاص نے وہاں پہنچ کر دشمن کی تیاریوں کا حال معلوم کیا تو اپنا دستہ انھیں اس کے لئے ناکافی معلوم ہوا۔ انھوں نے ایک مقام پر ٹھہر کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ موجودہ فوج ناکافی ہے، مزید کمک روانہ کی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین میں سے دو سو آدمیوں کا دستہ تیار کیا اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کی سرکردگی میں اس کو روانہ فرمایا۔

حضرت ابوعبیدہ جب اپنے دستہ کو لے کر منزل پر پہنچے اور دونوں دستے ساتھ ہوگئے تو یہ سوال پیدا

ہوا کہ دونوں دستوں کا امیر کون ہو۔ حضرت عمرو بن العاص نے کہا کہ دوسرا دستہ میری مدد کے لئے بھیجا گیا ہے اس لئے اصلاً میں ہی دونوں کا امیر ہوں۔ حضرت ابو عبیدہ کے ساتھی اس سے متفق نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یا تو ابو عبیدہ دونوں دستوں کے مشترک امیر ہوں یا دونوں دستوں کا امیر الگ الگ رہے۔ جب اختلاف بڑھا تو ابو عبیدہ بن الجراح نے کہا: اے عمرو، جان لو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے جو آخری عہد لیا وہ یہ تھا کہ آپ نے کہا کہ جب تم اپنے ساتھی سے ملو تو ایک دوسرے کی بات ماننا اور اختلاف نہ کرنا۔ اس لئے خدا کی قسم اگر تم میری نافرمانی کروگے تب بھی میں تمہاری اطاعت کروں گا (تعلم یا عمرو ان آخر ما عهد الیّ رسول الله صلی الله علیه وسلم ان قال: اذا قدمت علی صاحبك فتطاوعا ولا تختلفا۔ وانك والله ان عصیتنی لاطعتك، رواه البیهقی وابن عساکر)

حضرت ابو عبیدہ کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ ذمہ داری کو عمرو بن العاص پر ڈال کر ان سے لامتناہی بحث کرتے رہیں۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو وہ بہت سے ایسے الفاظ پا سکتے تھے جن میں ان کا اپنا وجود بالکل درست اور دوسرے کا وجود بالکل باطل دکھائی دے۔ مگر اس کے بجائے انھوں نے یہ کیا کہ ساری ذمہ داری خود اپنے اوپر لے لی۔ انھوں نے مسئلہ کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیا۔ اجتماعی زندگی میں یہ چیز بے حد ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی اجتماعی زندگی چلتی ہی اس وقت ہے جب کہ اس کے افراد میں اتنی بلندی ہو کہ وہ حقوق کی بحث میں پڑے بغیر اپنے اوپر ذمہ داری لینے کی جرأت رکھتے ہوں۔ جہاں یہ مزاج نہ ہو وہاں صرف آپس کا اختلاف جنم لیتا ہے نہ کہ آپس کا اتحاد۔

شکایات سے اوپر اٹھ کر سوچنا

خالد بن الولید بے حد بہادر تھے۔ ان کے اندر غیر معمولی فوجی قابلیت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر حضرت ابوبکر کی خلافت تک وہ مسلسل اسلامی فوج کے سردار رہے۔ تاہم حضرت عمر کو ان کی بعض عادتیں پسند نہ تھیں۔ چنانچہ انھوں نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ ان کو سرداری کے عہدہ سے ہٹا دیا جائے۔ مگر حضرت ابوبکر نے ان کے مشورہ کو نہیں مانا۔ مگر حضرت عمر کو اپنی رائے پر اتنا اصرار تھا کہ جب وہ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے حضرت خالد کو سرداری سے معزول کر کے ایک معمولی سپاہی کی حیثیت دے دی۔

اس وقت حضرت خالد شام کے علاقہ میں فتوحات کے کارنامے دکھا رہے تھے۔ عین اس وقت خلیفہ ثانی نے انھیں معزول کر کے ابو عبیدہ بن الجراح کو ان کے اوپر سردار لشکر بنا دیا۔ اس کے بعد فوجیوں کی ایک تعداد خالد بن ولید کے خیمہ میں جمع ہوئی اور ان سے کہا کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں، آپ خلیفہ کا حکم نہ مانیے۔ مگر حضرت خالد نے سب کو رخصت کر دیا اور کہا کہ میں عمر کے لئے نہیں لڑتا بلکہ عمر کے رب کے لئے لڑتا ہوں (انی لا اقاتل

فی سبیل عمر ولکن اقاتل فی سبیل رب عمر) وہ پہلے سردار لشکر کی حیثیت سے لڑتے تھے اور اب ایک ماتحت فوجی کی حیثیت سے لڑنے لگے۔

اس قسم کا کردار اسی وقت ممکن ہے جب کہ آدمی اتنا اونچا ہو جائے کہ وہ شکایتوں اور تلخیوں سے اوپر اٹھ کر سوچے اس کا رویہ ردعمل کے طور پر نہ بنے بلکہ مثبت فکر کے تحت بنے۔ وہ اللہ میں جینے والا ہو نہ کہ انسانی باتوں میں جینے والا۔

قانونی حد سے آگے بڑھ کر ساتھ دینا

شعبان ۲ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی کہ قریش کے تمام سرداروں کی رہنمائی میں ایک ہزار کا لشکر مدینہ کی طرف حملہ کرنے کے لئے بڑھ رہا ہے۔ اس میں چھ سو زرہ پوش تھے اور اسی کے ساتھ ایک سو سواروں کا خصوصی دستہ بھی شامل تھا۔ یہ ایک بہت نازک وقت تھا۔ آپ نے مدینہ کے انصار اور مہاجرین کو جمع کیا اور ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے یہ سوال رکھا کہ ایسی حالت میں کیا کرنا چاہئے، حسب معمول اولاً مہاجرین کے ممتاز افراد اٹھے اور انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، آپ کا رب جس بات کا حکم دے رہا ہے اس کی طرف بڑھئے، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم یہود کی طرح یہ کہنے والے نہیں ہیں کہ تم اور تمہارا خدا جا کر لڑیں، ہم یہاں بیٹھے ہیں بلکہ ہمارا کہنا یہ ہے کہ آپ اور آپ کا خدا چل کر لڑیں، ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ جب تک ہم میں سے ایک آنکھ بھی گردش کر رہی ہے ہم آپ کا ساتھ چھوڑنے والے نہیں۔

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین کی اس قسم کی تقریروں کے باوجود بار بار یہ فرما رہے تھے کہ لوگو مجھے مشورہ دو (اشیروا علیّ ایھا الناس) چنانچہ سعد بن معاذ کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، شاید آپ کا رخ ہماری طرف ہے۔ آپ نے کہا، ہاں، اس پر سعد بن معاذ نے انصار کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا: ہم آپ پر ایمان لائے، آپ کی تصدیق کی، اور اس بات کی گواہی دی کہ جو کچھ آپ لائے ہیں، وہ حق ہے، اور اس پر آپ سے سمع وطاعت کا پختہ عہد باندھ چکے ہیں، بس اے خدا کے رسول، آپ جو کچھ چاہتے ہیں اس کو کر گزرئے، ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر آپ ہمیں لے کر سمندر کے سامنے جا پہنچیں اور اس میں گھس جائیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ سمندر میں گھس جائیں گے۔ ہم میں سے ایک آدمی بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہم کو ہرگز یہ ناگوار نہیں ہے کہ آپ ہمیں لے کر کل کے دن دشمن سے ٹکرا جائیں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہنے والے ہیں۔ مقابلہ کے وقت سچے اترنے والے ہیں۔ شاید اللہ تعالیٰ آپ کو ہم سے وہ کچھ دکھائے جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ پس اللہ کی برکت کے بھروسے پر آپ ہم کو لے کر چلیں۔ (سیرت ابن ہشام)

انصار کے قائد کی اس تقریر کے بعد اقدام کا فیصلہ کر لیا گیا۔

بدر کی جنگ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بار بار انصار کی طرف رخ کرنا بے سبب نہ تھا۔ اس کا ایک خاص پس منظر تھا۔ ابن ہشام اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

وذلك انهم حين بايعوه بالعقبة قالوا: يارسول الله، إنا بُرَاءٌ من ذِمامِك حتّى تصلَ إلى ديارنا، فاذا وصلت إلينا فأنت في ذمّتنا نمنعك مما نمنع منه أبناءنا ونساءنا، فكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يتخوف الا تكون الانصار ترى عليها نصره الا ممن دهمه بالمدينة من عدوه، وأن ليس عليهم ان يسير بهم الى عدوٍ من بلادهم، (سیرۃ ابن ہشام، جزء ثانی، صفحہ ۲۵۳)

اور ایسا اس لئے ہوا کہ انصار نے جب عقبہ میں بیعت کی تھی تو انھوں نے کہا تھا کہ اے خدا کے رسول، ہم آپ کی ذمہ داری سے بری ہیں یہاں تک کہ آپ ہمارے دیس میں پہنچ جائیں۔ جب آپ ہمارے پاس آجائیں گے تو آپ ہماری ذمہ داری میں ہوں گے اور ہم آپ کا دفاع کریں گے جس طرح ہم اپنے لڑکوں اور عورتوں کا دفاع کرتے ہیں۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اندیشہ تھا کہ انصار کہیں یہ سمجھتے ہوں کہ ان پر آپ کی مدد کرنا اس وقت ہے جب کہ آپ کا دشمن مدینہ پہنچ کر حملہ کرے۔ ان پر یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اپنی بستی سے دور جاکر مقابلہ کریں۔

انصار کی بیعت قدیم عربی اصطلاح کے مطابق بیعت نسار (دفاعی بیعت) تھی۔ اس کے مطابق مدینہ سے ۸۰ میل دور بدر کے مقام پر جاکر لڑنا ان کے لئے ضروری نہ تھا۔ مگر انصار نے اس کو اپنے لئے عذر نہیں بنایا۔ وہ قانونی حد کو توڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے اور بدر کے میدان میں جاکر قربانی پیش کی۔

اختلاف سے بچ کر اصل نشانہ پر لگے رہنا

اخرج الطبراني عن المسور بن مخرمة قال: خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم على اصحابه فقال ان الله بعثني رحمة للناس كافة فادوا عني رحمكم الله، ولا تختلفوا كما اختلف الحواريون على عيسى بن مريم فانه دعاهم الى مثل ما ادعوكم اليه فامامن بَعُدَ مكانه فكرهه فشكا عيسى بن مريم ذلك الى الله عزوجل ـ ـ ـ ـ فقال اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم نحن يا رسول الله نؤدّي اليك فابعثنا حيث شئت

مسور بن مخرمہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے سامنے تقریر کی اور فرمایا کہ اللہ نے مجھ کو تمام انسانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ پس تم میری طرف سے اس ذمہ داری کو ادا کرو۔ خدا تم پر رحم کرے اور تم لوگ اختلاف نہ کرنا جس طرح عیسیٰ بن مریم کے حواریوں نے اختلاف کیا۔ انھوں نے اپنے حواریوں کو اسی چیز کے لئے پکارا جس کی طرف میں تم کو پکار رہا ہوں۔ پس جس کا مقام دور تھا اس کو وہاں جانا ناگوار ہوا تو عیسیٰ بن مریم نے اللہ تعالیٰ سے اس کی شکایت کی۔ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے کہا کہ اے خدا کے
رسول ہم آپ کی ذمہ داری کو ادا کریں گے۔ آپ ہم کو بھیجئے
جہاں آپ چاہیں۔

اجتماعی کام میں رکاوٹ ڈالنے والی سب سے بڑی چیز اختلاف ہے۔ مگر صحابہ کرام کو اللہ کے خوف نے اتنا بے نفس بنا دیا تھا کہ وہ اختلافات سے بلند ہو کر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں لگے رہتے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ کے زمانے میں انھوں نے عرب میں اور اطراف عرب میں آپ کی منشا کے مطابق اسلام کی دعوت پوری طرح پہنچائی۔ آپ کی وفات کے بعد وہ مال وجاہ کے حصول میں نہیں پڑے بلکہ اطراف کے ملکوں میں پھیل گئے۔ ہر صحابی کا گھر اس زمانہ میں ایک چھوٹا مدرسہ بنا ہوا تھا جہاں وہ صرف اللہ کی رضا کے لئے لوگوں کو عربی سکھاتے اور قرآن وسنت کی تعلیم دیتے۔ اس زمانہ میں ایک طرف مسلمانوں کا ایک طبقہ فتوحات اور سیاسی انتظامات میں لگا ہوا تھا۔ عام طریقہ کے مطابق اصحاب رسول کو اپنا سیاسی حصہ لینے میں سرگرم ہونا چاہئے تھا۔ مگر وہ اس سے بے پروا ہو گئے۔ انھوں نے اسلامی فتوحات کے ذریعہ پیدا ہونے والی فضا کو تبلیغ دین کے لئے استعمال کیا، اس طرح ان کے اور ان کے شاگردوں کے خاموش پچاس سالہ عمل کے نتیجہ میں وہ جغرافی خطہ وجود میں آیا جس کو عرب دنیا کہا جاتا ہے، جہاں لوگوں نے نہ صرف اپنے دین کو بدلا بلکہ ان کی زبان اور ان کی تہذیب بھی بدل گئی۔

۲۔ پچھلی نشست پر بیٹھنے کے لئے راضی ہو جانا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو سب سے پہلا مسئلہ خلیفہ کا انتخاب تھا۔ انصار بنو ساعدہ کی چوپال (سقیفہ) میں جمع ہو گئے۔ اس وقت سعد بن عبادہ انصار کے سب سے زیادہ ابھرے ہوئے سردار تھے۔ چنانچہ انصار میں بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ سعد بن عبادہ کو خلیفہ مقرر کیا جانا چاہئے۔ مہاجرین کو یہ خبر ملی تو ان کے ممتاز افراد تیزی سے چل کر مذکورہ مقام پر پہنچے۔ حضرت ابو بکر نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

أما ما ذكرتم فيكم من خيرٍ فأنتم له اهل، ولن تعرف العرب هذا الأمر الا لهذا الحي من قريش: هم اوسط العرب نسبًا ودارًا، وقد رضيت لكم احد هذين الرجلين فبايعوا ايهما شئتم

(سیرۃ ابن ہشام، جزء رابع صفحہ ۳۳۹)

(اے انصار) تم نے اپنی جس فضیلت کا ذکر کیا ہے اس کے تم اہل ہو۔ مگر عرب اس معاملہ (امارت) کو قریش کے سوا کسی اور قبیلہ کے بارے میں نہیں جانتے۔ وہ عربوں میں نسب اور مقام کے اعتبار سے سب سے بہتر ہیں۔ میں تمھارے لئے ان دو آدمیوں (عمر اور ابو عبیدہ بن الجراح) میں سے کسی ایک پر راضی ہوں۔ تم دونوں میں سے جس سے چاہو بیعت کر لو

اس کے بعد حضرت عمر اٹھے اور انھوں نے فوراً حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرلی اور پھر تمام مہاجرین نے بیعت کی۔ اس کے بعد انصار نے بھی حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ تاہم انصار کے ایک طبقہ کے لئے یہ واقعہ اتنا سخت تھا کہ ایک شخص نے مہاجرین سے کہا کہ تم لوگوں نے سعد ابن عبادہ کو قتل کردیا (قتلتم سعد ابن عبادہ)

انصار نے اسلام کے لئے بے پناہ قربانیاں دی تھیں۔ انھوں نے اسلام کے بے یار و مددگار قافلہ کو اس وقت پناہ دی جب کہ انھیں اپنے وطن سے نکلنے پر مجبور کردیا گیا تھا۔ اس کے باوجود انصار اس فیصلہ پر راضی ہوگئے کہ اقتدار میں ان کا حصہ نہ ہو اور خلیفہ صرف مہاجرین (قریش) میں سے منتخب کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے پیچھے بہت گہری مصلحت تھی۔ قریش سیکڑوں سال سے عرب کے قائد بنے ہوئے تھے۔ ایسی حالت میں اگر کسی غیر قریش کو خلیفہ مقرر کیا جاتا تو اس کے لئے اجتماعی نظم کو سنبھالنا ناممکن ہو جاتا۔ یہ انصار کی حقیقت پسندی تھی کہ انھوں نے اپنی اس کمی کو جانا اور یک طرفہ فیصلہ پر راضی ہوگئے۔ تاہم یہ حقیقت پسندی کی اتنی نایاب قسم ہے کہ اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

غیر جذباتی فیصلہ کرنے کی طاقت

احد کی لڑائی اسلام کی تمام جنگوں میں سب سے زیادہ سخت لڑائی تھی۔ قریش کے تمام جنگی جوان غصہ میں بھرے ہوئے مسلمانوں کے اوپر ٹوٹ پڑے تھے۔ عین اس وقت جب کہ قتل و خون کا معرکہ گرم تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار ہاتھ میں لی اور کہا کہ کون اس تلوار کو اس کے حق کے ساتھ لے گا۔ کچھ لوگ آپ کی طرف بڑھے۔ مگر آپ نے انھیں تلوار نہ دی۔ پھر ابودجانہ سامنے آئے اور پوچھا کہ اے خدا کے رسول اس تلوار کا حق کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم اس سے دشمن کو مارو یہاں تک کہ اس کو ٹیڑھا کردو (ان تضرب به العدو حتى ينحنى) ۔ ابودجانہ نے کہا کہ میں اس کو اس کے حق کے ساتھ لیتا ہوں۔ چنانچہ آپ نے انھیں تلوار دے دی۔

حضرت ابودجانہ تلوار لے کر چلے۔ اس وقت ان پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ وہ اکڑ کر چلنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ اس قسم کی چال خدا کو پسند نہیں سوا ایسے موقع کے (انها لمشية يبغضها الله الا فى مثل هذا الموطن)

ابودجانہ نے اپنے سر پر لال کپڑا باندھ لیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ موت سے نڈر ہو کر جنگ کے لئے نکل پڑے ہیں۔ وہ انتہائی بہادری کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ جو بھی ان کے سامنے آتا وہ ان کی تلوار کا نشانہ بن جاتا۔ اس کے بعد ایک حیرت انگیز واقعہ ہوا جس کو خود ابودجانہ ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

رايت انسانا يحمش الناس حمشا شديدا میں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ بری طرح لوگوں کو جنگ

فصمدت لهٗ فلما حملت علیہ السیف ولول فاذا امرأۃ فاکرمت سیف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اضرب بہ امرأۃ
(سیرت ابن ہشام جزء ۳، صفحہ ۱۴)

پرابھار رہا تھا۔ میں اس کی طرف لپکا۔ جب میں نے اس پر تلوار اٹھائی تو اس نے کہا یا ویلاہ (ہائے تباہی) اب میں نے جانا کہ یہ ایک عورت ہے۔ تو میں نے خدا کے رسول کی تلوار کو اس سے پاک رکھا کہ اس سے میں کسی عورت کو قتل کروں

اس واقعہ کو ایک صحابی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: پھر میں نے دیکھا کہ ان کی تلوار ہند بنت عتبہ کے سر پر اٹھ گئی ہے مگر اس کے بعد انھوں نے اپنی تلوار اس سے ہٹالی (ثم رایتہ قد حمل السیف علی مفرق راس ھند بنت عتبۃ، ثم عدل السیف عنھا) جنگ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات میں سے ایک ہدایت یہ تھی کہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو نہ مارا جائے۔ حضرت ابو دجانہ نے عین قتل وخون کے ہنگامہ میں اس کو یاد رکھا اور اپنی چلی ہوئی تلوار کو درمیان سے روک لیا۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصحاب رسول کو اپنے جذبات پر کتنا زیادہ قابو تھا۔ ان کے افعال ان کے شعور کے ماتحت تھے نہ کہ ان کے جذبات کے ماتحت۔ وہ انتہائی اشتعال انگیز موقع پر انتہائی ٹھنڈا فیصلہ کر سکتے تھے۔ وہ غصہ اور انتقام کی آخری حد پر پہنچ کر بھی اچانک اپنا ذہن تبدیل کر سکتے تھے۔ وہ ایک رخ پر پوری رفتار سے چل پڑنے کے بعد معاً اپنا رخ دوسری طرف پھیر سکتے تھے۔ یہ بظاہر ایک سادہ سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر عملاً وہ اتنی زیادہ مشکل ہے کہ اس پر کوئی ایسا شخص ہی قادر ہو سکتا ہے جو خدا سے اس طرح ڈرنے والا ہو گویا خدا اپنے تمام جلال وجبروت کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا ہوا ہے اور وہ اس کو اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

درخت کی طرح آگے بڑھنا

قرآن میں انجیل اور تورات کے دو حوالوں کا ذکر ہے۔ تورات کا حوالہ صحابۂ کرام کے انفرادی اوصاف سے متعلق ہے۔ اس کے بعد انجیل کے حوالے سے ان کی اجتماعی صفت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

ومثلھم فی الانجیل کزرع اخرج شطئہٗ فآزرہ فاستغلظ فاستوی علی سوقہ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار وعد اللہ الذین آمنوا وعملوا الصالحات منھم مغفرۃ واجرا عظیما
(الفتح۔ آخر)

اور انجیل میں ان کی مثال یوں ہے کہ جیسے ایک کھیتی ہو۔ اس نے نکالا اپنا انکھوا۔ پھر اس کو مضبوط کیا۔ پھر وہ موٹا ہوا۔ پھر اپنے تنہ پر کھڑا ہو گیا۔ اچھا لگتا ہے کسانوں کو تاکہ منکروں کا دل ان سے جلائے۔ اللہ نے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کئے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

موجودہ انجیل میں یہ تمثیل ان لفظوں میں ہے ـــــ اور اس نے کہا، خدا کی بادشاہی ایسی ہے جیسے کوئی

آدمی زمین میں بیج ڈالے اور رات کو سوئے اور دن کو جاگے۔ اور وہ بیج اس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے۔ زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے۔ پتی، پھر بالیں، پھر بالوں میں تیار دانے۔ پھر جب اناج پک چکا تو وہ فی الفور درانتی لگاتا ہے۔ کیونکہ کاٹنے کا وقت آپہنچا (مرقس ۴: ۲۶-۳۲)

انجیل اور قرآن کی اس تمثیل میں یہ بتایا گیا ہے کہ پیغمبر آخرالزماں کے اصحاب کا اجتماعی ارتقاء درخت کی مانند ہوگا۔ اس کا آغاز بیج سے ہوگا، پھر وہ دھیرے دھیرے بڑھے گا اور اپنا تنہ مضبوط کرتے ہوئے اوپر اٹھے گا۔ یہاں تک کہ فطری رفتار سے تدریجی ترقی کرتے ہوئے اپنے کمال کو پہنچ جائے گا۔ اس کی ترقی اتنی شاندار ہوگی کہ ایک طرف اہل ایمان اس کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوں گے اور دوسری طرف دشمن دانت پیس رہے ہوں گے کہ اس کا معاملہ اتنا مضبوط ہے کہ اس کے خلاف ہمارا کچھ بس نہیں چلتا۔

اسلام کو درخت کی طرح ترقی دینے کے لئے خدا کا یہ منصوبہ تھا جو صحابہ کرام کے ذریعہ انجام پایا۔ تاہم یہ کوئی آسان معاملہ نہ تھا۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ وہ جلد بازی کے بجائے صبر کو اپنا طریقہ بنائیں۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ فوری محرکات کے تحت وہ کوئی اقدام نہ کریں۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ وہ اپنے ذوق پر چلنے کے بجائے قوانین فطرت کی پیروی کریں۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ وہ اس سے بے پرواہ ہو کر کام کریں کہ نتیجہ ان کی زندگی میں سامنے آتا ہے یا ان کے بعد۔ "درخت اسلام" کو اگانے کے لئے ضرورت تھی کہ وہ اپنے جذبات کو کچلیں اور اپنی امنگوں کو دفن کر دیں۔ صحابہ کرام نے یہ سب کچھ کیا۔ انھوں نے کسی تحفظ کے بغیر اپنے آپ کو خدائی اسکیم کے حوالہ کر دیا۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ زمین میں خدا کا دین ایک ایسے ابدی باغ کی صورت میں کھڑا ہو گیا جس کو ساری دنیا مل کر بھی مٹانا چاہے تو نہ مٹا سکے۔

حصّہ چہارم

حصّه چهارم

اظہار رسالت عہدِ حاضر میں

پیغمبر اسلام کو خصوصی طور پر اظہار کی نسبت دی گئی ہے۔ آپ کے دین کے لئے مقدر کر دیا گیا ہے کہ وہ تمام ادیان پر غالب و سربلند ہو۔ یہی نسبت غلبہ آپ کی امت کو بھی حاصل ہے۔ پیغمبر اسلام کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا کہ ڈھائی ہزار سال کے ایک خصوصی منصوبہ کے ذریعہ وہ اسباب فراہم کئے جن کو استعمال کر کے آپ دین خدا کو غالب وظاہر کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ آپ کی امت کے ساتھ ہے۔ چنانچہ پچھلے ہزار سال کے عمل کے نتیجہ میں خدا نے وہ موافق حالات کامل طور پر فراہم کر دئے ہیں جو دور جدید میں اسلام کے غلبہ کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ پیغمبر کے امتی اگر ان موافق حالات کو حکمت اور صبر کے ساتھ استعمال کریں تو خدا کا وعدۂ نصرت دوبارہ پیغمبر کے امتیوں پر اسی طرح واقعہ بن سکتا ہے جس طرح وہ خود پیغمبر کے اوپر واقعہ بنا تھا۔

امریکہ سے ایک انسائیکلوپیڈیا چھپی ہے جس کا نام ہے: انسان اور اس کے معبود (Man and his Gods) اس کتاب میں مختلف مذاہب پر مقالے ہیں۔ اسلام پر جو مقالہ ہے، اس کے عیسائی مقالہ نگار نے اسلامی انقلاب کے بعد پیدا ہونے والے عظیم نتائج کے بارے میں یہ الفاظ لکھے ہیں —— اس کے ظہور نے انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دیا:

Its advent changed the course of human history (p. 389)

یہ ایک مستشرق کی زبان سے اسلامی انقلاب کی پیدا کردہ ان تبدیلیوں کا اعتراف ہے جنھوں نے تاریخ میں ایسے دور رس امکانات کھولے جن کے بعد اسلام کو غیر اسلامی ادیان پر غالب و برتر کرنا اسی طرح آسان ہو گیا ہے جس طرح بارش آجانے کے بعد کھیت سے فصل اگانا۔

پیغمبر آخر الزماں اور آپ کے ساتھیوں کے ذریعہ جو انقلاب برپا کیا گیا وہ اگرچہ اصلاً توحید اور آخرت پر مبنی ایک دینی انقلاب تھا۔ مگر اس نے بہت سے دور رس دنیوی نتائج بھی پیدا کئے۔ آپ کے لائے ہوئے انقلاب کے دنیوی نتائج میں سب سے اہم وہ نتائج ہیں جنھوں نے قدیم زمانہ کے سماجی اور اجتماعی نظام کو اس طرح بدل دیا کہ وہ حالات ہی ختم ہو گئے جن میں دعوت حق کا کام ایک انتہائی مشکل کام بنا ہوا تھا

سورہ براءۃ نازل ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو مکہ

بھیجا تاکہ وہ اعلان کردیں کہ اس سال کے بعد کسی مشرک کو حج بیت اللہ کی اجازت نہ ہوگی۔ حضرت علی کہتے ہیں کہ میں حج کے اجتماعات میں بلند آواز سے اس کا اعلان کرتا پھرتا تھا، یہاں تک کہ میری آواز بھاری ہو گئی (فکنت انادی حتی صحل صوتی، تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۱۲۴) مگر آج لاؤڈ اسپیکر وجود میں آنے کے بعد یہ مسئلہ کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں اعلان حق کا کام کتنا زیادہ آسان ہو چکا ہے۔

دین کی دعوت کے دو بڑے دور ہیں۔ ایک، پیغمبر آخر الزماں کے ظہور سے پہلے۔ دوسرا، پیغمبر آخر الزماں کے ظہور کے بعد۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے خدا کی جو کتابیں آئیں ان کی حفاظت کی ذمہ داری خود ان امتوں پر ڈالی گئی جن کے پاس وہ کتابیں بھیجی گئی تھیں۔ چنانچہ ان کے بارے میں قرآن میں استحفاظت (طلب حفاظت) کا لفظ آیا ہے (بما استُحفظوا من کتاب اللہ وکانوا شہداء، المائدہ ۴۴) مگر قرآن کی حفاظت کے بارے میں فرمایا گیا کہ خدا نے اس کتاب کو اتارا ہے اور وہی اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے (انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون، الحجر ۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ خدا کا یہ منصوبہ تھا کہ شرک کو مغلوب کیا جائے اور توحید کو دنیا میں غالب فکر کا مقام عطا کیا جائے (الانفال ۳۹) یہ کام اتنے مختلف اسباب کی مساعدت چاہتا ہے جو صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔ چنانچہ اللہ نے ڈھائی ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں وہ موافق حالات پیدا کئے جن کو استعمال کرکے آپ نے شرک کو مغلوب کیا اور توحید کو فکری غلبہ کے مقام پر پہنچایا۔

رسول اور اصحاب رسول کی کوششوں سے جو انقلاب آیا اس کے بعد شرک ہمیشہ کے لئے مغلوب ہو گیا۔ اب اس کی کوئی امید نہیں کہ شرک دوبارہ ایک غالب فکر کی حیثیت سے دنیا میں چھا سکے۔ تاہم موجودہ زمانہ میں دوبارہ یہ واقعہ ہوا کہ توحید نے غالب فکر کی حیثیت سے اپنا مقام کھو دیا۔ اس بار یہ واقعہ الحاد کے ہاتھوں سے ہوا۔ چنانچہ آج کی دنیا میں الحاد نے غالب فکر کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ بے خدا ذہن یا سیکولر ذہن آج دنیا کا غالب ذہن ہے۔ اس کے مقابلہ میں توحید کا ذہن عملاً دوسرے درجہ پر چلا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو یقیناً معلوم تھا کہ آئندہ دور الحاد آنے والا ہے۔ اس لئے اس کی نصرت دوبارہ متحرک ہوئی۔ پچھلے ہزار سالہ عمل کے دوران اس نے دوبارہ ایسے حالات پیدا کرنے شروع کئے جو بالآخر غلبہ توحید کی جدوجہد کے لئے موافق زمین کا کام کرسکیں۔ یہ عمل اب اپنی تکمیل کے مرحلہ میں پہنچ گیا ہے۔

آج اگرچہ بظاہر الحاد کا غلبہ ہے مگر وہ موافق حالات پوری طرح پیدا ہو چکے ہیں جن کو استعمال کر کے دوبارہ توحید کو غالب فکر کا مقام دیا جا سکے۔

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تقریباً چار ہزار سال پہلے قدیم عراق کے دارالسلطنت (اُر) کے لوگوں کو پکارا کہ ایک خدا ہے جو نفع و نقصان کا مالک ہے۔ خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اسی لئے تم اسی سے حاجتیں مانگو اور اسی کی پرستش کرو۔ اس دعوت توحید کے خلاف اس وقت کے مشرک بادشاہ نمرود کلدانی نے اتنا سخت ردعمل ظاہر کیا کہ آپ کو آگ کے الاؤ میں ڈال دیا۔ آج بھی دنیا کے ہر ملک میں شرک کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ لیکن آج آپ کسی ملک میں دعوت ابراہیمی کو لے کر اٹھیں تو موجودہ زمانہ کا کوئی حکمراں آپ کے ساتھ اس قسم کا شدید سلوک نہیں کرے گا۔

اس کی وجہ فلسفۂ حکومت کی تبدیلی ہے۔ نمرود کے زمانہ میں شرک ایک سیاسی عقیدہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب کہ آج وہ صرف ایک محدود مذہبی عقیدہ ہے۔ قدیم زمانہ میں عام طور پر مشرکانہ نظریۂ سیاست دنیا میں رائج تھا۔ نمرود، دور قدیم کے دوسرے بادشاہوں کی طرح، اسی قسم کے نظریہ کی بنیاد پر حکومت کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ سورج دیوتا کا مظہر ہے، اس لئے وہ دوسروں سے برتر ہے اور اس کو دوسروں کے اوپر حکمرانی کرنے کا فوق الفطری حق حاصل ہے۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے حکمراں اس قسم کے نظریہ حکومت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ انھوں نے عوامی رائے کی بنیاد پر اپنے لئے حکمرانی کا حق حاصل کیا ہے نہ کہ کسی فوق الفطری عقیدہ کی بنیاد پر۔ یہی وجہ ہے کہ توحید کی دعوت میں موجودہ حکمرانوں کو اپنے اقتدار کے لئے کوئی چیلنج نظر نہیں آتا۔ جب کہ نمرود اور دور قدیم کے دوسرے بادشاہوں کو توحید کا عقیدہ پھیلنے میں اپنی سیاسی جڑ کٹتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

قدیم زمانہ میں جب کوئی پیغمبر اٹھتا تو اکثر پہلے ہی مرحلہ میں وقت کے اقتدار سے اس کا ٹکراؤ شروع ہو جاتا اور غیر ضروری قسم کی مشکلات اس کی راہ میں حائل ہو جاتیں۔ اس کی وجہ سیاسی ادارہ کے ساتھ فوق الطبیعی عقائد کی یہی وابستگی تھی۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ عوام کو یہ یقین دلا کر ان کے اوپر حکومت کرتے تھے کہ وہ دیوتاؤں کی اولاد ہیں، خدا ان کے اندر حلول کر آیا ہے۔ ایسے ماحول میں جب توحید خالص کی آواز بلند ہوتی تو ان کو نظر آتا کہ وہ ان کے سیاسی استحقاق کو بے اعتبار بنا رہی ہے۔ یہ اعتقادی پیچیدگی ان کو داعیٔ حق سے ٹکرا دیتی تھی۔ اسلام نے ثابت کیا کہ ہر قسم کی فوق الفطری حیثیت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ تمام انسان برابر ہیں،

ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ اس طرح اسلام نے سیاسی ادارہ کو اعتقادیات سے جدا کر دیا۔ اب حکومت کرنے کا حق کسی کو عوامی رائے سے ملتا تھا نہ کہ خدا سے کسی قسم کے پُر اسرار رشتہ کی بنیاد پر۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے قدیم زمانہ میں کچھ لوگ یہ بات مشہور کر کے اپنا طبی کاروبار چلاتے تھے کہ انھوں نے ایک جن کو مسخر کر رکھا ہے اور وہ ان کے پاس آکر ان کو فن طب کے رموز بتا جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں اگر کوئی شخص یہ آواز بلند کرے کہ علم طب میڈیکل کالج میں سکھایا جاتا ہے نہ کہ جنات کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے تو مذکورہ قسم کے طبیب ایسے شخص کے سخت مخالف ہو جائیں گے۔ مگر موجودہ زمانہ کے ایم بی بی ایس ڈاکٹر کو ایسی تحریک سے کوئی عداوت نہ ہوگی۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے انقلاب کے ذریعہ تاریخ کا رخ موڑنے کا عمل ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا۔ اب وہ اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ دین کے داعیوں کے لئے اب خود انسانی اسلحہ خانہ میں ہر قسم کے تائیدی اسباب موجود ہیں۔ جدید قانونی اور سماجی تبدیلیوں نے اب اس کا موقع دے دیا ہے کہ دعوت دین کا کام کھلے طور پر کیا جائے اور کوئی فرعون یا نمرود اس کا راستہ روکنے کے لئے میدان میں موجود نہ ہو۔ حقائق کی دنیا جو اب انسان کے علم میں آئی ہے اس نے ایسے دلائل جمع کر دئے ہیں جو دین کی صداقت کو خالص علمی طور پر ثابت شدہ بنا سکیں۔

موجودہ زمانہ میں ایک عظیم فکری انقلاب آیا ہے۔ یہ انقلاب وہی ہے جس کو عام طور پر سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔ جدید سائنسی انقلاب نے انسانی تاریخ میں پہلی بار ایسی فکری تبدیلیاں پیدا کی ہیں جو دعوت توحید کے عین موافق ہیں۔ ان کو مناسب طور پر استعمال کیا جائے تو صرف قلمی اور لسانی تبلیغ کے ذریعہ غلبۂ توحید کا وہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے جس کے لئے پچھلے زمانوں میں تلوار اٹھانی پڑتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنسی انقلاب زمانۂ رسالت کے اسلامی انقلاب کا ایک ضمنی حاصل (By-product) ہے۔ اللہ نے پیغمبر آخر الزماں کے لائے ہوئے انقلاب کے ذریعہ ایسے اسباب پیدا کئے جنھوں نے تاریخ کے اندر اپنا عمل شروع کیا۔ تبدیلی کا یہ عمل مسلسل جاری رہا۔

یہاں تک کہ وہ اس انقلاب تک پہنچا جس کو جدید سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔ گویا خدا نے صدر اول میں شرک کے اوپر توحید کو غلبہ دیا تو اسی کے اندر وہ اسباب بھی پیدا کر دئے جو بعد کے زمانہ میں الحاد پر توحید کو غالب کرنے میں مددگار بن سکیں۔

اسلام کے ذریعہ آنے والے توحیدی انقلاب سے پہلے ساری دنیا میں شرک کا غلبہ تھا۔ شرک دراصل مظاہر پرستی کا دوسرا نام ہے۔ دنیا کی ہر چیز جو نمایاں نظر آئی اسی کو انسان نے پوجنا شروع کر دیا، خواہ وہ آسمان کا سورج ہو یا زمین کا بادشاہ۔ اس کی وجہ سے دور شرک میں سائنسی تحقیق کا کام ممکن نہ ہو سکا۔ آرنلڈ ٹوائن بی کے الفاظ میں، فطرت کے مظاہر اس وقت پرستش کا موضوع (Object of Worship) بنے ہوئے تھے، پھر وہ تحقیق کا موضوع (Object of Investigation) کیسے بنتے۔ اسلام نے شرک کو مغلوب کر کے توحید کو غالب کیا تو ایک خدا کے سوا ہر چیز مخلوق نظر آنے لگی، اس انقلاب نے یہ ممکن بنا دیا کہ چیزوں پر تحقیق کا عمل جاری کیا جا سکے۔ یہ عمل ابتدائی صورت میں دور اول ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ ایک بار چاند گرہن کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورج گرہن اور چاند گرہن اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ وہ کسی بڑے آدمی کی پیدائش یا موت کی بنا پر نہیں ہوتے۔ اس طرح آپ نے مادی بڑائی کی بھی نفی کر دی اور انسانی بڑائی کی بھی۔ یہ فکری لہر عقیدہ سے الگ ہو کر یورپ پہنچی اور بالآخر جدید انقلاب کا سبب بنی۔

۱۔ اس انقلاب کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ توہماتی دور کا خاتمہ ہو گیا۔ توہم پرستی کیا ہے۔ توہم پرستی نام ہے حقائق کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کے بجائے مفروضات وقیاسات کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کا۔ (مثلاً یہ فرض کر لینا کہ جب کسی بڑے آدمی کی موت ہوتی ہے تو سورج یا چاند گہنا جاتے ہیں) یہ ذہن اسلام کی طرف بڑھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ایسا آدمی حقائق واقعی کی بنیاد پر اسلام اور غیر اسلام کا جائزہ نہیں لیتا بلکہ پیشگی مفروضات کی بنیاد پر بلا دلیل ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط مان لیتا ہے۔ مثلاً اسلام تاریخی طور پر ایک مستند دین ہے اور دیگر تمام مذاہب تاریخی استناد سے محروم ہیں۔ مگر توہمات کے دور میں انسان اس کو اہمیت نہیں دے پاتا تھا۔ جدید دور نے اس کو پوری اہمیت کے ساتھ لیا۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں تنقید عالیہ (Higher Criticism) کے نام سے ایک مستقل فن وجود میں آگیا ہے۔ اس فن کے تحت یہ حقیقت پوری طرح مسلّم ہو گئی ہے کہ تاریخی طور پر معتبر دین صرف اسلام ہے۔ دوسرے ادیان کو تاریخی اعتباریت کا درجہ حاصل نہیں۔

۲۔ سائنسی ذہن نے کائنات کو تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں جاننے کی کوشش کی۔ اس کے

نیتجہ میں کائنات میں چھپے ہوئے ایسے فطری حقائق انسان کے علم میں آئے جو اسلام کی تعلیمات کی تصدیق اعلیٰ سطح پر کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر انسان کی تحقیق نے بتایا کہ کائنات میں ہر جگہ ایک ہی قانون فطرت کارفرما ہے۔ جو قانون زمین کے احوال پر حکمراں ہے وہی قانون کائنات کے دور دراز مقامات پر بھی حکمراں ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اس کائنات کا خدا صرف ایک ہے۔ دو خدا یا بہت سے خداؤں کی اس کائنات میں گنجائش نہیں۔

۳۔ دین توحید کو قدیم زمانہ میں اختیار کرنے کے لئے، ایک علمی رکاوٹ، قدیم فلسفہ بھی تھا۔ قدیم زمانہ میں فلسفہ کو غالب علم کا مقام حاصل تھا۔ تعلیم یافتہ طبقہ کے سوچنے کی ذہنی زمین اس زمانہ میں فلسفہ ہوتا تھا۔ اس کے نیتجہ میں دین توحید کی راہ میں ایک بہت بڑی مصنوعی رکاوٹ حائل ہوگئی تھی۔

قدیم فلسفہ کا آخری نشانہ ہمیشہ سے آخری سچائی کی تلاش رہا ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ تقریباً پانچ ہزار سال کی شاندار تاریخ کے باوجود فلسفہ اپنے نشانہ تک پہنچنے میں مکمل طور پر ناکام رہا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فلسفہ انسان کی محدودیتوں (Limitations) کا ادراک نہ کرسکا۔ وہ آخری سچائی تک پہنچنے کے لئے ساری کوششیں صرف کرتا رہا۔ جب کہ انسان اپنی محدود صلاحیتوں کی وجہ سے بطور خود آخری سچائی تک پہنچ ہی نہ سکتا تھا۔

اس فلسفیانہ طرز فکر کی وجہ سے ہزاروں برس تک انسان یہ چاہتا رہا کہ دین توحید کی بنیاد جن اساسی عقائد پر قائم ہے اس کو انسان کے لئے مکمل طور پر معلوم اور مشاہد بنا دیا جائے۔ مگر یہ تمام غیبی حقیقتیں تھیں اور انسان اپنی موجودہ صلاحیتوں کے ساتھ ان غیبی حقیقتوں کا کامل ادراک نہیں کرسکتا۔

جدید سائنس کا، دینی نقطۂ نظر سے، سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس مفروضہ کو ڈھا دیا۔ اس نے آخری طور پر یہ ثابت کر دیا کہ انسان کی صلاحیتیں محدود ہیں۔ وہ اپنی محدودیت کی وجہ سے حقیقت کا کلی ادراک نہیں کرسکتا۔ قدیم فلسفہ کی پیدا کردہ ذہنی زمین اب ساری دنیا میں دفاعی حیثیت کے مقام پر جاچکی ہے اور اب سائنس کی دریافت کردہ ذہنی زمین کو علمی دنیا میں غالب مقام حاصل ہے۔

ذہن کی اس تبدیلی نے دین توحید کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے۔ اب اس نقطۂ نظر کو، کم از کم بالواسطہ طور پر، مکمل علمی تائید حاصل ہے کہ انسان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ حقیقت اعلیٰ کو پانے کے لئے وہ پیغمبر کی اطلاع کا اعتبار کرے۔ اب یہ مطالبہ سراسر غیر علمی مطالبہ بن چکا ہے کہ خدا اور وحی اور آخرت کو ہماری آنکھوں سے ہمیں دکھاؤ، اس کے بعد ہی ہم اس پر ایمان لائیں گے۔

معلوم تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ خود علم انسانی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان کا علم محدود ہے

اور ہمیشہ محدود رہے گا۔ انسان سائنسی ذرائع سے جب کائنات کی کھوج کرتا ہے تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ کائنات اس سے زیادہ پیچیدہ ہے کہ انسان کا محدود ذہن اس کا احاطہ کر سکے۔ سائنس کی یہ دریافت اسلامی نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہے۔ کیونکہ اس سے رسالت کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ ایک طرف انسان کا یہ حال ہے کہ وہ حقیقت کو آخری حد تک جان لینا چاہتا ہے۔ دوسری طرف انسان اپنی بناوٹ کے اعتبار سے ایسی محدودیت کا شکار ہے کہ وہ کبھی بھی حقیقت کو آخری حد تک نہیں جان سکتا۔ انسانی زندگی کا یہ خلا واضح طور پر یہ بتاتا ہے کہ اس کو ایک برتر رہنما کی ضرورت ہے۔ اسی برتر رہنما کا دوسرا نام پیغمبر ہے۔ انسانی محدودیت کے بارے میں سائنس کے اقرار نے پیغمبر کی ضرورت کو خالص علمی سطح پر ثابت کر دیا ہے۔

۴۔ قدیم زمانہ میں انسان کو اظہار رائے کی آزادی حاصل نہ تھی۔ اس کی اصل وجہ بادشاہوں اور بڑے انسانوں کے تقدس کا عقیدہ تھا۔ جو لوگ کسی وجہ سے اونچے مقام پر پہنچ جاتے ان کو مقدس سمجھ لیا جاتا۔ ان کی رائے دوسروں سے برتر مانی جاتی۔ ان کو یہ حق مل جاتا کہ جس طرح چاہیں دوسروں کو اپنی مرضی کا پابند بنائیں۔ توحید کے انقلاب نے انسانی بڑائی کا خاتمہ کیا اور یہ اعلان کیا کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر فضیلت نہیں۔ اس کے بعد تاریخ میں ایک نئی فکری لہر چل پڑی۔ یہی وہ فکری لہر ہے جس کی سیاسی تکمیل بالآخر یورپ میں جمہوریت کی صورت میں ہوئی۔ جمہوری انقلاب نے تمام انسانوں کو برابر ٹھہرا دیا۔ ہر شخص کے لئے یہ فکری حق تسلیم کر لیا گیا کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق جو چاہے لکھے اور جو چاہے بولے۔ اس انقلاب نے تاریخ میں پہلی بار اس بات کو ممکن بنا دیا کہ خدا کے دین کی تبلیغ اس طرح کی جائے کہ تبلیغ کرنے والے کے لئے کسی طرح کی پکڑ دھکڑ کا اندیشہ نہ ہو۔

۵۔ سائنس نے آج کے انسان کے لئے خدا کی بہت سی وہ مادی نعمتیں کھولی ہیں جو ہزاروں برس سے کائنات کے اندر چھپی ہوئی تھیں۔ ان میں اسلامی دعوت کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم جدید ذرائع مواصلات ہیں۔ پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اسی طرح مختلف قسم کی تیز رفتار سواریاں۔ یہ چیزیں اسلام کے حق میں عظیم نعمتیں ہیں۔ ان کو استعمال کر کے اسلامی دعوت کو عالمی سطح پر پھیلایا جا سکتا ہے۔

یہ مواقع جو عین اسلامی دعوت کے حق میں ہیں، پچھلے ہزار سالہ عمل کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں۔ پچھلے زمانہ میں جس طرح اللہ تعالیٰ نے ڈھائی ہزار سالہ عمل کے ذریعہ اسلام کے غلبۂ اول کے حالات فراہم کئے، اسی طرح اس نے دوبارہ ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں اسلام کے غلبۂ ثانی کے حالات فراہم کر دئے ہیں۔ تاہم یہ حالات و مواقع خود اپنے زور پر واقعہ نہیں بن جائیں گے۔ اس امکان کو واقعہ بنانے کے لئے زندہ

انسانوں کی ایک جماعت درکار ہے۔ ایسی ایک جماعت اگر کھڑی ہو جائے تو قریبی مستقبل میں اسی طرح دوبارہ اسلام کو فکری غلبہ مل سکتا ہے جس طرح قرن اول میں اس کو شرک کے مقابلہ میں فکری غلبہ حاصل ہوا تھا۔

اوپر جن امکانات کا ذکر ہوا وہ تقریباً ایک سو سال سے ایسی کسی جماعت کا انتظار کر رہے ہیں مگر بدقسمتی سے ایسی کوئی جماعت ابھی تک کھڑی نہ ہو سکی۔ اس میں شک نہیں کہ پچھلے سو سال کے اندر ہمارے یہاں بے شمار جماعتیں اور تحریکیں اٹھی ہیں، مگر یہ تحریکیں وقتی حالات، خصوصاً سیاسی حالات کے ردعمل کے طور پر اٹھیں نہ کہ اس ربانی شعور کے تحت جو پچھلے ہزار سال سے تاریخ کے اندر کام کرتا رہا ہے اور چودھویں صدی ہجری میں اپنی تکمیل کو پہنچا ہے۔

سیرت کی کتابوں میں آتا ہے کہ بدر کے میدان میں جب طاقت ور اہل کفر بظاہر کمزور اہل ایمان کے اوپر ٹوٹ پڑے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدت احساس کے تحت سجدے میں گر گئے اور اللہ تعالیٰ سے نصرت کی دعائیں مانگنے لگے۔ اس نازک لمحہ میں آپ کی زبان سے جو کلمات نکلے ان میں سے ایک جملہ یہ تھا: اللهم ان تهلك هذه العصابة لا تعبد بعدها في الارض (خدایا اگر یہ گروہ ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد زمین پر تیری عبادت نہ ہوگی)۔ یہ کوئی مبالغہ نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تین سو تیرہ روحیں جو بے سرو سامانی کے باوجود بدر کے معرکہ میں کھڑی ہوئی تھیں یہ محض عام قسم کے تین سو تیرہ لوگ نہ تھے۔ یہ عصابہ دراصل وہ گروہ تھا جس پر ڈھائی ہزار سالہ تاریخ منتہی ہوئی تھی۔ اسی طرح آج دوبارہ ایک نیا عصابہ (گروہ) درکار ہے جس پر پچھلی ہزار سالہ تاریخ منتہی ہوئی ہو۔ جو اپنے شعور کے اعتبار سے پچھلی ہزار سالہ تاریخ کا وارث ہو۔ جو اپنے کردار کے اعتبار سے ان امکانات کو واقعہ بنانے کا اٹل ارادہ اپنے اندر لئے ہوئے ہو، جو سنجیدہ فیصلے کی اس حد پر پہنچا ہوا ہو جہاں پہنچ کر آدمی اس قابل ہو جاتا کہ وہ اپنے مقصد سے پوری طرح وابستہ رہے۔ کوئی بھی خارجی واقعہ اس کو اس کے نشانہ سے ہٹانے والا ثابت نہ ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کے کاگ میں اپنا کاگ ملائیں گے۔ اور بالآخر یقینی کامیابی کی منزل تک پہنچیں گے

ہیروؤں کی نرسری

سیرت کی کتابوں میں آتا ہے کہ غزوۂ بدر کے موقع پر ۳۱۳ بظاہر کمزور اہل ایمان پر ایک ہزار طاقت ور اہلِ کفر ٹوٹ پڑے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدت احساس کے تحت سجدہ میں گر پڑے۔ اس وقت آپ میدان جنگ کے کنارے ایک عریش (چھپر) کے اندر تھے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے نصرت وحمایت کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ اس نازک لمحہ میں آپ کی زبان سے جو کلمات نکلے، ان میں سے ایک جملہ یہ تھا:

اللّٰھمّ اِن تہلک ھٰذہٖ العصابۃ (الیوم) لا تعبد بعدھا فی الارض

خدایا، یہ گروہ اگر آج ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد زمین پر تیری عبادت نہ ہو گی۔

(السیرۃ النبویہ لابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۴۱۱)

یہ کلمہ کوئی مبالغہ کا کلمہ نہ تھا، بلکہ ایک واقعہ کا سادہ اظہار تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تین سو تیرہ روحیں جو بدر کے میدان میں حق کے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے نکلی تھیں، وہ محض عام قسم کے تین سو تیرہ لوگ نہ تھے۔ یہ العصابہ دراصل وہ گروہ تھا جس پر ڈھائی ہزار سالہ تاریخ منتہی ہوئی تھی۔ ڈھائی ہزار سال کے دوران مخصوص حالات کے اندر ایک زندہ قوم تیار کی گئی۔ پھر اس زندہ قوم سے چھانٹ کر ایک گروہ نکالا گیا جو قرآن کے الفاظ میں "خیرامت" تھا۔ یہی وہ تاریخی گروہ تھا جو اس وقت خونخوار دشمنوں کی تلواروں کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ اسباب وعلل کے پردہ میں پیش آتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے اگر یہ العصابہ ہلاک ہو جائے تو موجودہ دنیا میں خدا کی سنت کے مطابق دوبارہ نئے "ڈھائی ہزار سال" درکار ہوں گے جن کی گردشیں ازسرنو جاری ہوں اور اسباب کے سلسلوں سے گزر کر بالآخر وہ افراد تیار ہوں جو مطلوبہ کارنامہ انجام دینے کے لئے ضروری ہیں۔

موجودہ زمانہ میں اسلام کا غلبہ، بالفاظ دیگر نبوت محمدی کے اظہار ثانی کے لئے، آج دوبارہ

ایک العصابہ درکار ہے۔ یہ العصابہ وہ ہوگا جس پر پچھلی ہزار سالہ تاریخ منتہی ہوئی ہو۔ جو اس بات کا عرفان کامل رکھتا ہو کہ پچھلے ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں خدا نے اسلام کے لئے کیا کیا موافق حالات پیدا کئے ہیں اور کن حکمتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں اسلام کے حق میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

یہ گروہ وہی ہوسکتا ہے جو اپنے شعور کے اعتبار سے پچھلی ہزار سالہ تاریخ کا وارث ہو۔ جو اپنے کردار کے اعتبار سے ان امکانات کو واقعہ بنانے کی اہلیت اپنے اندر لئے ہوئے ہو۔ جس کا وجود اور اسلام کا غلبۂ ثانی دونوں اس طرح ایک ہوجائیں کہ بظاہر ایک کو دوسرے سے جدا نہ کیا جاسکتا ہو۔ اسی قسم کے ایک العصابہ نے پہلے دور میں اسلام کو غالب کیا تھا اور آج بھی اسی قسم کا ایک العصابہ دوبارہ اسلام کو غالب کرے گا۔ دوسری کوئی صورت موجودہ عالم اسباب میں اسلام کے غلبہ کے لئے نہیں ہے۔

پروفیسر فلپ ہٹی نے اپنی کتاب تاریخ عرب میں لکھا ہے:

> After the death of the Prophet sterile Arabia seems to have been converted as if by magic into a nursery of heroes the like of whom both in number and quality is hard to find anywhere.
>
> P.K. Hitti, *History of Arabs* (1979) p. 142

پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد ایسا معلوم ہوا جیسے عرب کی بنجر زمین جادو کے ذریعہ ہیروؤں کی نرسری میں تبدیل کردی گئی ہو، ایسے ہیرو جن کی مثل، تعداد یا نوعیت میں کہیں اور پانا سخت مشکل ہے۔

دنیا میں اسلام کا غلبہ ایک کامل فکری نظام کے مقابلہ میں دوسرے کامل فکری نظام کا غلبہ ہے۔ یہ تاریخ کا مشکل ترین منصوبہ ہے جس کو وقوع میں لانے کے لئے "ہیروؤں کی نرسری" درکار ہے۔ قدیم دور شرک میں اسلام کا غلبہ ہیروؤں کی نرسری کے ذریعہ انجام پایا تھا، اب دور الحاد میں اسلام کا غلبہ دوبارہ ہیروؤں کی ایک نرسری کے ذریعہ انجام پائے گا۔ قانون قدرت کے مطابق جو شرط پیغمبر اور آپ کے ساتھیوں کے لئے ضروری تھی وہ بعد کے لوگوں کے لئے آخر کس طرح ساقط ہوجائے گی۔

زمانۂ رسالت کے مسلمانوں نے دین کو زندہ کرنے کے لئے جدوجہد کی تھی۔ اسی طرح موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے بھی دین کو زندہ کرنے کے نام پر زبردست کوششیں کی ہیں۔ اگر مجرد ظاہری مقدار کے پہلو سے دیکھا جائے تو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی کوششیں دور اول کے مسلمانوں کی کوششوں سے کم نہیں ہیں، بلکہ کچھ زیادہ بڑھی ہوئی ہیں۔ جان کی قربانی، مال و دولت کا خرچ، زبان و قلم کا استعمال، زمین میں دوڑ دھوپ، یہ سب چیزیں مسلمانوں کی حالیہ جدوجہد میں اتنی زیادہ دکھائی دیتی ہیں کہ

خالص مقدار کے اعتبار سے وہ ماضی سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔ مگر جہاں تک نتیجہ کا تعلق ہے، دونوں کے درمیان کوئی نسبت نہیں۔ ماضی کی اسلامی کوششوں نے تاریخ کے دھارے کو بدل دیا تھا۔ جب کہ موجودہ زمانہ کی کوششوں نے صرف ہماری بربادی میں اضافہ کیا ہے۔

یہ فرق اس نفسیاتی فرق کی وجہ سے ہے جو دونوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ زمانہ رسالت کے مسلمانوں کو احساسِ یافت نے ابھارا تھا اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو احساس محرومی نے ابھارا ہے۔ زمانہ رسالت کے مسلمان کس نفسیات کے تحت ابھرے تھے، اس کی ایک کامیاب تصویر اس تقریر میں ملتی ہے جو حضرت جعفر بن ابی طالب نے شاہ حبش نجاشی کے دربار میں کی تھی۔ اس تقریر کے مطابق اسلام ان لوگوں کے لئے جاہلی زندگی کے مقابلہ میں شعوری زندگی اختیار کرنے کے ہم معنی تھا۔ انھوں نے شرک کے مقابلہ میں توحید کو دریافت کیا تھا۔ انھوں نے بے رہنمائی کے مقابلہ میں پیغمبرانہ رہنمائی کو پایا تھا۔ انھوں نے دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو پایا تھا۔ انھوں نے بے قید اخلاقیات کے مقابلہ میں ذمہ دارانہ اخلاقیات کو پایا تھا۔ انھوں نے ظلم کے مقابلہ میں عدل وانصاف کو پایا تھا۔ مگر جہاں تک موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا تعلق ہے ان کا معاملہ سراسر اس سے مختلف ہے۔

زمانہ رسالت کے مسلمانوں کے جذبات میں اس احساس نے ہیجان برپا کیا تھا کہ "ہم نے پایا ہے"۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے اندر جس چیز نے ہیجان برپا کیا وہ صرف یہ احساس تھا کہ ہم نے کھویا ہے:

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام تحریکیں اسی محرومی اور مظلومی کے احساس کے تحت ابھری ہیں۔ ایک اور دوسری تحریک میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ ایک اس کو سادہ انداز میں بیان کر رہی ہے اور دوسری مفکرانہ انداز میں۔ کسی کے یہاں قومی الفاظ بولے جا رہے ہیں اور کسی کے یہاں مذہبی الفاظ۔

یونانی فلسفی ارشمیدس نے کشش ثقل کا ایک قانون دریافت کیا تھا۔ اس کے بعد وہ اتنا سرشار ہوا گویا اس نے سب کچھ پالیا ہے۔ شاہ ایران رضا پہلوی نے صرف حکومت کھوئی۔ مگر ان کا یہ حال ہوا گویا انھوں نے سب کچھ کھو دیا ہے۔ دریافت ہو یا محرومی، دونوں کی نفسیات یہ ہے کہ آدمی اسی چیز کو سب سے زیادہ اہمیت دینے لگتا ہے جس کو اس نے پایا ہے یا جس کو اس نے کھو دیا ہے۔

اس نفسیات کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ "دریافت" آدمی کی فکری قوتوں کو پوری طرح جگا دیتی ہے۔ وہ کامل طور پر ایک زندہ انسان بن جاتا ہے۔ اس کے حوصلوں کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ اس کے برعکس جب کسی آدمی

پر" محرومی" کا احساس چھاتا ہے تو اس کی ذہنی اور عملی قوتیں ٹھپ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ بظاہر زندہ ہونے کے باوجود اندر سے وہ ایک مردہ انسان بن جاتا ہے۔ دور قدیم میں ہمارے اسلاف احساس یافت پر ابھرے تھے اس لئے ان کی بیداری اس نوبت تک پہنچی کہ تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ موجودہ زمانہ میں ہماری نسلیں احساس محرومی پر ابھری ہیں، چنانچہ ان کی بے شعوری اور پست حوصلگی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ تاریخ میں شاید اس کی بھی کوئی دوسری مثال نہیں ملے گی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ یافت کے جذبہ سے مثبت اخلاقیات ابھرتی ہیں اور محرومی کے جذبہ سے منفی اخلاقیات۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دور اول کے مسلمانوں کے لئے ان کا اسلام ان کے اندر اعلیٰ کردار پیدا کرنے کا ذریعہ بن گیا تھا۔ وہ حق کے آگے جھک جاتے تھے۔ وہ دوسروں کا اعتراف کرنا جانتے تھے۔ وہ جو کچھ کہتے تھے وہی عملاً کرتے تھے وہ لوگوں کو معاف کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ وہ شکایتوں کو نظر انداز کرکے لوگوں کے ساتھ معاملہ کرسکتے تھے۔ وہ جذبات سے ہٹ کر خالص عقلی فیصلہ لینے کی طاقت رکھتے تھے۔ وہ ردعمل کی نفسیات سے پاک ہو کر سوچنا جانتے تھے

منفی احساسات، اس کے برعکس، منفی اخلاقیات پیدا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے رہنما صرف ان کے جذبات ہوتے ہیں۔ وہ بالکل قدرتی طور پر جھنجھلاہٹ اور نفرت کا شکار رہتے ہیں۔ حقیقت پسندی کی باتیں ان کو اپیل نہیں کرتیں۔ وہ ہمیشہ اختلاف اور انتشار میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان کے اندر حق کا اعتراف کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ وہ اگر ہار جائیں تو اپنی ہار ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ اگر کامیاب ہوں تو ان کا بگڑا ہوا ذہن بہت جلد ان کی کامیابی کو ناکامی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہی وہ فرق ہے جس نے کل اور آج میں وہ عظیم الشان فرق پیدا کر دیا ہے جس کو ہم دیکھ رہے ہیں۔

پیغمبر اسلام کا لایا ہوا انقلاب مثبت اخلاقیات کی زمین پر ابھرا تھا۔ اب اگر کچھ لوگ یہ چاہیں کہ اس انقلاب کو منفی اخلاقیات کی زمین سے برپا کریں تو انھیں اپنے لئے دوسرا خدا تلاش کرنا چاہیئے اور اسی کے ساتھ دوسرا پیغمبر بھی۔